خطوط ابوالکلام آزاد

خطوط ابو الکلام آزاد

(جلد اوّل)

مرتّب

مالک رام



ساہتیہ اکادمی
نئی دلّی

سرورق کے آخری صفحہ پر سنگ تراشی کے جس نمونے کی تصویر دی گئی ہے، اس میں تین جیوتشی بھگوان بدھ کی ماتا مہارانی مایا کے خواب کی تعبیر بیان کر رہے ہیں۔ اور ان کے نیچے ایک کاتب بیٹھا ان کی تعبیر قلمبند کر رہا ہے۔

یہ شاید ہندستان میں لکھنے کے فن کی قدیم ترین تصویری مثال ہے۔

(ناگ ارجن کونڈ۔ دوسری صدی عیسوی)

(بشکریہ نیشنل میوزم۔ نئی دلی)

تعارف

خطوط نویسی لازماً لکھنے کے فن کی ایجاد کے بعد شروع ہوئی۔ اس سے پہلے اگر ایک شخص کو کسی اور سے کچھ دریافت کرنے یا کہنے کی ضرورت پیش آئی، تو لازماً وہ خود ذاتی طور پر اس کے پاس گیا ہوگا، یا پھر کسی کو زبانی پیغام دے کر اس کے پاس بھیجا ہوگا۔ جب لکھنے کا رواج ہوا، تو نسبتاً آسانی پیدا ہو گئی۔ اب ضروری بات لکھ کر دوسری جگہ بھیجی جا سکتی تھی، اگرچہ مکتوب بھیجنے کے ذرائع کی مشکل بہت دن تک حل نہیں ہوئی۔ چندے یہ کام پرندوں سے لیا گیا۔ کبوتروں کے اس خدمت کے لیے استعمال کرنے کا ذکر مختلف زبانوں میں ملتا ہے۔ لیکن اسی زمانے میں یہ کام ہرکاروں کے ذریعے سے بھی ہوتا رہا؛ جو پیدل یا کسی سواری پر جاتے تھے۔ جب بتدریج اس کی ضرورت عام ہو گئی، تو اسے کسی حد تک منظم کر دیا، اور اسے ٹھیکیداروں یا حکومتِ وقت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

قدیم ترین مطبوعہ خط جو میری نظر سے گزرا، وہ ہے جو قرآن (سورہ نمل، ۲۷: ۳۰۔ ۳۱) میں نقل ہوا ہے۔ یہ یک سطری مختصر خط حضرت سلیمان علیہ السلام نے اہلِ سبا کو لکھا تھا:

Khutut-i-Abul Kalam Azad (Letters of Abul Kalam Azad) : Edited with Notes and Introduction by Malik Ram. This is the fifth book of the series published by the Sahitya Akademi as part of a commemorative edition of Maulana Abul Kalam Azad's Collective Works in Urdu. Sahitya Akademi, New Delhi (1991), Rs.80.

خطوطِ ابوالکلام آزاد (۱) : مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعے کی پہلی جلد۔ یہ اُن کی جملہ تصانیف کا پانچواں حصّہ ہے، جسے ساہتیہ اکادمی "بیادگارِ مولانا ابوالکلام آزاد" مرحوم شائع کر رہی ہے۔

(ساہتیہ اکادمی، نئی دلّی : ۱۹۹۱ء)

ساہتیہ اکادمی

پہلی بار : ۱۹۹۱ء

قیمت : ۸۰ روپے

ساہتیہ اکادمی، رابندر بھون، نئی دلّی نے دلّی میں طبع کروا کے شائع کیا

مطبع :- کمار آفسٹ پرنٹرس۔ دہلی ۱۱۰۰۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَاْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ○

(تم لوگ میرے مقابلے میں تکبّر نہ کرو اور مطیع ہو کر میرے حضور چلے آؤ)

اسی کے بعد ملکۂ سبا، حضرت سلیمانؑ کے دارالخلافے میں حاضر ہوئی اور ان کی خدمت میں مختلف تحائف پیش کیے۔

لازماً شروع میں خط کا موضوع روزمرّہ کے سادہ معاملات اور ایک دوسرے کی خیر خیریت معلوم کرنے تک محدود رہے۔ رفتہ رفتہ اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور دنیا جہان کے موضوعات خطوں میں شامل ہو گئے (خود حضرت سلیمانؑ کا محولہ فوق خط اس پر دالّ ہے)

تعلیم چونکہ عام نہیں تھی، اس لیے کوئی، چاہے بھی تو، خط لکھنے پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس

ع ہ ملکۂ سبا کا ذکر آگیا ہے، تو جملۂ معترضہ کے طور پر اس کے نام "بلقیس" سے متعلق ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔

یہ قصّہ عہد نامۂ قدیم (تورات) میں دو جگہ کم و بیش ایک ہی طرح بیان ہوا ہے۔ (۱) سلاطین باب ۱۰، نیز (۲) تواریخ باب ۹) لیکن کسی جگہ اس کا نام نہیں لکھا گیا، صرف ملکہ سبا کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جب تورات کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا، تو مترجم نے ملکۂ سبا کے حضرت سلیمان کے سامنے پیش ہونے اور ان سے گفتگو کرنے کے انداز سے خیال کیا کہ اس کا یہ رویّہ ایک ملکہ کے شایانِ شان نہیں، بلکہ کسی آبرو باختہ اور بازاری عورت کا سا تھا۔ لہٰذا اس نے اس کے لیے یونانی لفظ "پلاکیس" (Pallakis) استعمال کیا جس کے لغوی معنی "قحبہ یا فاحشہ عورت" کے ہیں۔ جب اس یونانی کا عربی میں ترجمہ ہوا، تو عربی مترجم نے خیال کیا کہ یہ ملکہ کا نام تھا یعنی اسم معرفہ۔ چونکہ حرف 'پ' عربی میں نہیں ہے، اس نے اسے "بلقیس" بنا دیا۔ بس پھر کیا تھا، تمام عربی مفسّروں نے (اور ان کی تقلید میں فارسی اور اردو والوں نے بھی) یہ نام لے لیا، اور آج ہم بیدھڑک اپنی لڑکیوں کا نام "بلقیس" رکھ لیتے ہیں۔

پر خط لکھنے والوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا، جو صبح شام کان پر قلم رکھے گلی کوچوں میں پھرنے لگے کہ اگر کسی کو خط لکھوانا ہو، تو اُن سے اُجرت پر لکھوا لے۔ پھر تو خطوط نویسی نے باقاعدہ پیشے کی شکل اختیار کر لی۔ عبارت آرائی، صنائع و بدائع کا مناسب استعمال، فقروں کا در و بست ـــــ اس کے لازمی ارکان قرار پائے۔ جو ان علوم میں جتنا ماہر ہوتا، اتنی ہی اس کی شہرت اور مانگ زیادہ ہونے لگی۔ قدرتاً مدارس میں خطوط نویسی کی باقاعدہ تعلیم ہونے لگی۔ انشا پردازوں نے اچھے خطوط کے نمونے پیش کیے، تاکہ پیشہ ور حضرات ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ یہ نمونے کے مجموعے منشیات کہلاتے تھے۔ انشائے خلیفہ، انشائے مادھورام وغیرہ اسی قبیل کے رسالے ہیں، جو مدّتوں ہمارے نصاب میں شامل رہے۔

دوسری قسم ان مراسلات کی ہے جو شاہی درباروں اور امرا کے متوسّلین نے اپنی قادرالکلامی ثابت کرنے کو لکھے۔ ابوالفضل کے خطوط اسی زمرے میں آتے ہیں۔

ہمارے برگزیدہ علما، اور صوفیۂ کرام نے خطوط سے اپنے مریدوں اور پیروؤں کی تعلیم کا کام لیا اور خطوں میں دین اور رشد و ہدایت کے مسائل تفصیل سے بیان کیے۔ حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے اور ہمارے زمانے میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے ملفوظات اس کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۲

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط مختلف علوم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ ان کی جو تحریریں "غبارِ خاطر" میں شامل ہیں، ان میں سے بیشتر مختلف موضوعات ـــــ علوم، دینیات، تاریخ، انشا وغیرہ۔ سے متعلق ان کے وسیع مطالعے اور قدرتِ کلام اور غور و فکر کے نتائج کی مظہر ہیں۔ انھوں نے ان خطوط سے وہی کام لیا، جس کا ایک ماہرِ نفسیات، ایک مورخ، ایک انشا پرداز اپنے علم اور قلم سے لیتا۔ کسی جگہ حروبِ صلیبیہ کی داستان لکھی ہے، تو کسی جگہ ہستیِ باری تعالیٰ پر دلائل فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ فلسفۂ تنہائی پر رائے زنی کی ہے اور دوسری جگہ انانیّت کا تجزیہ

کیا ہے۔ ایک خط میں موسیقی کی تاریخ ہے، تو دوسرے میں کاشتکاری کے رموز بیان ہوئے ہیں۔ غرض ان کے علم کی ہمہ گیری اور تنوّع حیرت ناک بھی ہے اور سرور افزا بھی۔

موجودہ مجموعہ بھی اس لحاظ سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس میں قدم قدم پر ان کی وسعتِ مطالعہ اور اس پر مبنی مختلف مسائل سے متعلّق ان کی آزادانہ رائے کا اظہار ہوتا ہے۔

مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام کے خط ۱۰ میں جس طرح چند جملوں میں مفاسدِ معاشرت کی تشخیص اور ان کے علاج پر اظہارِ خیال کیا ہے، یہ ان کی ژرف نگاہی کا بیّن ثبوت ہے۔ مولانا دریابادی ہی کے نام کے خط ۱۲ میں انھوں نے سُود کے مسئلے پر جس طرح بحث کی ہے، اس سے ان کی فقہ کے دقیق مسائل سے واقفیت کا پتا چلتا ہے۔

اس پہلو سے مولانا غلام رسول مہر کے نام کے خطوط بہت اہم اور قیمتی ہیں۔ یہ ۱۹۱۴ء سے ان کی وفات (۱۹۵۸ء) تک کے طویل زمانے پر ممتد ہیں۔ آج تک خطوط کی اتنی بڑی تعداد کسی اور مکتوب الیہ کے نام کی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ ان میں صحافتی، دینی، سیاسی، تاریخی وغیرہ مسائل پر انھوں نے اتنی تفصیل سے لکھا ہے کہ ہر جگہ مسئلے کے تمام اطراف روشن ہو گئے ہیں۔ مثلاً خط ۱۱ میں صحافتِ اُردو کے اصول، خط ۵۶ میں اردو کی تعلیم و ترویج کا مسئلہ، خط ۲۴، ۴۷ میں اسلام (الدّین) کے بنیادی اعتقاد، خط ۶۷ میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی تاریخ کے ماخذ۔ غرض ہر جگہ انھوں نے مسئلہ زیرِ بحث پر اتنی شرح و بسط سے لکھا ہے کہ آپ اس پر الّا ماشاءاللہ بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض اپنے حافظے کی مدد سے، کسی ماخذ سے رجوع کیے بغیر، خط لکھتے وقت، ارتجالاً قلمبند ہو گیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے قوی حافظے اور استحضار پر دلیلِ قاطع قائم ہوتی ہے، بلکہ اس پر بھی کہ انھوں نے ان مسائل پر کس حد تک غور و فکر کیا تھا کہ یہ چیزیں ان کے علم کا ایسا مستقل حصّہ بن گئیں کہ کسی شخص کے اچانک سوال کرنے پر وہ اسے بے تامّل قلم برداشتہ پوری تفصیل سے بیان کر دینے پر قادر تھے۔ اتنے مختلف مضامین کے بارے

میں ایسی ایسی جزوی تفصیلات کا دماغ میں پیوست ہوجانا، اس وقت تک ممکن نہیں کہ انسان کو اُن سے گہری دلچسپی ہو۔ پس، اگر وہ کہتے ہیں:

> بعض اوقات سوچتا ہوں، تو طبیعت پر حسرت والم کا ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا ہے۔ مذہب، علوم وفنون، ادب، انشا، شاعری ——— کوئی وادی ایسی نہیں ہے، جس کی بیشمار نئی راہیں مبدءِ فیاض نے مجھ نامراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں، اور ہر آن وہر لحظہ نئی نئی بخششوں سے دامن مالامال نہ ہوا ہو، بحدّے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالمِ معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کر دیتی ہیں (خط ۴۳ بنام مہر)

تو اس میں کیا مبالغہ یا خودستائی ہے؟

۳

ان خطوط سے مولانا آزاد کی سوانح حیات کی تکمیل میں بھی بہت مدد ملیگی، خاص کر ان میں ان کی عادات اور خصائل کا باب پورا کرنے کے لیے بہت مواد ہے۔ اس میں جو خطوط شمس العلما، مولوی محمد یوسف رنجور جعفری کے نام ہیں، اس پہلو سے وہ بالخصوص بہت اہم اور قیمتی ہیں۔

ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے:

جب مولانا آزاد کی وفات کے بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں مولانا عبدالرزّاق ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" شائع ہوئی تو بعض اصحاب نے اس کی صحت پر شبہے کا اظہار کیا تھا۔ ان خطوط میں جگہ جگہ ایسے بیان ملتے ہیں، جن سے مولانا عبدالرزاق کی تائید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مرتبہ کتاب واقعی مولانا آزاد کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ مولانا ملیح آبادی سے کہیں کہیں مولانا آزاد کا مفہوم اپنے الفاظ میں ادا کرنے میں کمی بیشی ہوگئی ہو۔

لیکن مجموعی طور پر یہ کتاب مولانا ملیح آبادی کی اختراع یا وضع کردہ نہیں کہی جاسکتی، بلکہ اس کا منبع واقعی خود مولانا آزاد کی اپنی ذات ہے۔

۴

میں چاہتا ہوں کہ یہاں "ترجمان القرآن" جلد سوم کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دوں۔

متعدد احباب نے لکھا ہے کہ تیسری جلد مکمل لکھی جاچکی تھی اور محض اس کی کتابت کا مرحلہ طے کرنا باقی تھا۔ خود مولانا آزاد مرحوم نے بعض خطوں میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی اس غلط فہمی کو تقویت ملتی ہے۔

حقیقت میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ جلد کبھی لکھی نہیں گئی۔ مولانا آزاد کا عام دستور یہ تھا کہ وہ کسی کتاب کی کتابت کے دوران میں کاتب کو مستقلاً اپنے مکان پر بلا لیتے تھے، اور جتنا مسوّدہ تیار ہو جاتا، کتابت کے لیے اس کے حوالے کرتے رہتے۔ چونکہ موضوع سے متعلق تمام معلومات اور تفاصیل ان کے دماغ میں محفوظ ہوتی تھیں، اس لیے انھیں کاغذ پر منتقل کرنے میں کسی دشواری یا تاخیر کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا، کام مسلسل جاری رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں پورا الیقین تھا کہ جس دن بھی تیسری جلد کا کام شروع ہوگا، تین چار مہینے میں وہ اسے کاتب سے لکھوا کر کتاب مکمّل کر دینگے۔

ان کی وفات کے بعد جب ساہتیہ اکادمی نے ان کی کتابوں کی ترتیب کا کام شروع کیا، تو قدرتاً "ترجمان القرآن" کی تیسری جلد کا مسئلہ پیش آیا۔ اس سلسلے میں جب ان کے کاتب منشی عبدالقیّوم خاں مرادآبادی سے دریافت کیا گیا، تو انھوں نے تصدیق کی کہ پوری کتاب کبھی لکھی ہی نہیں گئی۔ حسبِ معمول وہ جتنا مسوّدہ لکھتے، اُن کے حوالے کر دیتے۔ یہ جلد ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ بعض موانع پیدا ہو گئے اور وہ بہت دن تک کچھ نہ لکھ سکے۔ جب دیکھا کہ کام کے جلد جاری ہونے کی امید کم ہے تو وہ اپنے وطن مرادآباد چلے گئے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ جونہی حالات سازگار ہونگے،

انھیں بلوالیا جائیگا ۔ بدقسمتی سے مدّتوں یہ نہ ہوسکا اور اس کے بعد اچانک مولانا آزاد کا انتقال ہوگیا۔

خان صاحب کے پاس سے صرف سورۂ نور کا مسودہ نکلا۔ چنانچہ ہم نے ان سے لے کر جلد چہارم کے آخر میں اضافہ کردیا (یہ پہلی مرتبہ اکادمی ایڈیشن ہی میں شائع ہوا)

اتفاق دیکھیے کہ ان کی وفات سے دو ہفتے قبل میری ان سے (آخری) ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران میں، مَیں نے ان سے درخواست کی کہ دو کام کرنے کے ہیں، بہت کرم ہو اگر آپ سو کام چھوڑ کر ان کی تکمیل کا انتظام کریں۔ اوّل "ترجمان القرآن"، کی جلد سوم، اور دوم، اپنی سوانحعمری۔ (مجھے منشی عبدالقیوم خان والی مندرجہ صدر رُوداد کا علم نہیں تھا) فرمایا: ہاں بھائی، میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ "ترجمان القرآن"، کی تکمیل میں بہت تاخیر ہوگئی ہے۔ لیکن کیا کروں، مکروہات سے مفر نہیں۔ بہت اچھا، بہت جلد خان صاحب (عبدالقیوم خان خوشنویس) کو بلا کر یہ کام شروع کرتا ہوں۔ رہا سوانحعمری کا کام، تو میں نے پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب سے آزادی تک کے دس سال کے حالات انگریزی میں قلمبند کروا دیے ہیں۔ اور ان کے شروع میں ایک باب کا اضافہ کردیا ہے، جس میں ابتدائی زمانے کے حالات آگئے ہیں۔ اس پر میں نے عرض کیا کہ یہ بہت اچھا ہوا۔ لیکن ہمیں آپ کے سوانح انگریزی میں نہیں، بلکہ اردو میں، خود آپ کے قلم سے درکار ہیں۔ فرمایا: میری مصروفیتیں آپ سے مخفی نہیں۔ اتنی فرصت کہاں ملیگی! اس پر میں نے جسارت کرکے کہا: میں حاضر ہوں۔ آپ بولتے جائیے، میں لکھتا جاؤنگا۔ وہ اس پر رضامند ہوگئے۔ یہ طے ہوگیا کہ عنقریب وہ مجھے مطلع کرینگے اور یہ کام شروع ہوجائیگا۔

اس کے پندرہ دن بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

غرض میرا ایمان ہے کہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد معرضِ تحریر میں آئی ہی نہیں۔ بلاشبہ، اس کے مضامین ان کے ذہن میں تھے۔ اس کی تفسیر بھی ان کے دماغ میں محفوظ تھی۔ لیکن انھوں نے

کبھی اسے سپردِ قلم نہیں کیا۔

۵

آخر میں مجھے ایک خوشگوار فرض ادا کرنا ہے، یعنی ان اصحاب کا شکریہ جنھوں نے اس جلد کی تیاری میں دستِ تعاون دراز کیا، اور کسی نہ کسی مرحلے پر مدد کی۔

(الف) پروفیسر مختار الدین احمد (علی گڑھ) اور ایم حبیب خان (نئی دلی) صاحبان نے مختلف ماخذوں سے خطوط نقل کر کے مہیا کیے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال) نے محمد علی طبیب کے نام کے خط کا اصلی پرچے (مرقعِ عالم) سے عکس لے کر عنایت کیا۔

(ب) خواجہ حسن نظامی مرحوم اور مُلّا واحدی کے نام کے خط خواجہ صاحب مرحوم کی کتاب "اتالیقِ خطوط نویسی" سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ایک زمانے سے ناپید ہے اور اب کہیں دستیاب نہیں۔ اس کا نسخہ خواجہ حسن ثانی نظامی (بن خواجہ حسن نظامی مرحوم) نے عطا فرمایا۔

(ج) مولوی محمد یوسف رنجور جعفری مرحوم کے نام کے خط ان کے خاندان (کراچی) میں محفوظ ہیں۔ ان کے نواسے پروفیسر سیّد قدرت اللہ فاطمی نے ان کے عکس خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو دیے، جو موصوف نے لائبریری کے جرنل (۴۷) میں شائع کر دیے ہیں۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست پر، بطیبِ خاطر ان خطوط کے اس مجموعے میں شمول کی اجازت دے دی۔ ان کے ذریعے سے لائبریری کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(د) مولانا غلام رسول مہر نے اپنی وفات سے پہلے مجھے اپنے شائع کردہ تمام خطوط کے ان مجموعوں میں شامل کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ بدقسمتی سے بوجوہ یہ کام ان کی زندگی میں نہ کر سکا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا اجازت نامہ کہیں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور تلاشِ بسیار کے باوجود اس کا سراغ نہ ملا۔ اگرچہ میں اُن کی اجازت پر اعتماد کر کے، ان کے خطوط شائع کر سکتا تھا، لیکن طبیعت مطمئن نہیں تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ان کے ورثا بالخصوص صاحبزادے (محمد سلیم علوی صاحب) اجازت دے دیں۔ اس سلسلے میں عزیز گرامی محمد عالم مختار حق صاحب نے بہت تگ و دو کی۔ بالآخر انھوں نے محمد سلیم علوی

صاحب کے ایما پر مہر مرحوم کے ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور کے مالک شیخ نیاز احمد صاحب سے اجازت نامہ لکھوا کر بھیج دیا۔ میں ان تینوں حضرات (محمد عالم مختار حق صاحب، محمد سلیم علوی صاحب، شیخ نیاز احمد صاحب) کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ فجزاہم اللہ احسن الجزا۔

(ہ) نواب محمد رحمت اللہ خان شروانی (علی گڑھ) نے میری درخواست پر بعض اشعار کی تخریج کی۔

(و) ڈاکٹر دھرم دیو سوامی (نئی دلّی) نے مبیّضہ تیار کرنے میں جو زحمت گوارا کی، ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ مدد نہ کرتے، تو میری موجودہ صحت کے پیشِ نظر، خدا معلوم، یہ کام کب تک ملتوی رہتا۔

اگرچہ میں ان اصحاب کا فرداً فرداً شکریہ ادا کر چکا ہوں، لیکن اب پھر ان کی مدد کا اعتراف مجھ پر واجب ہے۔

نئی دلّی

۲۲ فروری ۱۹۹۱ء

مالک رام

استدراک

۱۔ اس جلد میں شامل خط تاریخ وار جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ترتیب مکتوب الیہ کے نام کے پہلے خط کی تاریخ سے متعیّن کی ہے۔

۲۔ متن میں ہر ایک خط کے شروع میں حاشیے میں ایک نمبر ملیگا اور یہ کا نمبر اس خاص مکتوب الیہ کے خطوط کا ترتیبی نمبر ہے، اور نیچے کا پورے مجموعے کا۔ مثلاً محمد یوسف جعفری رنجور کے، ایک خط کا نمبر ہے: $\frac{8}{11}$ اس کا مطلب یہ ہے کہ رنجور کے نام کا یہ آٹھواں خط ہے اور شروع سے اس مجموعے کا یہ گیارھواں خط ہے۔ قس علیٰ ہذا۔

۳۔ متن میں بعض خطوط کے پائیں حواشی ہیں، خاص کر مولانا عبدالماجد دریابادی اور غلام رسول مہر کے نام کے خطوں میں۔ یہ مکتوب الیہ کے لکھے ہوئے ہیں۔
مرتب کے لکھے ہوئے حواشی الگ سے آخر میں دیے گئے ہیں۔

مالک رام

فہرست

حواشی:

صفحہ

عبدالرزّاق کانپوری کے نام

(۱)

حضرت مجمع الفضائل مولانا صاحب مدفیوضہ،

السّلام علیکم۔ مزاج شریف۔ والا نامہ ورود ہوا۔ شرفِ اعتماد ہمراہ لایا۔ خادم آپ کی اس عنایت بےغایت کا صد درجہ ممنون و مشکور ہوا کہ اس نالائق پر نظرِ مشفقانہ فرمائی اور جوابِ عریضہ سے افتخار و عزّت افزائی بخشی۔

یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

فی الواقع آپ کی ذات بابرکات مغتنماتِ روزگار سے ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ آپ کو صدوسی سال سلامت رکھے اور مکروہاتِ زمانہ سے محفوظ!

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

آپ نے جس کام کا بیڑا اٹھایا[۲] ہے، فی الواقع نہایت ہی مشکل کام ہے۔ بلا رُو رعایت عرض کرتا ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہمّت تھی کہ اس پُرخطر میدان میں بہادرانہ قدم رکھا۔ ان شاء اللہ آپ کامیاب ہوں گے، اور عنقریب آپ کی بیش بہا تصنیف سے ملک مستفیض ہوگا۔

حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی لائف میں نے تھوڑے عرصہ سے شروع کر دی ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا ہے، واقع میں ایک بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اور وقت کثیر درکار ہے، لیکن السّعی منی والا تمام من اللہ کا مقولہ ہر وقت پیش نظر ہے۔ اور اگر اللہ کی مرضی ہوئی، تو اپنے کام میں کامیاب ہونگا، اور ضرور ہونگا۔ اعظم گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی کا عمدہ کتبخانہ ہے۔ گذشتہ کانفرنس میں (جو کلکتہ میں جلسہ ہوا تھا) مولانا شبلی صاحب سے نیاز حاصل ہوا، تو میں نے عرض کیا کہ آپ کے مفید کتبخانہ سے خادم بھی مستفیض ہونا چاہتا ہے۔ مولانا موصوف نے فرمایا کہ میں فہرست بھیجونگا۔ شاید فرصت نہیں ہوئی، اس لیے ارسال نہیں کی۔ کل بھی میں نے شبلی صاحب کے یہاں عریضہ لکھا ہے۔ چونکہ آج کل "رائل ہیروز آف اسلام" میں سے صلاح الدین ایوبی کی لائف لکھتے ہیں، کم فرصت ہے۔

پٹنہ کی بابت جو کچھ آنجناب نے تحریر کیا ہے، بجا ہے۔ ۱۱ رجب المرجب کو میں پٹنہ جاؤنگا کیونکہ ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ[۲] ہے۔ اس لیے وہاں کے کتبخانہ کی بھی سیر ہو جائیگی۔ اگر تصنیفات غزالی مل گئیں، دیکھی جائینگی۔ ان شاء اللہ۔ ابھی صرف احیاء العلوم پر ایک تفصیلی ریویو کیا گیا ہے۔ اور جو کتابیں دستیاب ہوئیں، ان سے امام صاحب کے حالات قلمبند کیے ہیں مصر وغیرہ سے کتابوں کے لیے خطوط لکھے ہیں۔ طبقات الشافعیہ تو موجود ہے۔ آپ دعا کیجیے!

تمدن عرب، الفاروق، دربار اکبری، ترجمۂ قرآن نظم وغیرہ، میں قبل منگا چکا ہوں سبحان اللہ، یہی کتابیں تو ہمارے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔ اللھم زِد فزِد۔

دیگر یہ تحریر فرمائیں کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں، ان کے ترجمے اُردو میں بھی دستیاب ہوتے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے، تو کہاں ہوتے ہیں؟ تحریر کیجیے گا۔

خادم العلماء
غلام محی الدین آزاد کان اللہ لہٗ

(۲)

مکرمی محترمی جناب مولوی عبدالرزاق صاحب

۲/۷

کیسے! مزاج شریف؟ جنوری کے اواخر میں، میں نے ایک عریضہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ ہیچ صدائے نہ برخاست۔ پریشان ہو کر میں نے ایک کارڈ تاکید مزید کے خیال سے ارسال کیا۔ اوس پر بھی آپ کی نظر توجہ کا مستحق نہ ٹھہرا۔ جنوری، فروری، مارچ۔ آج مارچ کی بیسویں ہے اور یہ تیسرا عریضہ آپ کی خدمت میں حاضر کیا جاتا ہے۔ دیکھیے، آپ تکلیف اٹھاتے ہیں یا نہیں؟ خط پہنچے اور وقت جو خط لکھنے میں صرف ہو گا۔ ہیں یا نہیں؟

فرمائیے آپ کی تصنیف کا کیا حال ہے؟ "نظام الملک کہاں تک لکھی گئی؟" "البیت" میری الحمد للہ فروری میں تکمیل کو پہونچ گئی۔ اب میں ایک اور ضروری تالیف کی تکمیل میں مصروف ہوں جس کے متعلق مولوی شبلی صاحب کا خیال ہے کہ وہ اون کا موضوع میں نے چھین لیا ہے۔ یہ کتاب ساتھ ساتھ میں نے مرقع عالم پریس، ہردوئی میں چھپوانا بھی شروع کر دی ہے کیونکہ میرے سابق خط میں، میں نے لکھا تھا کہ آپ رعد صاحب سے "البرامکہ" طبع کرا چکے ہیں، تجربہ کار ہیں؛ گو میں نے بہت کچھ چھپوایا ہے، مگر اور مطابع ہیں۔ رعد

صاحب کے اصول و طریقہ سے بالکل ناواقف ہوں۔ آپ دریافت کر کے لکھیے کہ کیا طریقہ ہے؟ مگر جب جواب نہ آیا، میں نے محمد علی صاحب "ایڈیٹر مرقع عالم" کو جو میرے قدیم کرم فرما ہیں ان کے بعد اصرار سے دے دیا۔ یہ کتاب "العلوم الجدیدۃ والاسلام" ہے۔ اور سرسید مرحوم کی ڈیفنس میں اپنی طرز کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق ایک دو جملے اور سُن لیجیے[9]۔

(۲۰ مارچ)

حکیم محمد علی طبیب کے نام

(۱)

باسمہ سبحانہ'

۱۱ جون ۱۹۰۲ء یوم الاربعا

جناب حکیم صاحب! السّلام علیکم وعلیٰ مَن لدیکم

مجھے آپکے "مرقع عالم" سے کس قدر شغف ہے، اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بمبئی میں "مرقع عالم" سِنینِ ماضیہ کے پرچے جب میں نے طلب کیے تھے اور کارپردازی کی غفلت کے سبب سے فرمایش کی جلد تعمیل نہ ہوئی تھی، تو اُس وقت میں نے متواتر رجسٹرڈ خطوط روانہ کیے تھے۔ یعنی طبیعت میں اس کا ایک شوق بڑھا ہوا تھا اور بدگمانی اس امر کا موقع ہی نہیں دیتی تھی کہ خط کے نہ پہنچنے کو تسلیم کرکے عدمِ تعمیلِ فرمایش کو کسی اور وجہ پر محمول کرتا۔ اگرچہ رجسٹرڈ خطوط کا کسی چیز کی فرمایش کے لیے ارسال کرنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے، مگر ایک ایسی حالت میں کہ ناقدری کی گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہو، اور لوگوں کو ایک کارڈ بھیجنا بھی بار گزرتا ہو، اس قدر اشتیاق کا ہونا کہ فرمایش کے لیے پیڈ خطوں اور کارڈوں پر بھروسہ نہ کرکے متواتر رجسٹرڈ خطوط کا ارسال کرنا ایک خصوصیت کا پہلو رکھتا ہے۔

مگر کچھ دنوں سے میں بڑی حسرت کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی علالت

کی وجہ سے "مرقع عالم" اپنی ایک خاص خصوصیت کو، جو اور ہندوستانی میگزینوں میں اس کے لیے مابہ الامتیاز تھی، کھو بیٹھا ہے۔ اس لیے پبلک کو وہ توجہ جو پچھلے دنوں اس کی طرف مبذول تھی، ایک حد تک جاتی رہی وہ کیا؟ پنکچوالٹی یعنی پابندیِ وقت۔ پس، اب للہ ذرا آپ ادھر متوجہ ہوں۔ اور ایک سال کا جو آپ پر قرض باقی ہے، اسے جلد جلد ادا کر کے آیندہ سے اس میں پابندی کا مؤثر جادو پیدا کر دیں۔

۲/ اس عریضہ کے ہمراہ ایک مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔ اسے "مرقع" میں شامل کیجیے۔ ان شاءاللہ ۳ و ۴ نمبر بھی عنقریب ارسالِ خدمتِ عالی کر دونگا۔

آپ جانتے ہیں، اور یقیناً مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ محرکینِ تعلیمِ انگریزی کی اشاعت سے کیا غرض تھی: اشاعتِ علومِ مغربی۔ مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعۂ ملازمت سمجھ لی گئی۔ اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے، نہ فلسفے سے، بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور ۱۵؎ روپے پر ملازم ہو گئے، پس حالتِ موجودہ کے لحاظ سے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علومِ مغربی کا ترجمہ کیا جائے اور سائنٹفک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے مولوی محمد عمر صاحب نے واقعی یہ بہت ہی اچھا کیا کہ "مرقعِ عالم" کو علومِ مغربی کا مخزن بنا دیا۔ ملک اور قوم کو ان کا ممنون ہونا چاہیے۔ مگر ساتھ ہی اگر آپ غور کریں گے تو اشاعتِ علومِ مغربی سے ایک اور زہریلا مرض ہندوستان میں پھیل رہا ہے اور جب اس میں ترقی ہو گی، تو اس میں بھی یقیناً ہو گی۔ پس اس لیے ضروری ہے کہ اس کا انسداد بھی قبل از وقت کر لیا جائے۔

آپ کہینگے کہ وہ کونسا مرض ہے؟ حضرت، وہ دہریت اور لا مذہبیت کا مرض ہے، جو مذہب کی پاک زندگانی کا کام تمام کردیتا ہے اور جس نے یورپ کو مذہب کی قید سے آزاد کردیا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اسلام کو ناواقفوں نے سائنس کے خلاف سمجھ لیا ہے، اس لیے انھیں مذہب کے خلاف کرنا ضروری ہے میں نے اس خیال سے کہ جب "مرقع عالم" میں سائنس کے تراجم شائع ہورہے ہیں، تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون "علوم جدیدہ اور اسلام" آپکے پرچے کے لیے بھیجا ہے، مجھے امید ہے کہ یہ سلسلہ ناظرین کے لیے باعث دلچسپی ہوگا اور وہ اسے غور و فکر کے ساتھ پڑھینگے۔

"مرقع عالم" کے غالباً ہزار سے زائد خریدار ہونگے۔ کیا ہزار میں سے نصف یا پانچسو بھی ایسے نہ ہونگے جنھیں اس کی توسیع اشاعت کا خیال ہو؟ میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک صاحب، احباب خریداریں سے ایک ماہ کے اندر پانچ خریداروں کے بہم پہنچانے کا ذمہ لے لے۔ اگر وہ مہینے کے اندر نہ بہم پہنچا سکے، تو دس روپے دے کر پانچ پرچے خرید لے، اس کا اسے اختیار ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس تجویز پر محبان علوم غور فرما کر عمل فرمائینگے کیونکہ جب تک ایسا خیال ہماری قوم میں نہ ہوگا، کبھی علمی ترقی نہیں ہوسکتی۔

میں نے آپ کی تمام تصانیف پر ایک ریویو بھی لکھا ہے۔ اسے بھی عنقریب ارسال کرونگا، جس سے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ "مرقع عالم" کیا چیز ہے، اور ہم اس کی کیسی ناقدردانی کر رہے ہیں۔ زیادہ نیاز۔

خادم احباب

ابوالکلام محی الدین آزاد دہلوی، مقیم کلکتہ

از کلکتہ، امرتلہ لین

محمد یوسف جعفری رنجور[۱] کے نام

(۱)

باسمہٗ

۱۱ امرتلہ لین۔ کلکتہ

۲۸ مئی ۱۹۰۲ء یوم الاربعاء

شفیقِ عالی جناب مولینا مولوی محمد یوسف صاحب

السّلام علیک و قلبی لدیک

آج غالباً میں وقتِ معہودہ پر نہ حاضر ہو سکوں۔ کیونکہ مجھے ایک ضروری مقام پر جانا ہے۔ اس لیے اگر آپ کو اوس وقت کہیں تشریف لے جانا ہو تو میرا انتظار نہ فرمائیے گا۔ اطلاعاً تحریر کیا گیا۔

خادمِ احباب

ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

(کان اللہ شانہٗ)

(۲)

۳ر جون ۱۹۰۲ء یوم الخمیس

میرے مکرم عنایت فرما

تسلیم

آپ سے مجھ سے محبانہ تعلقات گو قلبی حیثیت سے کیسے ہی اور قوی کیوں نہ ہوں، مگر مدّت کے لحاظ سے بہت ہی محدود حالات میں ہیں۔ اور اسی لیے مجھے اس وقت اس خط کے لکھنے میں بہت سے حجابات واقع ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ اس بات کا مجھے یقینِ کُلّی ہے کہ آپ سچّی محبّت کے اصول سے نہ صرف واقف ہیں، بلکہ عامل بھی ہیں، اس لیے یہ گزارش اور یہ بیوقت کی جسارت میری داخلِ لغویت نہ کی جائے۔

روپیہ کے گم ہونے کا حال تو آپ سُن چکے ہیں، اس لیے تمہید کی ضرورت نہیں۔ اصل مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک روپیہ کا کوئی بندوبست نہ ہوا اور ہوتا نظر نہیں آتا۔ نور محمد کے روپیہ رات کو گم ہو گئے اور تین بجے اوس کا تقاضا ہے اور آزاد کی ندامت۔ اس لیے اگر ممکن ہو اور تکلیف نہ ہو تو مبلغ بیس روپیہ اس وقت (یا تین بجے تک) بطورِ قرض عنایت ہوں، جو دو تین ہفتوں کے اندر اندر ادا کر دیے جائیں گے۔ کیا ممکن ہے؟ اور بھی احباب تھے، جنھیں اس بارے میں تکلیف دینی ممکن تھی۔ مگر میری نگاہِ انتخاب ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہتی تھی، جو بلحاظ اپنے محبانہ وصفوں کے اس تکلیف کے قابل ہو، اور اسی وجہ سے اس وقت آپ کو تکلیف دی۔

"تکلیف دوستوں ہی کو دی جاتی ہے" گولڈ اسمتھ

اس مقولے کے متعلق آپ کی کیا راے ہے؟

آزاد کی راے

"تکلیف جب دوستوں کو دی جاتی ہے تو وہ راحت سے بدل جاتی ہے۔"

داگر تکلیف دہی دوستان را کہ آن تکلیف نباشد) سعدی
حاملِ رقعہ معتبر آدمی ہے۔ آپ روپیہ اسے دے سکتے ہیں۔

ابوالکلام احمد
محی الدین احمد آزاد دہلوی
امرتلہ لین نمبر ۱۱ کلکتہ

(۳)

۱۳ جون ۱۹۰۲ء

برادرم، آج تیرھویں تاریخ ہے۔ اس عرصہ میں برابر خط لکھتا رہا۔ آج ایک بیرنگ خط آپ کا ملا ہے، جس کی تاریخِ روانگی ۱۱ جون معلوم ہوتی ہے۔ اور چند ضرورتوں سے میں ا بجے سے شام تک مکان پر کم رہا ہوں، اس لیے یہ بیرنگ خط آیا تھا اور واپس ہو رہا تھا۔ آج میں نے وصول کیا۔ نمبر ا کے پتہ سے جو آپ نے خطوط بھیجے، میرے اور مولوی احمد حسن[۲] کے نام، اون کا جواب بھی میں نے روانہ کر دیا ہے۔ لیکن آپ نے اوس کا جواب بھی ابھی تک نہیں دیا۔

میں اُسی دن ارشد علی کے پاس گیا تھا۔ اوس نے جواب دیا کہ خطوط اور ایک پمفلٹ میں نے عبدالرؤف صاحب کی آڑھت میں دے دیے ہیں۔ میں بچند وجوہ کے وہاں نہیں جا سکتا تھا (۱) میں مکان نہیں جانتا تھا (۲) وہاں چند ایسے ذات شریف ہیں جن کے ملفوظات اس کے پہلے ہماری سوسائٹی تک پہونچ چکے ہیں۔ اس لیے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ میں وہاں اس امر کے لیے جاؤں اور اس امر کو بزور ثابت کروں کہ واقعی میرے خطوط مولوی صاحب کے پتہ سے آتے تھے۔ اور انھیں اس اتحادِ نشان پر ریمارک کرنے (کا) موقعہ دوں۔ گو آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ مجھے ان لغو ریمارکوں کی بالکل پروا نہیں ہے،

اس حالت میں کہ مجھے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ جہلا کی زبانی نکلے ہیں۔ لیکن احتیاط کے خلاف بود۔

مگر مجبور ہو کر میں کل پہنچا اور خطوط وغیرہ لے آیا۔ ان میں دو خط مولوی شبلی کے تھے جس میں ایک ضروری کام لکھا ہوا تھا۔ یعنی نواب امیر حسن سے چند امور میں ضروری گفتگو کرنی تھی۔ اور چند کتابیں ایشیاٹک سوسیٹی سے لے کر اونھیں جلد بھجوانی تھیں۔ مگر وہ خطوط وہیں پڑے رہے۔ اور ارشد علی کی نالائقی اور آپ کی زود اعتباری نے یہ نتیجہ پیدا کیا۔ مجھے اس قدر شرمندگی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کل میں اسی لیے خط نہیں لکھ سکا کہ اون کے کام میں مصروف رہا۔ ایک کارڈ محمد یعقوب نامی شخص کا آپ کے نام کا تھا اور . . . . دو کارڈ اور ایک اور پمفلٹ جو کل شام ارشد نے مجھے دیا ہے، آج شب کے پہلے آپ کے نام بھجوا دونگا۔
اس ارشد کی نالائقی کا یہ حال ہے کہ باوجود فہمایش کے بھی خطوط نہیں پہنچاتا۔ اور آپ روز ڈاکخانے جا کے دن بھر کے خطوط لے آتا ہوں۔

آپ نمبر ۱۱ کے پتہ سے خط بلا تکلف لکھا کیجیے۔ عرب صاحب کے ذریعہ سے مجھے پہنچ جائیگا۔
بیرنگ کی یہ خرابی ہے کہ تین دن کے بعد آج مجھے آپ کا یہ خط ملا ہے۔ آپ پیڈ بھیجا کریں ہاں یہ فرمایئے کہ ادھر تین دن میں آپ نے خط کیوں نہیں لکھا؟ کیونکہ میں پرسوں بھی ایک خط لکھ چکا ہوں۔

بانکی پور لائبریری کی فہرست کی تلاش ضرور جاری رہے۔ اوس کی مجھے سخت ضرورت ہے۔
اگر نقل ہو سکے تو نقل ہی کرا لیں۔ اجرت دے دی جائیگی۔ ابھی تک دار جلنگ سے جواب نہیں آیا۔

والسّلام
ابوالکلام

(۴)

یوم السبت

۵ جولائی ۱۹۰۲ء

میرے محترم عنایت فرما، جناب مولوی رنجور صاحب

میں آپ کو اپنا حال کیا لکھوں! افسوس، مجھ کو ملو، تو آشکار ہوئے (؟ہو) پریشانی مجھ تک محدود نہیں رہتی، بلکہ آپ تک اوس کا اثر پہونچتا ہے۔ آپ کو انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹنی پڑتی ہیں۔ اور بعینہ یہی حال ہوتا ہے۔

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را[۴]

ابھی آپ سے رخصت ہوا۔ اوپر آیا تو دردِ سینہ میں مبتلا تھا۔ رہ رہ کر سینے میں ایک درد اٹھتا ہے اور یہ کچھ اپنا مزہ چکھا کر چلتا ہوتا ہے۔ گھڑی پر میری نگاہ ہے اور نہایت حسرت کے ساتھ میں اوس کی رفتار دیکھ رہا ہوں۔ افسوس کرتا ہوں کہ میرا درد کم نہیں ہوتا اور وقت جا رہا ہے۔ اس وقت دس بج گئے ہیں۔ اور غالباً آپ مکان میں ہونگے۔ خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے میری معذوری (؟) قیاس کر کے کسی بیرونی اثر پر محمول نہ فرمائینگے۔

(۱) میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، مگر اپنے اوس وعدے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کے پہلے بھی آپ اِس کی شکایت کیا کرتے تھے۔ مگر نہ اس قدر ملاقات ہوتی تھی اور سبق کا بھی سلسلہ رہتا تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ تین دن سے میں نے آپ کے مکان کی صورت تک نہیں دیکھی۔ آپ اپنی بے غایت (؟) اور پرلے درجے کی مہربانی سے خود عنایت فرماتے ہیں اور خود چاہ کر (؟) مجھے سبق دیتے ہیں۔ ہائے، میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ ایک ایسا شفیق اور غمگسار استاد پڑا چلا رہا ہے کہ "آؤ، آؤ مجھ سے جو کچھ تمھاری قسمت میں ہے، سیکھ جاؤ، پھر یہ وقت نہیں ملیگا"۔ مگر میں اپنی قسمت کے ہاتھوں مجبور، ایسے ایسے عوارضِ قلبیہ

اور جسمانیہ میں مبتلا ہو رہا ہوں کہ باوجود تشنگی کے اس سرچشمۂ فیض سے سیراب نہیں ہو سکتا!
افسوس بر بدبختیِ ما بر سرم خاک۔ !
غرض یہ کچھ میرا حال ہے۔ اس لیے نہایت ہی ادب سے ملتجی ہوں کہ آپ ایک دو دن اس سلسلۂ سبق کو بند رہنے دیں۔ بس تب تک جب کہ طبیعت کچھ سنبھل جائے اور عوارضِ جسمانیہ سے کچھ نجات مل جائے۔ پھر اگر میری قسمت میں آپ ایسے چشمۂ فیض سے فیضیاب ہونا لکھا ہے تو ہو رہوں گا، ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس ۔ فلک در چہ خیالست و من در چہ خیالم۔ این ہمہ خوبی قسمت است !
(۲) اور آپ میرے اس بیان کو کسی اور وجہ پر محمول نہ فرمائیں۔

دوستوں کا خادم
آپ ایسے مشفقوں کا گناہگار
آزاد دہلوی

(۵)

۱۲ر جولائی ۱۹۰۲ء از کلکتہ امرتلین ۱۱
یوم اثنین (وقت آٹھ بجے) می نویسم نامہ و مشتاقِ دیدارِ توام
میرے غمگسار حضرتِ رنجور !
کل صبح کی ڈاک میں، مَیں ایک خط روانہ کر چکا ہوں۔ دیکھیے وہ آپ کے پٹنہ جا کر پہنچتا ہے، یا آرہ۔ اوس سے خطوں کی بے عنوانی کا معاملہ آپ کو معلوم ہوگا۔ خط کو ارسال کرنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ آپ نے مصرعِ طرح پوچھا تھا۔ میں اوسے اوس خط میں نہ لکھ سکا۔ آج اس خط میں لکھ دیتا ہوں۔ مصرعِ طرح : یہ ہے بہت بعید حسینوں کی شان سے
شان، جان، ؛ قافیہ۔ سے ردیف۔

خط مولوی احمد حسن صاحب کو دے دیا گیا۔ غالباً انھوں نے انگریزی اخبارات منگوائے ہونگے۔
آج بھائی صاحب (مولوی غلام یٰسین آہ مدظلہ) نے آپ کا پتہ دریافت کیا تھا۔ میں نے ایک پرچہ
پر لکھ دیا۔ دیکھیے خط لکھتے ہیں یا نہیں۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں جس میں آپ آرفعت
کے لوگوں کی پوری مشرح کیفیت لکھینگے۔ غالباً کل صبح کو مجھے وہ مل جائیگا۔
اپنی چگونگی مزاج سے واقف کریں۔
غالباً آپ پنجشنبہ تک پہنچ جائینگے۔ اور ایک ہفتہ کا وعدہ ہے۔
میری غزل پر آپ نے اگر مصرع لگائے ہوں تو مجھے مطلع کیجیے۔ میں بہت ہی خوش ہونگا۔ آپ
اُس مخمس کو مشاعرہ میں ضرور پڑھیں۔
میری طرف سے جناب مولینا عبدالرحیمؒ صاحب کی خدمت میں تسلیم اور تمام خورد و کلاں کو دعا و
سلام شوق فرما دیجیے گا۔

آپ ایسے دوستوں کا خادم
ابوالکلام محی الدّین احمد آزاد دہلوی

(۶)

باسمہ تعالیٰ

می نویسم نامہ و مشتاقِ دیدارِ توام
برادرِ مشفق جناب مولانا نجور صاحب

اس وقت دس بج چکے ہیں۔ آپ کے خطوط کا انتظار ہے۔ ڈاکیے نے خط دیا اور طبیعت مسرور
ہوئی۔ کل صبح کو خط روانہ کر چکا ہوں۔ یقیناً آج آپ کو پہنچ گیا ہوگا۔
میں پہلے ہی سمجھا ہوا تھا کہ آدے پور پہنچ کر ضرور ایک گونہ آپ کی طبیعت مضمحل ہوگی۔ یہ ہو نہیں
سکتا کہ آپ اس ماتمکدہ میں پہنچ کر رنج و افسوس میں کافی حصّہ نہ لیں۔ ایک غم نصیب کو دیکھ کر

ضرور آنکھیں تر ہوگئی ہونگی اور اوس کی غمناک باتیں سن کر یقینی آہ و زاری کی نوبت پہونچی ہوگی۔
اب امید ہے کہ آپ پٹنہ پہنچ کر بوے وطن سے مسرور ہونگے۔ اور وہاں کی خوشگوار ہوا آپ کے لیے فرحت بخش ثابت ہوگی۔

آپ کا سلامِ شوق بھائی صاحب اور ہمشیرہ صاحبہ کو پہونچا دیا گیا۔ جواب میں اِس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ از مایاں نیز سلامِ شوق برسد۔ اتفاق دیکھیے کہ حضرت خیر کا رقعہ آپ سے لے کر میں نے جیب میں ڈال دیا۔ اور تاہنوز اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ ع

آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا

جیب سے خط نکالا اور پڑھا۔ مضامین نویسی اور جواب دہی کی فکر سے غافل نہیں ہوں۔ کل سے ہمشیرہ صاحبہ دام ظلہا کی طبیعت پھر خراب ہو چلی ہے۔ یعنی اُن پر استغراغ کی شدّت ہے۔ علاوہ اس کے اور بھی کچھ پریشانیاں ہیں جن کی وجہ سے میں نے مضامین نویسی کچھ دنوں کے لیے ترک کر دی ہے۔ رسالہ "ہیئتِ جدیدہ" اور "علوم الجدیدہ والاسلام" کی تالیف میں مشغول رہتا ہوں کیونکہ ان کا دوبارہ دہلی میں شائع ہونا ضروری ہے۔ دن کم رہ گئے ہیں۔ مضامین نویسی کو ترک کرنے پر بھی مجھے "اپنچ" کا خیال ہے۔ لکھونگا اور ضرور لکھونگا۔

جناب مولینا ادریس صاحب کو میری جانب سے سلامِ شوق عرض کیجیے۔ میں ان کا غائبانہ نیازمند ہوں۔

جناب مولوی مجیب (شعیب، صہیب) صاحب کی خدمت میں بھی سلام و نیاز عرض ہے۔ پٹنہ میں جائیے گا تو میری جانب سے جناب مولینا عبدالرحیم صاحب کو ضرور سلام کہیے گا۔
پھر کل انشاء اللہ عریضہ تحریر کرونگا، ابھی مجھے سبق لینا ہے۔

آپ کا خادم

ابوالکلام دہلوی

کلکتہ۔ امرتلا لین نمبر ۱۱ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۲ء

(۷)

(۱۹۰۲ء)

برادرِ شفیق

کسی قدر اس وقت بخار چڑھا ہوا ہے۔ طبیعت مضطرب ہے۔

کل اوپر آئے، تاریخیں لکھیں، مگر اب کوئی شخص لے جانے والا نہ تھا۔ بھائی صاحب نے بھی صاف انکار کر دیا، ایسی حالت میں کہ گلدستوں کی طرحوں اور اخباروں کے مضامین سے ان کو فرصت نہیں کہ وہ اپنے بھائی علیل کی طرف متوجہ ہوں۔ خود میں زینہ دوبارہ طے نہیں کر سکتا تھا۔ یا تو گر پڑتا اور راہ ہی سے واپس آجاتا۔ آخر رحمت آئی، جس سے کہا تو اس نے کہا کہ مولوی صاحب نہیں ہیں، میں نیچے دیکھ کر آئی ہوں۔ میں تو باوجود بیمار ہونے کے اس قدر بے بس ہو رہا ہوں۔ بیماری میں ہزار۔ . . . موجود ہوئے۔ غرض یہ میری اونھیں مجبوریوں کے سلسلے میں ایک مجبوری تھی، جس سے میں خود پیام بر (کذا) واقف ہے۔ اب وہ پُرزہ گم ہو گیا ہے کیونکہ میں نے آپ کو لکھ کے بھیج دیا تھا۔ اس لیے جو یاد ہے، اوسے لکھ دیتا ہوں زیادہ کا انتظار نہ فرمائیں۔

اس رسالے کی کس سے ہو تعریف، واقعی فیض کا مقالہ ہے
ہر روایت ہے مستند اس کی معتبر اس کا ہر حوالہ ہے
سر سے آزاد لکھ دو ہجری سال "خیر آفاق یہ رسالہ ہے"
(۱۳۱۸ء=۱۳۱۹ء)

پارسی نہیں۔ منظور صاحب سے بیشک لکھوا دیں
میری طرف سے بھابی صاحبہ وغیرہ کو آداب و تسلیم

رنجور آزاد

(۸)

بھائی رنجور! دوسرا حمائل شریف، جس کا میں نے ذکر کیا تھا، ارسالِ خدمت ہے۔ یہ بہ نسبت اوس حمائل کے بہت عمدہ اور خوشخط ہے۔ مگر ابتدا کے دو سیپارے اور آخر کا ایک سیپارہ

اس میں نہیں ہے۔ اگر وہ اس کی کافی قیمت، کم از کم بیس یا پچیس روپیہ دینا منظور کریں، تو میں ایک اعلیٰ درجہ کے نسخ نویس سے، اس خط کے موافق، نہایت عمدہ لکھوا دونگا اور ابتدائی اوراق مطلاّ مذہب بھی عمدگی کے ساتھ ہو جائینگے۔ بالکل اوسی طرح جیسے عموماً پرانے ہوا کرتے ہیں مگر ایسی حالت میں پچیس ؏ سے کم کبھی نہیں ہو سکتا۔ اگر اونھیں منظور ہو، تو اپ اطلاع دیں۔ تقریباً دو ہفتہ میں یہ کامل (؟ کام) مکمل (ہونے میں) لگیں۔ مطلاّ مذہب مجلّد ہو کر دے دیا جائیگا۔

دوسرے متوسط درجے کی تقطیع کا قرآن شریف، جو آپ (کے) پاس میں دے چکا ہوں، اوس کے متعلق بھی یہی گزارش ہے کہ اگر وہ منظور کریں اور قیمت کافی دیں، تو اس قسم کا کام کر دیا جائے۔ ابتدائی خراب اوراق بدل کر عمدہ اوراق مطلاّ و مذہب لکھوا کر شامل کر دیا جائے۔ آخری اوراق کو بھی بدل کر، یا سورتوں کے سرنامے پورے لکھ کر اور رنگین جدول دے کر ٹھیک کر دیا جائے۔ اگر وہ کم از کم چالیس ؏ روپیہ منظور کریں تو لوح بھی زرافشانی کے ساتھ بن سکتی ہے۔

والسّلام علیکم بالمودۃ والوداد

آپ کا مخلص دوست

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۹ جنوری ۱۹۰۳ء)

9 - 1 - 3

(۹)

۱۱ فروری ۱۹۰۳ء

یوم الخمیس

بھائی رنجور! کل تم نے میرا بہت انتظار کیا ہوگا، مگر نہ میں آیا اور نہ میرا خط پہونچا۔ واقعی تمھارا کہنا ٹھیک ہوا۔ چار بجے میں خوابِ غفلت میں مست پڑا تھا۔ چھ بجے اٹھا تو طبیعت بیحد بے مزہ

پائی کہ آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

کل میں نے عرب صاحب تو نہیں، قدیر صاحب سے ستّر روپیہ کہہ دیے تھے۔ انھوں نے کہا: مولوی صاحب ننانوے روپیہ کہیں، جب بھی نہیں ہوسکتا۔ سو روپیہ اوس کی قیمت یقینی ہے۔ آپ قرآن شریف پہونچا دیجیے۔

اس حالت میں تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اب معاملہ بگڑ گیا ہے۔ اور سوائے سو روپیہ دے دیے جائیں، اور کوئی صورت نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے اس معاملہ میں ناکامیابی ہوئی۔ اور سوا فضول تضیعِ اوقات کے اور کچھ نہیں حاصل ہوا۔

اصل بات یہ ہے کہ کچھ دنوں سے میری مالی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ چند در چند خرابیں ایسی واقع ہوئی ہیں کہ حالت بالکل خراب ہوگئی۔ حیدر آباد کے معاملے میں اکتیس روپیہ کا نقصان ہوا ہے۔ روپیہ یوں برباد بھی بہت ہوئے ہیں، جن سے تم خوب واقف ہو۔ اس لیے میں نے یہ زحمت اپنے سر لی تھی کہ خیر، کچھ نہ کچھ روپیہ اگر اس ذریعہ سے ہاتھ لگ جائینگے تو کام آئینگے۔ ابھی مجھے بعض لوگوں کو روپیہ دینے ہیں۔ دو گھڑیں بنوانے کو دی ہیں، جنھیں سے چودہ روپیہ بنوائی دینی ہے۔ اس لیے یہ روپیہ میرے بہت کام آئینگے۔ مگر افسوس ہے کہ مجھے اس معاملے میں کامیابی نہ ہوئی اور سوائے محنت اور حیرانی کے جس میں تم بھی شریک ہوا اور کچھ نہیں حاصل ہوا۔ خیر! سوائے صبر چہ چارہ است! الخیر فی ما وقع

سو روپیہ ارسال خدمت ہیں۔ انھیں وصول کر وا اور رسید دو۔ آفس سے واپس ہوتے ہوئے تم عرب صاحب سے ملنا، میں ہوں یا نہ ہوں، مگر تم ان سے کہنا کہ "کل ہمارے صاحب کے پاس قرآن شریف لے کر صاحب آئے تھے اور اون سے اونھوں نے مشورہ کیا کہ یہ قرآن شریف واپس کیا جائے یا نہیں؟ ہمارے صاحب نے قرآن شریف کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کو پھر ایسا نہیں ملیگا۔ خیر صاحب ستّر روپیہ پہ راضی ہوئے۔ میں نے کل آزاد سے کہا وہ آپ سے پوچھنے جا رہے تھے کہ راہ میں میر باب اللہ مل گئے۔ اون سے اونھوں نے پوچھا تو انھوں نے

کہا کہ سو سے کم نہ دو، چاہے کتنی ہی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ میں نے صاحب سے کہہ دیا، تو صاحب نے یہ روپیہ آج بھجوا دیے۔ آپ لے لیجیے، اور باضابطہ رسید دے دیجیے"۔ تم ان سے یعنی عرب صاحب سے یہی کہنا۔ میں بھی یہی کہونگا۔ تمھارے کہنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرا کہنا بوجوہ مناسب نہیں ہے۔ میں تم سے انشاءاللہ تعالیٰ ضرور بالضرور چار بجے ملونگا؛ اس وعدے میں فرق نہ ہوگا۔ اگر دو بجے تم ملنا چاہو تو دارالاخبار میں مل سکتے ہو۔ عرب صاحب سے تمھارا میری عدم موجودگی میں یہ باتیں کرنی مناسب ہے۔ اس میں فرق نہ ہو۔ والسلام

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۱۱ر فروری ۱۹۰۳ء)

(۱۰)

بھائی رنجور،

پچھلے خط میں، مَیں نے جو ابتدا میں تمھیں کسی لقب سے یاد نہیں کیا۔ یہ قصور نہ تھا۔ بلکہ ہوا یہ کہ بعض لوگوں کو میں ایسا ہی خط لکھا کرتا ہوں۔ لکھتے وقت خیال نہیں رہا۔ بہرکیف میری غلطی کو تم معافی کی نگاہ سے دیکھو؟

پانچ روپیہ کی مجھے اِس وقت ضرورت ہے۔ کیا اِس وقت میری ضرورت رفع ہوسکتی ہے؟

حاملِ رقعہ کو تم صرف روپے دے سکتے ہو، نہ کہ خط۔

میں آج ٹھیک چار بجے حاضر ہونگا، کل وعدہ خلافی ہوگئی۔ اوس کا حساب نہیں۔ اگر آج سے میرے وعدوں میں فرق آیا کرے، تو پھر واقعی میں سخت مجرم ہونگا

ابوالکلام آزاد

28-2-03

(۲۸ فروری ۱۹۰۳ء)

(۱۱)

باسمہ سبحانہٗ

بھائی، میں آپ سے سخت نادم ہوں۔ میرے ذریعے سے آپ نے اچکن سلوانے کو دی، اور تاہنوز سل کر نہیں آئی۔ یہ تو آپ کو کل معلوم ہوگیا ہے کہ بٹن چونکہ غلطی سے نہیں دیے گئے تھے، اس لیے کل اچکن باوجود تیار ہوجانے کے نہیں ملی۔ کل شام کو بٹن دے دیے گئے۔ اور یقینی امید ہے کہ دو بجے تک سلی سلائی شیروانی اور تین پاجامہ بھی مل جائیگا۔

کل میں نے آج چار بجے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر یہ میری سخت غلطی تھی کیونکہ آج چار بجے جوبلی اسکول میں میرا "اسلامی اتفاق" پر لکچر ہے۔ اس لیے میں ٹھیک ۲ ڈھائی بجے حاضر ہونگا تاکہ جیسے ہی آپ آفس سے تشریف لائیں، آپ سے باطمینان مل کر ۳. (ساڑھے تین) بجے چلا جاؤں۔ کیا اے اقدس؟

اچھا، اب ۲. (ڈھائی) بجے ملونگا۔ خط بھی کل ضرور لکھوں گا انشاءاللہ تعالیٰ

ابوالکلام محی الدین آزاد

8 / 3/03 (۸ مارچ ۱۹۰۳ء)

یوم الاثنین

(۱۲)

برادرم،

حضرت سے اچھی طرح گفتگو ہوئی (انھوں) نے اجازت دی اور فرمایا کہ "بہتر خط لکھ کر روپیہ منگوا لو"۔ لہٰذا آپ جناب کاظم سے کہہ دیجیے کہ وہ خط لکھ کر کرایہ اور (رما سوم) پیشگی منگوالیں۔

ہاں تو آفس میں آپ دو کام ضرور کریں: (۱) ویبسٹر ڈکشنری سے اہرام مصر کا فوٹو نکالیے۔ (۲) ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست ملاحظہ ہو۔ کتاب "رسالہ ملک شاہ سلجوقی یعنی سفرنامہ ملک شاہ

سلجوقی فارسی"۔

مرزا کاظم صاحب سے میرا اسلام شوق کہہ دیجیے گا۔ اور فرمایئے گا کہ چند اور رسائل اور اخبار ہیں، جن میں "سہل آموزِ فارسی" پر ریویو ہونا ضروری ہے۔ اس لیے وہ مجھ سے کہیں ملاقات فرمائیں اور چار نسخے "سہل آموز" کے لائیں، تاکہ میں وہاں بھیج دوں۔ بعدِ مغرب کل یا پرسوں دارالاخبار میں مل سکتے ہیں۔

ابوالکلام

26/5/03 (۲۶ مئی ۱۹۰۳ء)

سہ شنبہ

(۱۳)

برادرم

آج یا کل کیا معنی! آزاد ہمیشہ آپ کے انتظار کا لطف حاصل کرنے کے لیے بخوشی طیّار ہے۔

آج یتیم خانہ مولوی صاحب قطعی جائینگے۔ امید ہے کہ کل تک چھپ جائیگی۔ ہاں ایک امر آپ سے دریافت کرنا ہے۔ وہ یہ کہ لاہور کا درجۂ آخر کا کرایہ کیا ہے؟ اس کا جواب لکھ کر آپ آفس جاتے ہوئے دیتے جائیں۔

والسّلام

آپ کا ہمیشہ ــــــ

ابوالکلام

باغ و بہار کی طرز کی کتاب لکھ رہا ہوں۔ وجہِ تالیف میں سلطنتِ انگریزی

کے برکات بیان کیے ہیں۔ مثال (؟) میرا منّ کے غالباً ہو گا۔

ابوالکلام

یوم الثلٰثہ 2/6/03

(۲ جون ۱۹۰۳ء)

(۱۴)

کلکتہ

برادرم! آج تیسرا روز ہے کہ آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ اس کارڈ میں لکھنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر بات آج نہیں ہوئی۔ مولوی احمد حسن صاحب بدستورِ سابق منتظرِ خط ہیں۔ غالباً دار جلنگ کا مضمون رفت گذشت شد۔

بانکی پور کی لائبریری کی فہرست کا خیال رہے۔ اصل ملے، تو بہتر، ورنہ نقل کرا لیجیے گا۔ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ والسّلام

ابوالکلام آزاد

۱۸/۶/۱۹۰۳ (۱۸ جون ۱۹۰۳ء)

(۱۵)

برادرم!

میں آپ کو خط نہیں لکھتا کہ آپ مجھے نہیں لکھتے۔ کلکتہ کس دن پہونچیے گا؟ کس وقت؟ یا ابھی پٹنہ میں کچھ اور رہنے کا ارادہ ہے؟ مطلع فرمائیں؟

میں بخیریت ہوں۔ والسّلام

۱۱، امرتلہ لین کلکتہ

آپ کا ابوالکلام دہلوی

۲۰ جون ۱۹۰۳ء

(۱۶)

باسمہٖ سبحانہٗ

۱۳ جولائی ۱۹۰۳ء

یوم الخمیس حضرت رنجور

ناول "گورا" ارسالِ خدمت ہے۔ میرا ذاتی ناول جناب سلیم صاحب لے گئے ہیں۔ اسی لیے یہ اس وقت عبدالقیوم (۹) صاحب تاجرِ کتب کے ہاں سے خرید کر ارسال کیا جاتا ہے، مخدومہ ملاحظہ فرمائیں۔

میری بیاض اگر خالی ہو گئی ہو تو عنایت فرمائیں کیونکہ اس وقت مجھے اُس میں کچھ تازہ تصنیف رباعیں لکھنی ہیں۔ ممکن ہے، کچھ دیر بعد فراموش کر جاؤں۔

جناب منظور صاحب کو سلامِ شوق کہہ دیجیے۔ حضرت حسّان اور حضرت بن یامین کو دعا

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۱۷)

امرتلہ لین ۱۱ کلکتہ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۰۳ء

میرا نام محی الدین ہے۔ ۱۳۰۳ ہجری میں مکّہ معظّمہ میں پیدا ہوا۔ میرے والد خیرالدّین دہلی کی قدیم سوسائٹی کی یادگار ہیں، جن کا خاندان بغداد سے پنجاب آیا اور پنجاب سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی پہنچا۔ غدر سے کچھ پہلے میرے والد بمبئی آئے اور بمبئی سے مکّہ معظّمہ چلے گئے۔ وہاں ایک مدّت رہ کے پھر ہندستان آئے۔ اور ہندستان میں کچھ عرصہ رہ کر بغداد، کربلاے معلّیٰ، نجف اشرف، مصر، قسطنطنیہ، بیت المقدس وغیرہ کی سیر کر کے پھر مکّہ معظّمہ آئے اور وہیں میں پیدا ہوا۔ میری والدہ کا نام زینب تھا۔ اور میرے والد جہاں جہاں گئے، وہ ساتھ رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے والد کو، والدہ سے بہت محبّت اور الفت تھی۔

۱۳۰۴ھ کے اوائل میں یکایک والدہ کو ہندستان کے مشہور مقامات دیکھنے کا شوق ہوا۔ اور والد صاحب کو بھی حب الوطنی نے اس تحریک کو عملی صورت میں لانے کے لیے آمادہ کر دیا۔ اور سننے والوں نے تعجّب سے سُنا کہ مولوی خیر الدّین صاحب بمبئی آ گئے ہیں۔

۱۳۰۴ھ کے اواخر میں اجمیر، اکبرآباد وغیرہ مقامات کی سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور حاجی واحد نا جو یہاں کے مشہور رئیس اور والد صاحب کے معتقد تھے، انھیں اپنے گھر لے گئے۔ کلکتہ پہنچے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ میری والدہ یکایک سخت بیمار ہو گئیں اور بیماری سے دو ہفتے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

والدہ کا انتقال ایسا نہیں تھا جو والد کو نہایت ملول نہ کرتا۔ بہت غمگین رہے۔ نہایت ملول ہوئے۔ مکّہ معظّمہ جانے کا ارادہ پھر ہوا، لیکن بعض مذہبی بحثوں کے چھڑ جانے اور والدہ کے مزار کے تیار کرنے کے خیال نے رکاوٹ پیدا کر دی۔ انھیں دنوں میں کلکتہ کی بڑی مسجد میں ان کا ہر جمعہ کو وعظ ہوا کرتا تھا۔ لوگ جوق جوق مرید ہو رہے تھے، ایمانِ آبار و اجدادِ حضرت رسول کی بحث ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی ایک قدیم تصنیف جو اسی موضوع پر لکھی تھی، ترمیم کے ساتھ چھپوانی شروع کر دی تھی۔ اور اسی لیے ایک پریس جاری کیا تھا۔ غرض ایسے تعلّقات پیدا ہو گئے تھے کہ دوستانِ کلکتہ کو کئی برس تک روکنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب ضروری ہے کہ میں یہاں اپنے بھائی بہنوں کا نقشا درج کر دوں، تاکہ آیندہ واقعات ذہن نشین ہو جائیں۔

اولاد اناث	اولاد ذکور
خدیجہ : ۱۲۹۱ ہجری سالِ پیدائش	غلام یاسین ۔ ۱۳۰۱ ہجری
فاطمہ : ۱۲۹۷ ہجری	محی الدین ، ۱۳۰۳ ہجری
حنیفہ : ۱۲۹۹ ہجری	

اس سے تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ سب سے بڑی اولاد خدیجہ ہے، ۱۲۹۱ ہجری میں پیدا ہوئی تھی۔

اس لیے جب والدہ کا انتقال ہوا یعنی ۱۳۰۵ ہجری میں خدیجہ کی عمر چودہ برس کی تھی مگر خدا جانے کیوں، اس زمانے میں شادی نہیں ہوئی اور اسی نہ ہونے نے آج وہ فساد اور جھگڑا پیدا کر دیا جس نے میری زندگی تلخ کر دی ہے اور خودکشی پر آمادہ ہوں۔

میری والدہ کے بھائی محمد ہاشم نے مکہ معظمہ میں ایک کپڑوں کی دکان کر لی تھی، جو خوب چلتی تھی۔ محمد ہاشم کے تین لڑکے تھے: محمد شفیع، محمد سعید، محمد مکّی۔ جہاں تک میں نے واقعات سے نتیجہ نکالا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ والدہ مرحومہ کا ارادہ تھا کہ وہ تین بہنوں کو انھیں تین لڑکوں کے ساتھ منسوب کریں۔ محمد شفیع اسی خیال سے کلکتہ آیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ والدہ کو انتقال کیے دو تین برس ہو گئے تھے اور والد کا رنگ کلکتہ میں خوب جما ہوا تھا۔ محمد شفیع اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہوا اور خدا جانے کیوں، والد نے شادی نہیں کی۔ بالآخر وہ ناراض ہو کر اور انتظار کی سخت گھڑیاں کاٹ کر رنگون چلا گیا اور پھر ایسا مفقود الخبر ہوا کہ آج تک کوئی پتہ.....

(۱۸)

باسمہ سبحانہ

میرے سچّے دوست، اور میرے سچّے مکرم حضرت رنجور!

(۱) ملازمہ کی تلاش سے میں غافل نہ تھا مگر چونکہ اِدھر کچھ گفتگو نہ ہوئی، میں نے اِس کا ذکر نہ کیا۔ ہمشیرہ صاحبہ یعنی آبرؔو تلاش میں ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب کوئی نہ کوئی ملازمہ کم عمر منتخب کر لی جائیگی۔

(۲) آپ نے اس قدر کمسنوں کی کیوں تعریف کی ہے؟ کمسنوں کی تعریف دنیا جانتی ہے۔ کیا میرے خوش کرنے کو حضرت! واقعی آپ کا فرمانا بجا ہے۔ اور درست ہے۔ اس کمبخت عمر میں جو کام ہو رہتے ہیں، وہ زیادہ عمر میں نہیں ہوتے! انشاء اللہ تعالیٰ ایسی ہی عمر کی انتخاب کی جائیگی۔ آپ مطمئن رہیں۔

آپ کی مقدس لائف تذکرہ صادق پور سے نقل کر لی جائیگی۔ اور باقی اوصاف مخصوصہ جن کی بنا میرے تجربے پر ہے، موقعہ بموقعہ تحریر کر دونگا۔ اور اس پرچے سے جو کرزن گزٹ کے لیے آپ نے عنایت کیا تھا، انتخاب کردہ ونولسیندہ شود۔ انشاء اللہ تعالیٰ بعونہ ولطفہ

مخدومہ مکرمہ جناب بھابی صاحبہ مدظلہا وزادلطفہا کو میری جانب سے اور جناب آبرو (میری چھوٹی ہمشیرہ) کی طرف سے آداب وتسلیم فرمائیں۔ اور نیز اور ہمشیرہ صاحبوں کی طرف سے۔

اے جناب! یہ تو کہیے کہ دوستی وداد کے یہی معنی ہیں کہ ایک "گورا" دو تین روپیہ کی کتاب کے لیے آپ بار بار گفتگو کریں؛ خط میں تحریر کیا اور پھر بالمشافہ بھی محرک ہوئے آخر یہ ایسی چیز ہی کیا تھی میرے نزدیک۔ لیکن صاف دلوں کے نزدیک (یورپ میں مثل ڈاکٹر موئل اور مسٹر اڈلیسن کے) "کسی دوست کی لمحہ بھر کی خوشی دوسرے دوست کی روحانی خوشی کے لیے کہیں اُس مسرت سے زیادہ ہے جو مالی حیثیت سے ہر ایک دنیا میں رہنے والے کو بالعموم حاصل ہوا کرتی ہے۔" (آرٹیکل اڈلیسن)

آپ خیال فرمائیں کہ میں نے گورا ۲ روپیہ میں خرید کیا۔ سوچیے تو دو روپیہ کیا چیز ہے۔!

اور میری ایک سچی مشفقہ مکرمہ کو اوس کے مطالعہ سے جو مسرت ہوئی ہوگی، غور کریں، تو ایک دوست کے لیے کتنی بڑی بات ہے؟ گورا! اے حضرت، اگر جان طلبی مضائقہ نیست.....

دوستوں کا (مگر سچے دوستوں کا) خادم

ابوالکلام آزاد دہلوی

مقیم کلکتہ ۲۱ جون ۱۹۰۳ ۸ بجے شب

کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ

میں اوس روحانی خوشی کے بخشنے والے وقت کا منتظر ہوں جب کہ جناب بھابی صاحبہ کی طرف سے کسی کارِ لائقہ کی فرمائش کی جائیگی، گو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ میں کسی کام کے لائق نہیں ہوں، مگر بندہ نوازی کے معنی نے مجھے اس کا یقین بڑھا دیا ہے کہ از دوستان امیدِ لیاقت مدار، لیاقتِ خود بیں! او در شان) ہم لائق شوند۔

بس اس مقولہ پر وہ عمل کریں اور مجھے شاد فرمائیں۔

(۱۹)

۲۶ ستمبر ۱۹۰۳ء، یوم الجمعہ

میرے سچّے دوست، میرے مکرّم

اللہ آپ کو صحتِ کامل عطا فرمائے! ــــــ آمین!

میں کل تقریباً تین بجے آپ کے درِ اقدس کی طرف آرہا تھا کہ راہ میں حضرت منظور سے ملاقات ہوگئی۔ فرمانے لگے کہ اون کا حال ویسے ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جارہا ہوں۔ اس خبر سے مجھے سخت صدمہ ہوا کیونکہ میں یہ خیال کرکے آیا تھا کہ آپ کو نہایت صحیح وسالم پاؤنگا اور طبیعت مسرور لے کر واپس آؤنگا۔ لیکن اس خبر نے خلافِ توقع مجھے پریشان کر دیا۔ بہرکیف میں آگے بڑھا کہ ملاقات ہی سے کچھ خوشنودی حاصل کرلونگا۔ مگر اون سے معلوم ہوا کہ ابھی آپ آرام کر رہے ہیں۔ ناچار اونھیں کے ہمراہ واپس چلا آیا۔ پھر آکر اونھیں پریشانیوں میں اور اونھیں افسردہ کن خیالوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اور آپ کی ملاقات کو اون خیالات سے رہائی کا ذریعہ سمجھا تھا۔ راہ میں حضرت منظور فرمانے لگے کہ "کہیے کیسی طبیعت ہے؟ آپ کا چہرہ بہت زرد ہو رہا ہے"۔ میں نے جواب دیا (اور سوا اس کے اور کیا جواب دیتا) کہ "ہاں حضرت! زرد رُو ہو چکا ہوں۔ دیکھیے سرخروئی کب نصیب ہوتی ہے"! بہرکیف ؏ کہیے کیسا ہے اب مزاج شریف؟ انشاءاللہ عصر کے وقت حاضرِ خدمت ہونگا۔

خادمِ احباب

ابوالکلام دہلوی

(۲۰)

۲۵ جون موجودہ صحیح پتہ: بمبئی بلاسس روڈ، نیو بلڈنگ، پوسٹ بھائیکلہ

برادرم

بڑے انتظار کے بعد روپیہ پہنچے۔ پہلے میں نے بیشک، بلاضرورت منگوائے تھے مگر پھر میں نے دائرۂ معارف خریدلی اور روپیہ کے لیے تار بھیجا۔ خطوط نہ بھیجنے کی اصل وجہ میری علالت ہے۔ میں ابھی ہرگز پسند نہیں کرتا کہ لسان الصدق میں نظم کا حصّہ شروع ہو۔ آپ کو ذرا انتظار کرنا تھا خیر، اب بھی اس نظمِ انگریزی لباس کی کاپی نکال دی جائے۔ ہرگز شائع نہ کیجیے۔ رسالہ کی ایک مخصوص روش رہنے دیجیے۔ مضامین بھیجتا ہوں۔ صحت کا للہٰ خیال کیجیے۔

جرائم پیشہ مضمون میں ہر جگہ بلا استثنا یائے مجہول ملتی ہے۔ آپ منشی صاحب کو کہہ دیں کہ وہ اس کا خیال رکھیں۔ اور موقع پر معروف بنا دیں۔ یہ سچ ہے کہ آپ کو فرصت نہیں ہے۔ مگر ذرا میری خاطر تکلیف گوارا کیجیے۔ ایک مختصر عربی مضمون "السعادت والعلم" بھیجتا ہوں۔ اس کا صاف ترجمہ کر کے درجِ رسالہ کر دیجیے۔ عنوان عربی ہی کار ہے۔ ترجمہ مثل مضمون کے ہو۔

حافظ عبدالرحمٰن کے رسالہ کے ٹائیٹل پر "کتاب النحو" کے ۵ر آنے، "صرف" کے ۸ر، "بول چال" کے ۸ر، بنا کر بھیجیے۔ امرتسر ہال بازار؛ دفتر وکیل، مسٹر ایس ایم شفیع کو ارسال کیجیے اور نیز ان دو پتوں پر: امروہہ، محلّہ پیرزادگان، مولوی سید شاہد حسین انجم امروہوی۔ دہلی؛ درگاہ حضرت نظام الدین، مولوی حسن نظامی صاحب، مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی۔

کاپی پروف کو دو تین مرتبہ دیکھیے۔ صحت کا خیال ضروری ہے۔ بغرضِ مبادلہ ان لوگوں کو پرچہ بھیجیے۔

ایڈیٹر رسالہ محبوب الکلام، دبدبۂ آصفی، افضل گنج، حیدرآباد۔

لکھنؤ، گولہ گنج۔ ایڈیٹر "الحکم"

ایضاً؛ دارالعلوم، ندوۃ العلوم، (کارڈ لکھیے۔ منیجر کی طرف سے ریویو و مبادلہ کیجیے) باقی پھر۔

ابوالکلام

(۲۱)

۴ جولائی ۱۹۰۵

13, Blasis Road,
P.O. Byculla,
Bombay.

برادرِ محترم

اس وقت تک میں کس حال میں رہا؟ کس حال میں ہوں؟ آپ کن علائق میں پھنسے ہوئے ہیں؟ اور کن مصیبتوں میں تھے؟ پہلے دو سوالوں کے جواب کی اب ضرورت نہیں اور آخری سوالوں کا جواب مدّت سے معلوم ہے۔ منشی رضا الحق سے سب کچھ معلوم ہوتا رہا۔ اور شاید آپ کو بھی کچھ معلوم ہوا ہو۔ ۱۷ اپریل کو پنجاب روانہ ہوا تھا۔ اور دو ماہ کے بعد ۳۰ مئی کو بمبئی پہنچا۔ یہاں پہنچ کر ایک واقعہ نے سخت صدمہ پہنچایا جس کا اثر اب تک ہے اور شاید مدّت تک رہیگا۔ اس واقعہ کی آپ کو مجھ سے پہلے اطلاع پہنچ گئی ہوگی۔

"لسان الصدق" اپریل سے پھر شائع کیا گیا۔ تمام خریداروں کے پاس مدّت سے پہنچ چکا ہے۔ لیکن آپ کے پاس اور خریدارانِ کلکتہ کے پاس اب تک نہیں بھیجا گیا۔ آج پیکٹ رجسٹرڈ بھیجتا ہوں۔ تمام خریداروں کے پاس بھیج دیجیے۔ مولوی عبدالباری صاحب وغیرہ معززین کے لیے درجۂ اول بھیجتا ہوں جس کی قیمت ہے (تین روپے چھ آنے)۔ نومبر میں یہ سب کلکتہ والے خریدار ہوئے تھے اور بارہ پرچوں کے حساب سے اس نمبر پر سال ختم ہوجاتا ہے۔ درجۂ دوم کی قیمت عہ (دو روپے چھ آنے) ہے۔ برائے خدا کوشش کرکے قیمت جمع کیجیے۔ وحشت، اکمل وغیرہ کو کہیے کہ اگر فیس ماہوار نہیں دیتے اور نہیں دے سکتے تو خیر، انھیں گذشتہ جون کے بعد سے کچھ نہیں دیا گیا۔ اب اتنی عنایت کریں کہ عہ سالانہ کی جگہ (چھ روپے) نہیں، تو عہ (تین روپے چھ آنے) منظور کرلیں اور درجۂ اول کی قیمتیں دے دیں۔ امید ہے کہ وصول ہوجائیگی۔ مولوی عبدالباری وغیرہ سے درجۂ اول کی قیمت وصول کیجیے، باقی جو دیں، اس نمبر پر ۵۹ (انسٹھ روپے بارہ آنے) ۱۲/ خرچ ہوچکے ہیں۔ علاوہ صرفِ محصول وغیرہ۔

روپیوں کی ضرورت اور بیحد ضرورت ہے اگرچہ یہ کہتے ہوئے اور رسالہ کا معاملہ ڈالتے ہوئے

شرم معلوم ہوتی ہے کہ مدّت کے بعد سر نکالا، تو اپنی غرض کے لیے۔ بہرکیف جو کچھ ہو، حالت یہ ہے۔ میری کتابیں بھیج دیجیے۔ کچھ قیمتیں وصول ہو جائیں، تو محصول ان سے لے کر لگا دیجیے۔ سرِ دست ذیل کی چار کتابوں کی بیحد ضرورت ہے۔ انھیں خط دیکھتے ہی روانہ کر دیجیے۔

الملل و النحل: عبدالکریم شہرستانی، مطبوعہ یورپ، مجلّد۔

ایک عربی کتاب ضخیم مصر کی چھپی ہوئی جس کا مصنّف رفاعہ افندی ہے اور غالباً جغرافیہ یا علم طبقات الارض میں ہے۔ مجلّد۔

رسالۃ التوحید عربی مطبوعۂ مصر۔ چھوٹی تقطیع۔ غیر مجلّد۔ زرد کاغذ پر چھپا ہے۔

المقدّمہ عربی۔ مطبوعہ علی گڑھ۔ مجلّد۔ مصنّفۂ مولوی کرامت حسین صاحب، الٰہ آباد سے ٹائپ پر چھپا ہے۔

والسّلام

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۲۲)

بمبئی بلاسس روڈ۔ پوسٹ بہائیکلہ۔ نیو بلڈنگ ، جولائی

برادرم

آپ کے تمام خطوط اور اخبارات مجھے ٹھیک ٹھیک وصول ہو رہے ہیں۔ مادّۂ تاریخ بھی وصول ہوا اور ارجنٹ خط کا جواب بھی۔ میں کچھ ایسا خبطی ہوں کہ آپ کو ان خطوط کی رسید نہ بھیج سکا۔ آپ اطمینان رکھیں اور اسی پتہ پر خطوط بھیجا کریں۔ ریویوز وغیرہ کل مع ایک مفصّل خط کے ارسال ہوگا۔ ٹائیٹل ایک ہزار چھپ کر براہِ راست کلکتہ پہنچیگا۔ بھائی صاحب سے بوجوہ چندہ نہ وصول ہوا، نہ میں نے اصرار کیا۔ ہاں، روپیہ کل لکھنؤ بھیج دونگا۔ میری طرف سے سب کو سلام کہیے۔ جنھوں نے وی پی واپس کیے ہیں، اون کا پتہ لکھیے۔

ابوالکلام

(۲۳)

بمبئی

۱۴ جولائی ۱۹۰۴ء

برادرم، عنایت نامہ مع اخبارات پہنچا شکایت بجا ہے۔ لیکن غالباً آپ کو اس کی اطلاع نہیں ہے کہ میں ایک ہفتہ سے پھر بخار میں مبتلا ہو گیا ہوں (اب طحال کی شکایت نہیں ہے صرف بخار ہے) میں اب یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جون جولائی کے ملا کر ایک ساتھ نمبر شائع کر دیے جائیں، تاکہ یہ کمی پوری ہو جائے۔ اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ۳۲ صفحہ غالباً ہو گئے ہونگے حساب سے ۲۴ چاہییں۔ ریویوز اور ایک اور مضمون بھیجتا ہوں، انھیں بھی درج کر دیجیے۔ آج ایک کارڈ نوبت رائے کو لکھا ہے کہ ٹائیٹل جلد بھیجو۔ روپیہ میں نے اپنے پاس سے دیا ہے۔ صرف کے متعلق اطمینان رکھیے۔ اگر نہ ہوا تو میں خود روپیہ بھیج دونگا۔ ٹائیٹل پر صرف (بابت جون جولائی) لکھ دینا کافی ہے۔

صحت کا خیال رکھیے اور ہاں، کتابیں پہنچیں۔ ابوالکلام

اگر ممکن ہو، تو اصولِ زندگی، اور دے دیجیے تاکہ حساب دو ماہ صاف ہو جائے۔

(۲۴)

بمبئی بلاسس روڈ پوسٹ بھائی کلہ نمبر ۱۳۔ دفتر الہلال۔

برادرم

کل پرچے پہنچے۔ لیکن افسوس ہے کہ میرے لیے سخت افسوس اور رنج کا باعث ہوئے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ میں محنت اور جگر کاوی سے پرچہ ترتیب دوں۔ آپ ایسا عدیم الفرصت شخص اپنا وقت صرف کرے۔ روپیہ پر روپے دیے جائیں۔ مگر جب چھپ کر نکلے تو ہر شخص کی زبان سے سوائے نفرین کے اور کچھ سننے میں نہ آئے! یہاں جس نے دیکھا،

نہ مضامین پر توجہ کی، نہ ترتیب کی داد دی، بلکہ اوس کی ظاہری بھونڈی صورت پر نفرین کا تحفہ پیش کیا۔ میرے سامنے تمام کاپیاں اچھی لکھی ہوئی تھیں۔ میرے آنے کے بعد کیا خدا کی پھٹکار ہوگئی کہ اس قدر خراب چھپیں۔ سب قصور چھپائی اور اصلاحِ سنگ کا ہے۔

ایک رسالہ بھی اِن پندرہ رسالوں میں ایسا نہیں نکلا جس کی چھپائی سوا ایک دو صفحہ کے چھن نہ گئی ہو۔ اس قدر لغو چھپا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ افسوس ہے کہ منشی ہدایت اللہ صاحب ٹھیک ٹھیک کام نہیں کرتے۔ اب میں زیادہ لفظ اور کیا لکھوں! آپ اُن کو میرا یہ خط دکھلائیے اور خود ان سے انصاف کے طالب ہوئیے۔ کیا ہمارے کھرے روپوں کے بدلے ایسا کھوٹا کام ہونا چاہیے!

یہاں ایک پریس ہے: مطبع ناصری میرزا محمد کردی "ملک الکتاب، خان صاحب" اس کے پروپرائٹر ہیں انھوں نے مصری ٹائپ منگا کر ترمیم کے ساتھ پریس جاری کیا ہے۔ میں اُن سے گفتگو کر رہا ہوں۔ اُجرت زیادہ مانگتے ہیں۔ اس لیے ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ اگر گفتگو مناسب ہوئی تو میں چھپواؤں گا، گو مقامِ اشاعت کلکتہ ہی رہیگا۔ بات (یہ) ہے کہ آپ سے اچھی طرح صحتِ رسالہ کا انتظام نہیں ہوسکتا اور آپ اس میں مجبور بھی ہیں۔ اس رسالہ میں غلطیاں ہیں، جن سے میرے دل کو کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے اگر یہاں بمبئی میں انتظام ہوگیا، تو بہتر ہوگا۔ رجسٹر وغیرہ سب آپ (کے) پاس (رہیگا۔ پرچے چھپ کر کلکتہ، اور وہاں سے اور مقامات میں پہنچینگے۔

اور اگر دو دن کے اندر گفتگو مناسب نہ ہوئی تو مضامین وغیرہ سب آپ کے پاس بھیج دونگا۔ لیکن منشی ہدایت اللہ صاحب کو میرا یہ خط یہاں تک ضرور دکھلا کر، انصاف کے زور پر، فہمائش کرکے، اور کام پڑ جانے کی وجہ سے عاجزی بھی کر کے، سمجھائیے اور کہیے کہ آپ تھیٹر کے اشتہار جیسے چھاپتے ہیں، کاش ویسا ہی پرچہ بھی چھاپ دیں۔

مندرجہ سرنامہ مستقل پتہ نہیں ہے میں نے جو الگ کمرہ لیا ہے، اس کا نمبر ابھی نہیں قرار دیا گیا۔ چونکہ کامل طیار نہیں ہوا ہے۔ اُسی کے پاس یہ بلڈنگ ہے۔ جس کا پتہ لکھتا ہوں۔

"الہلال، یہاں سے ایک گجراتی انگریزی رسالہ نکلتا ہے۔
"لسان الصدق" کا ایک نمبر جون شمس الہدیٰ صاحب کے پاس بھیجیے۔ حافظ عبدالرحمٰن، محمد شفیع وغیرہ کے پاس تو آپ نے بھیج دیا ہوگا! بالخصوص حافظ صاحب کے پاس ٹائیٹل پر کتابوں کی قیمت لکھ کر۔ ایک پرچہ ان کے نام بھیجیے، مفت؛ مولوی حسن نظامی دہلوی، مہتمم توشہ خانہ درگاہِ حضرت نظام الدین محبوبِ الٰہی، دہلی۔ وہ بھی آپ کے پاس ہے۔ جلد روانہ فرمائیں۔ سب کی خدمت میں دعا و سلام پہنچائیں۔ آپ نے "سفینۂ طالبی" کا دوسرا حصہ نہیں بھیجا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۲۵)

لکھنؤ، ندوہ (۴ مئی ۱۹۰۶ء)   6 - 5 - 4 ۱۰

برادرِ محترم۔ مراد آباد میں ایک انجمنِ اسلامیہ ہے۔ جس کا سالانہ جلسہ تھا۔ خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے اصرار کرکے لے گئے۔ پرسوں واپس آیا۔ منشی عباسی بھی ملے۔ علی گڑھ گئے ہیں۔ تیرہ تک آجائینگے۔

آپ لکھنؤ تشریف لاتے ہیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ!

میرا ارادہ تھا، قطعی ارادہ کہ پرسوں بمبئی چلا جاؤں اور وہاں ایک ماہ رہ کر امرتسر کا رُخ کروں۔ لیکن اگر آپ تشریف لاتے ہیں، تو قیام ضروری ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ٹھہر جاتا ہوں۔ آئیے اور ضرور آئیے۔ اس سے بہتر کیا بات ہوسکتی ہے کہ تین سال کی غیبتِ کبریٰ لکھنؤ کی بدولت عشرۂ مبارک میں ختم ہوجائے۔

۹ فروری کا جواب اسی لیے نہیں لکھا گیا کہ پریشانی کے علاوہ لکھنؤ میں موجود نہیں تھا۔
ہزار روپے چھ آنے پہنچ گئے، الندوہ جاری کر دیا جائیگا۔
مسٹر علی محمود خط کیوں نہیں لکھتے؟ یقیناً میں جواب کے لائق نہیں رہا، مگر وہ خط لکھنے کے تو ضرور لائق ہیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۲۶)

آپ کے خطوط پہنچے۔ میں آپ کو کل تین کارڈ، ایک خط پنسل سے لکھ چکا ہوں۔ پہلا کارڈ ناگپور اسٹیشن سے لکھا تھا۔ خدا جانے آپ کو پہنچا بھی یا نہیں! افسوس ہے کہ آپ نے روپوں کے بھیجنے میں دیر کی اور آخر مجھے تار دینا پڑا۔ بلا اشد ضرورت کے میں بھی کبھی نہ لکھتا۔ اس نے جو کچھ یقینی نہ لکھا، اسے میں سمجھا ہوا ہوں۔ لیکن اشد اور اٹل ضرورت کی وجہ سے میں نے لکھا تھا، آپ نے دیر کی اور مجھے اس کی وجہ سے سخت دقت اور ندامت (اور) خفت ہوئی۔ خیر آپ بھی معذور ہیں۔ آپ کی ہمدردی کا مشکور ہوں۔

میں نے خط آپ کو اس لیے اتنے دنوں کے بعد لکھا کہ میں ایک ہفتہ سے بیمار تھا۔ بخار موسمی ہوگیا تھا۔ کل سے طبیعت اچھی ہے، آج آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

جون کے لیے ایک مضمون کی اور ضرورت ہوگی۔ اس لیے کہ محمد شفیع نے ابھی تک نمبر ۲ نہیں بھیجا۔ آپ کو تکلیف قطعی ہوگی۔ آپ عدیم الفرصت ہیں، لیکن مجبوری ہے۔ اس لیے اس نمبر کے لیے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا سے کوئی تاریخی یا علمی مضمون ترجمہ یا ملخص کیجیے۔ تین ورق سے کم نہ ہو۔ انسائیکلوپیڈیا کی تخصیص نہیں، کسی انگریزی عمدہ مضمون کا ترجمہ ضرور ہو۔ مجھے امید ہے کہ آپ ضرور یہ کام کیجیے گا۔

(۲۷)

میرے سچے غمگسار حضرت رنجور!

میری کل تمام دن جو کیفیت رہی ہے، وہ حدِ بیان سے باہر ہے۔ زکام اور ریزش وغیرہ کا اس قدر ہجوم تھا کہ صبح سے شام تک سوائے . . . . . اور کوئی کام نہ کر سکا۔ یا تو دونوں ہاتوں سے سر کو پیٹتا رہا، یا بےچین ہو کر لیٹ رہا۔ (؟)

شام کو اوٹھا تو آپ کا تذکرہ۔ بھائی صاحب[۱۱] سے معلوم ہوا۔ حضرت خیر کا خط بھی نظر سے گزرا، جس کا جواب اور جشنِ[۱۲] تاجپوشی کی نظم آج ارسال کر دونگا۔

آپ جشنِ تاجپوشی کی نظم نہ ارسال کریں۔ میں نے جو لکھی ہے، اوسے ارسال کیا جائیگا۔ بلکہ مناسب ہوتا، اگر آپ مولوی ابوالحسن صاحب سے وہ منگوا کر دوسری عمدہ نظم ارسال کر دیتے۔

ابنائے زمانہ کی بیمہری اور ستم پر مجھے، گو فطرتِ انسانی کے موافق کچھ نہ کچھ افسوس ہوا، پھر جب اِسی کلکتّے شاعروں کے سلوک حضرت غالب[۱۳] اور حضرت داغ[۱۴] سے یاد آگئے اور اون کی مثالیں رُوبرو ہوگئیں، تو طبیعت کو ایک گونہ تسلّی اور تشفّی ہوگئی ہے

یوسف نہ تھا عزیز بچشم برادران　　اچھّوں کی ہوگی قدر نہ اس روزگار میں[۱۵]

کیا ستم ہے کہ طرحی غزل بمقابلہ غیر طرحی کے لچر کہی جاتی ہے۔ خاک بچشمِ دشمنان۔ طرحی غزل تو ایسی لاجواب ہے کہ وہ شاید غیر طرحی بھی بعض مخصوص حاسدگیوں (؟) کے سوا اوس کے پایہ تک نہیں پہونچتی۔ کما لایخفیٰ۔

خیر اوس مشاعرہ اور طرحی اور غیر طرحی غزل کے متعلق اور خطوط کی کیفیت (بہ نسبت) اپنی رائے لکھ دیجیے گا۔

آج کل میں انجیل کی سیر کیا کرتا ہوں۔ مارک کی انجیل قریب الاختتام ہے۔ اوس کی تشبیہانہ عبارت اور استعارانہ اشارات عجیب لطف دیتے ہیں۔ اس کے بعد توریت کا مطالعہ کرونگا۔

"عشق کی وجدانی کیفیتیں" اس عنوان پر میں ایک مختصر سلسلہ قائم کرنا چاہتا ہوں جو کسی نامی میگزین میں ارسال کر دونگا۔ مگر بھیج دینے کے پہلے اس کا پہلا نمبر میں (نے) ترتیب دیا ہے۔ صاف کر کے آپ کے دیکھنے کے لیے ارسال کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرما کر پرسوں (؟) واپس کر دیجیے گا، کیا قابلِ اشاعت ہے؟

میرے درد میں کچھ طولانی لطف پیچیدگی کے ساتھ حاصل ہو رہا ہے (؟) دیکھیے، کب اس لطف کا اختتام ہو!

بھابی صاحبہ اور تمام اہلِ بیت حضرات اور حضرت منظور اور حضرت حسان اور بنیامین کی خدمت میں دعا و سلامِ شوق فرمادیں۔

آزاد دہلوی

(۲۸)

میرے شفیق بھائی۔ آپ کا دوسرا محبت نامہ پہونچا۔ آج آپ کو میرا دوسرا خط مل گیا ہوگا۔ ڈاکٹر منظور احمد صاحب اسی وقت تشریف فرما ہیں۔ اور آپ کے اس جملے سے کہ "آج اس وقت میری طبیعت نہایت چاق ہے" بہت مسرور ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را[۱۷]۔ آرے کا دردناک سین دیکھ کر ایک رقیق القلب شخص کبھی قابو میں نہیں رہ سکتا۔ پھر آپ ایسا شخص، جسے علاوہ قربت کے اختلاجِ قلب کا عارضہ بھی باعثِ تکلیف ہو، کیسے صبر کر سکتا ہے!

آپ نے میری رباعیاں مانگی ہیں۔ وہ تو کچھ عمدہ نہیں۔ خیر، تعمیلِ حکم ضروری ہے۔ وہ اور چند نو تصنیف اور رباعیات ارسالِ خدمت ہیں۔

غلام محمد حاضر الوقت تسلیم عرض کرتا ہے، اور میں آپ کی اور حضرت عم (؟) کی خدمت میں تسلیم عرض کرتا ہوں۔

ہر کہ باشد ز حالِ ما پرسان
یک بیک را سلامِ ما برسان

آپ کا خادم
ابوالسکلام الدہلوی
امرتلہ لین ۱۱ کلکتہ

کلامِ آزاد

نوتصنیف رباعیاں

کیوں طعنۂ خویش واقربا سہتے ہیں!
ہیں کس کے خیال میں، جنابِ آزاد!
ہے بات کوئی کہ آپ چُپ رہتے ہیں!
سنتے ہیں کسی کی، اور نہ کچھ کہتے ہیں

افسوس، وہ بیغمی کی کہانی نہ رہی
لے دے کے رہی تھی ایک جوانی، اے مرگ!
افسوس، وہ عیش کی جوانی نہ رہی
تو کیا آئی کہ، ہائے، وہ بھی نہ رہی

قطعہ

آزاد! کل جو سیر کو صحرا کی میں گیا
اپنی بنا کے قبر، اوسے دیکھتا تھا وہ
کہتی تھی اوس کو خلق کہ دیوانہ ہوگیا
دیکھا کہ ایک شخص وہاں بیقرار تھا
پھر دیکھ کر اوسے وہ بہت زار زار تھا
دیکھا جو میں نے، ایک ہی وہ ہوشیار تھا

چھیڑو نہ مجھے کہ ہمصفیرو!
مجھ سے نہ کہو فسانۂ قیس
مجھ مست کو مَے کی بُو بہت ہے
دیوانے کو ایک ہُو بہت ہے

کیوں ہے یہ خراب، اور کیوں ہے یہ بُرا!
ہے وعظ کی لت اوسے، ہمیں شربِ مدام
چاہ اپنی ہے اور شوق اپنا اپنا
اوس کو اوس کا ہے شوق، ہم کو اس کا
باقی پھر

(۲۹)

برادرم

رات بھائی صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے کالون صاحب سے پیشگی ماہ (سو روپیہ) منگوانے کی رائے ظاہر کی ہے۔ اول تو سو روپیہ سے نہ پریس خریدا جا سکتا ہے، اور نہ لوازمات پریس۔ پھر اوس پر آپ کی یہ رائے کہ ۲۵ روپیہ کا ایک سب ایڈیٹر ملازم رکھ لیا جائے، ایک سربستہ معمّا ہے، جسے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ علاوہ اس کے ممکن ہے کہ صاحب بجائے اس کے کہ قبول کرے، اور زیادہ بھڑک جائے۔ اور یہ اور خرابی کی بات ہو۔ کیونکہ پیشگی روپیہ منگوانے کا خیال اَور طرح اوس کے ذہن نشین ہو۔ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر کیجیے گا۔ اگر آپ کو امید قوی ہو کہ صاحب روپیہ بھیج دیگا ، اور اگر نہ بھیجیگا تو ناراض نہ ہوگا، تو بلا تکلف پیشگی روپیہ منگوا لیجیے۔ اور نہیں تو بنے ہوئے کام کا بگاڑنا . . . . . . ہے۔ اسی لیے یہ خط لکھتا ہوں کہ آپ اس مسئلے پر توجّہ کرلیں۔

روپیہ جاتے ہیں، وصول کیجیے ـــــ تعویق معاف! ہاں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو بلا تکلف پیشگی منگوالیں۔ بہت مناسب ہے مگر . . . نہ شد بلا شد کا مضمون نہ پیش آئے۔

ابوالکلام

(۳۰)

بھائی، کل "دارالاخبار" کا جلسہ ہے۔ تمھارے نام کے، اور اَور لوگوں کے نام نوٹسیں ارسال کرتا ہوں۔ ان لوگوں تک یہ نوٹسیں شام تک ضرور پہونچ جائیں، ورنہ گذشتہ جلسے کا سا حال ہو جائیگا۔ مولوی احمد حسن بھی عجیب چیز ہیں! کل جلسہ ہے، اور آج نوٹس شائع ہوتی ہے۔ بہرکیف تم اشاعت میں کوتاہی نہ کرنا۔

مولوی عبدالباری کا خط براہِ مہربانی تم خود جا کر آج بعد العصر اونھیں دو اور جلسہ میں

آنے کے لیے تاکید کرو۔ اگر بطورِ خود نہیں تو از جانبِ سکریٹری۔ اور مولوی فاطمی صاحب کو بھی اطلاع دو۔ آج دو بجے شاید میں تم سے نہ ملوں۔ چار بجے ضرور حاضر ہونگا۔
اوس خط کا جواب آج چار بجے دونگا۔

تمھارا بے تکلّف

ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی

(۳۱)

باسمہ سبحانہ تعالیٰ

محبِّ یکرنگ جناب مولیٰنا محمد یوسف صاحب دام لطفہ

سلام شوق

بمبئی سے رجسٹرڈ نمبری نوٹ سَو سَو کے پر سو (ل) آئے تھے، جو وصول کر لیے گئے۔ مگر آج جو انھیں تڑانے لگا، تو معلوم ہوا کہ بھیجنے والے جن کی تحویل میں روپیہ آئے تھے، غلطی سے اوپر دستخط نہ کیے اور اس لیے ہمارا دستخط کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب اوسے کوئی صرّاف نہیں لیتا۔ ناچار اونھیں پھر واپس کر دیا جائیگا۔ خیال تھا کہ آج روپیہ آپ کی خدمتِ عالی میں بھیج دیے جائینگے۔ مگر یہ بیچ میں آکر خرابی ہو گئی۔ میرا آج ایک وی پی ۱۲ بارہ روپیہ کا بھی آنے والا ہے۔ پریشان ہوں کہ اوسے کیونکر وصول کرونگا، ایسی حالت میں انھیں روپیوں پر بھروسہ تھا۔ اور اون کتابوں کی بھی ضرورت ہے۔ کیا آپ اس وقت اس پریشانی کو دور کر سکتے ہیں، کچھ دنوں کے لیے؟ حاملِ رقعہ معتبر شخص ہے۔ میں کچھ دیر بعد حاضر بھی ہونگا، حسب الوعدہ۔

خادم احباب

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۴۲)

باسمہ سبحانہٗ

میرے مخدوم مولینا رنجور دام لطفہم!

آپ کے گئے پیچھے جب میں نے کتابوں کا ڈھیر (؟) تلاش کیا، تو ایک کتاب انگریزی نکلی جس کے متعلق خیال کیا گیا ہے کہ وہ سیون (سیلونگ) بنک کی رسید ہے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑا کہ ناظر یا منظور احمد نے مجھ سے روپیہ قرض لیے تھے، اور روپیہ کے بدلے وہ پاس بک مجھے دیا تھا کہ عندالضرورت تم اپنا مقروض روپیہ بالاجازت ڈاکخانہ سے وصول کر لینا۔ چنانچہ وقتِ ضرورت اوھوں (ں) نے فارم پر دستخط کر کے یہاں بھیج دیا اور میں نے اوسے وصول کر لیا۔ خیر، رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت۔ انشاء اللہ آج دے دیا جائیگا۔ الحمدللہ۔

کہیے، مزاجِ اقدس! شب بخیر! میری جانب سے بعد از دعا حضرت حسّان اور حضرت بسیامین کو کہہ دیجیے کہ ذرا مجھے اس پریشانی سے (یعنی ڈاکخانہ کی پریشانی سے) نجات مل جائے، پھر میں کلکتہ کی خوب سیر کراؤنگا، بالخصوص (؟) چڑیا خانے کی۔

جناب سلیم رات کو آئے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ روپیہ قرض لینا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی بادیانت اور پابندِ وعدہ ہیں۔ مجھ سے اکثر معاملہ رہا ہیں اونھیں دے دیتا۔ مگر ڈاکخانے کے معاملے میں جو پچاس روپیہ دینے پڑے اس لیے کچھ معاملہ پیچیدہ ہوگیا۔ اس لیے میں آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ اگر موجود ہوں اور تکلیف نہ ہو، تو مبلغ دس۱۰ روپیہ سلیم صاحب کو میری ضمانت سے قرض دے دیجیے، جو ایک ہفتہ میں ادا کرینگے۔ اس کا میں ضامن ہوں اور ایک بار نہیں بلکہ سو بار الضمان علیّ۔ ان کو بھیجتا ہوں۔ آپ مجھے دیں اور مجھ سے وصول کریں۔ سلیم سے آپ کو کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت وہ بہت پریشان ہیں۔ آپ کے ممنون ہونگے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۳۴)

بھائی رنجور! میں یہ خط تمھیں ایسے موقعہ میں لکھ رہا ہوں کہ تم اور تمھارے اہل بیت دریائے غم میں غوطے کھا رہے ہیں۔ اور کنارے کی تلاش میں دریا کی خونی موجوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ تمھارے میرے کچھ تعلقات محبانہ ایسے قوی ہو گئے ہیں کہ اس بیان کی کوئی ضرورت نہیں کہ تمھارے اس غم اور فکر نے مجھے بہت غمگین کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا فلسفیانہ مذاق مجھے اکثر اس امر پر آمادہ کرتا ہے کہ میں اپنی طبیعت ایسی بنالوں جسے کسی قسم کے رنج و غم کا احساس نہ ہو۔ اور ہزار کوہِ غم سے کمر خمیدہ ہو جائے، مگر دامنِ عمل ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر طبیعت ایسی ہو جائے اور یہ خیال ہی نہ ہو بلکہ عملاً، تو پھر انسان دنیا میں نہایت خوشی اور راحت سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اوس کے لیے تمام غم خوشی ہو جائیں اور تمام ناکامیابیاں کامیابی کے خوشنما پہلو رکھیں۔ اگر کوئی مر جائے تو اوسے آنسو بہانے کی تکلیف نہ ہو اور اگر کوئی چھوٹ جائے، تو ہجر کی تکلیفیں نہ اوٹھانی پڑیں۔ مگر ہائے افسوس کہ انسان میں یہ قدرت سرے سے ہے ہی نہیں کہ وہ اپنی طبیعت ایسی بنا لے اور اپنا دل موم سے پتھر کر لے۔ انسان کے پہلو میں قدرت نے ایک ایسی چیز رکھ دی ہے کہ وہ درد سے غمگین اور مسرت سے خوش ہوتی ہے اور اوسی کا اثر طبیعتِ انسانی پر ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی بنا ہی اس حسِ انسانی پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ ہو نہیں سکتا کہ انسان خود چاہ کر اپنی طبیعت سے یہ حس کھو دے۔ بس میرا بھی یہی حال ہے۔ آج کل میرا وقتِ عزیز زیادہ اسی کوشش میں صرف ہوتا ہے کہ میں اپنی طبیعت ایسی بنالوں جسے کسی قسم کی نتیجہ خیز حس نہ ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال مجھے اپنی کوششوں سے باز بھی رکھتا ہے کہ یہ ایک انہونی بات ہے اور اس کے لیے کوشش فضول اور بے فائدہ ہے ؎

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں!
روئینگے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں رولائے کیوں![18]

مگر دیکھو، تم کو ہم کو خدا ہی نے رولا دیا۔ قدرت ہی نے سوگوارِ غم (؟ بنا) دیا، اب کیسی شکایت، اور کہاں کا شکوہ! الصبر! الصبر! الان الصبر مفتاح الفرح!

تو خیر، میں تمھیں بحیثیتِ ناصح نہیں، بلکہ بحیثیتِ دوست نصیحت کرتا ہوں کہ اب تم بھی اس امر کی کوشش کرو کہ یہ "احساسِ غم" طبیعت سے جاتا رہے گو اس کا نتیجہ ناکامی ہے، مگر یہ ضروری ہے (جیسا کہ مجھے تجربہ ہو چکا ہے) کہ اس کوشش سے غم کے موقعہ میں عمل کرنے کا خیال آجاتا ہے اور گو عمل نہ کیا جائے مگر خیال سے ایک ایسی تسکین اور ایک ایسا صبر طبیعت میں پیدا ہو جاتا ہے جو شاید تقدیر کے مسئلے (؟) سے بھی ایک پابندِ مذہب طبیعت میں نہ پیدا ہوتا ہوگا۔

بہر کیف، میں تمھارے غم میں شریک ہوں۔ مگر ساتھ ہی یہ نصیحت بھی کرنا جاتا ہوں کہ عدمِ احساس کی کوشش کرو۔ فلسفۂ مادّی (؟)... یہی ہے، اگرچہ فلسفۂ اخلاق اس کے مخالف ہو۔ اچھا! اب رخصت، پھر پرسوں (؟) خط لکھونگا۔

تمھارا مخلص

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۳۴)

باسمہ سبحانہ

وقت صبح ۷ بجے   تاریخ یاد نہیں

این دل کہ دارم در برم، وقفِ ہوائے یادِ تست

دانم کہ از جان برکشم، حرفِ مبارک بادِ تست

میرے سچّے دوست اور شفیق بھائی، حضرت رنجور!

میں آپ سے رخصت ہو کر مع الخیر کلکتہ پہونچا۔ اور وہاں سے دس بجے تک مکان۔ اب میں آپ کے اوس خط کا منتظر ہوں، جس میں لکھا ہو کہ "میں آرہ میں مع الخیر پہونچا اور یہاں پہونچتے

ہی میری حالت سنبھل گئی، اب میں بالکل اچھا ہوں۔" مجھے امید ہے کہ ایسا خوش آیند خط کل تک مجھ مشتاق کو پہنچ جائیگا۔

آپ نے راہ میں چند اس قسم کے محبانہ الفاظ فرمائے جس طرح کہ آپ اپنے بے مثل اخلاق سے ہمیشہ فرماتے رہے ہیں، مگر اس وقت میں باادب ملتمس ہوں کہ للہ مجھے آپ "محسن" نہ قرار دیا کریں، اس حالت میں کہ میں ایسے موقعہ کا خود متلاشی ہوں کہ مجھ کو اس جملے کی آپ سے نسبت کرنے کا موقعہ ملے۔ میں نے ہرگز کوئی احسان نہیں کیا اور نہ میں کسی پر احسان کرسکتا ہوں۔ ہاں، آپ نے مجھے بہت ممنون کیا۔ ایک نہیں بچاسوں احسان کیے، میں سرتاپا آپ کے احسانوں کا ممنون ہوں۔

آرہ اس وقت ایک ماتمکدہ ہو رہا ہوگا۔ اور کسی جوانمرگ کے غم میں سب سیاہ پوش ہونگے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ آپ وہاں جائیں اور غم و افسوس میں حصّہ نہ لیں۔ مگر چونکہ آپ کی طبیعت علیل ہے اور نہایت ضُعف ہے، اس لیے آپ کو کسی قدر ضبط سے کام لینا چاہیے۔ طبیعت کو سنبھالنا چاہیے۔ آنکھیں تر ہوگئیں یا اس سے زیادہ یہ کہ رومال تر ہوگیا۔ مگر زیادہ افسوس و غم علاوہ اس کے کہ آپ کی صحت کے لیے نامناسب ہے، بالخصوص دماغی حالت کے لیے بہت ہی مُضر ہے۔

اچھا، اب رخصت! کل انشاء اللہ عریضہ حاضرِ خدمت ہوگا۔

آپ کا خادم

ابوالکلام الدہلوی

(۳۵)

باسمہ سبحانہ

برادرِ شفیق و غمگسار، حضرتِ رنجور۔

الحمدللہ، میں اب پہلے سے اچھا ہوں۔ بخار کم ہو چلا ہے۔ اور طبیعت کی بے چینی جو بخار کے

سبب سے تھی، بند ہوگئی ہے۔ مگر ساتھ ہی ہمشیرہ صاحبہ کی علالت نے طبیعت کو سخت مشوش کر دیا ہے۔ اون کی یہ حالت ہے کہ ایک لقمہ منھ میں جاتا ہے اور استفراغ سے پھر نکل آتا ہے۔ طبیعت ان کی بےچین اور ہر وقت مضطرب رہتی ہے۔ اس لیے اب اگر میری طبیعت کو انتشار ہے، تو اپنی علالت کا نہیں، بلکہ اون کی ناگوار حالت کا۔

خیر، آپ اور بھابی صاحبہ بالخصوص ہمشیرہ صاحبہ کے لیے اوقاتِ مخصوصہ میں دعائے صحت کریں۔

تمباکو کی گولیاں تاہنوز نہیں آئیں۔ تعجب ہے کہ باوجودے کہ منظور میاں (دام لطفہ) نے کارڈ بھی لکھا، طلب مزید بھی کی گئی، مگر ہیچ جوابے نہ برخاست۔ غالباً آج آجائینگی۔ اُمید قوی ہے۔ تذکرہ کی تاریخیں تو چھپنے کے لیے چلی گئیں ہونگی۔ اور کیا عرض کروں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

بھابی صاحبہ اور دیگر بزرگوں کی خدمت میں آداب و تسلیم فرما دیجیے اور برخوردار حسّان اور بنیامین طول عمرہما کو دعا۔

(۳۶)

باسمہ تعالیٰ

اخی الاکرم

آج چار بجے ایک ضرورت سے نیومن کمپنی میں جانا چاہتا تھا۔ یہاں سے ٹریم میں سوار تھا۔ لال بازار جنکشن میں اوتر کر دوسری گاڑی کے انتظار میں کھڑا رہا۔ گاڑی جو آئی تو عجیب طور سے! برسات کی وجہ سے دونوں (ل) طرف پردہ پڑا ہوا۔ میں اس تشویش میں تھا کہ کیونکر سوار ہوں کہ وہ کسی بگڑے ہوئے معشوق کی طرح آہستہ خرامی کے ساتھ روانہ ہوئی میں اوس کے پیچھے کسی ناکام عاشق کی طرح دوڑا۔ دامنِ یار تک تو پہونچا، مگر اب کامیاب ہوں تو کیسے!

مفتح الابواب! امدونی! جیسے ہی جلدی میں ہاتھ رکھ کر سوار ہوا، تو چونکہ دوسرا ہاتھ پردہ کے اوٹھانے میں مصروف تھا، قبضہ ٹھیک نہ ہوسکا، اور میری مضبوط اقامت میں کچھ تزلزل سا آگیا۔ گرنے کو تھا کہ میں نے دہنے پانو پر زور کیا اور وہ کج ہوکر گرتے گرتے مڑ گیا۔ ٹریم پر سوار تو ہوگیا، مگر گھٹنے میں ضربِ شدید آگئی۔ اسی وقت وہاں سے اوتر کر بڑی مشکلوں سے دوسری ٹریم پر سوار ہوا اور سوار ہو کر لال بازار آیا۔ یہاں آکر دوسری گاڑی پر سوار ہونا مشکلات (؟) میں تھا۔ گاڑی تلاش کی، تو کوئی نہیں ملی، اور تلاش کرتا تو کون! ٹریم پر سوار ہوا اور مکان پر آکر لیٹ گیا۔ واقعی میں قصوروار ہوں۔ مجھے اپنی خطا اور اپنے قصور پر یقین ہے۔ مجھے بایں ہمہ حاضرِ خدمت ہونا تھا، مگر وائے غفلت! وائے خواب پریشان! تیرا بھلا (؟) ہو کہ تو نے آزادِ ناشاد کو اپنے مخدوم، اپنے مکرّم کی خدمت میں آنے سے باز رکھا۔ اس وقت جناب بھائی صاحب (؟) تشریف فرما ہیں۔ اون سے باتوں میں اپنا درد بھلانا چاہتا ہوں مگر وہ چوٹ (پانو) کی چوٹ ہے (؟) دل کی چوٹ نہیں! پاؤں کی چوٹ ذرا بھی سہارا لینے نہیں دیتی۔ تکلیف ۔ ۔ ۔ ۔ پہر رہتا ہوں۔ ایں ہمہ عنایتِ بے غایتِ او تعالیٰ و تقدس است۔

مجھے ہمیشہ سے اوس قسم کے حادثوں سے آزردگی رہی ہے، جو چلنے پھرنے کے مانع ہوتے ہیں، گو وہ خفیف ہی کیوں نہ ہوں۔ اب دل میں سمجھ رہا ہوں اگر اوس وقت ذرا صبر کرتا اور دوسری گاڑی پر، جو سامنے آرہی تھی اور کرایہ دار کچھ بھی اوس پر نہ تھا، سوار ہوتا تو میں اس تکلیف سے، جو کئی دن تک مجھے چلنے پھرنے سے مانع رہیگی، محفوظ رہتا۔ مگر کردہ خود را چارہ نیست! اور تقدیر کے کام میں کوئی تدبیر نہیں حارج ہوسکتی۔

پچھلے دنوں سے متواتر جسمانی اور روحانی، صوری اور معنوی تکالیف میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ خدا جانے یہ کیا معاملہ ہے! بائے عشّاق کی تکالیف کا اب یقین ہوتا جاتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے دنوں، مجھ سے ایک ایسا خوشگوار کام سمجھ کر جان بوجھ کر نہیں بے اختیاری

(میں) صادر ہوا ہے جس کے ضمیمہ میں تکالیف جنّہ ہمیشہ سے رہتا آیا ہے؟ مگر افسوس کہ اب جسمانی تکالیف بھی لاحق ہو رہی ہیں جو اوس گناہ کے منافی ہیں۔ بہر کیف میرا یہ حال ہے، جو عرض کر دیا۔

آپ کا خادم

ابوالکلام آزاد دہلوی

یہاں آکر میں نے کہا کہ میں زینہ پر گر گیا تھا۔ تاکہ یہاں مجھ پر لے دے نہ ہو۔

(۳۷)

باسمہٖ سبحانہٗ

میرے مخدوم! سلامت

الحمدللہ کہ اب رات سے کچھ درد میں تخفیف ہے، اور اُمید کی جاتی ہے کہ ایک بار اور مالش کرنے سے درد بالکل جاتا رہیگا۔ مجھے یہ معلوم کر کے سخت افسوس ہوا کہ آپ کے انگوٹھے کے زخم نے یہاں تک طوالت کی کہ آپ اوسے زخمِ جگر سے تشبیہہ دینے لگے۔ الٰہی بحق حبیبک ونبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلّم جناب رنجور را از شفاخانۂ غیب شفاے کامل و صحتِ عاجل فرما!

واقعی، میں کمبخت نالائق ہوں کہ باوجودے کہ جناب بھابی صاحبہ اس تکلیف میں ہیں، ملازم کا ابھی تک انتظام نہ کر سکا۔ یقیناً آج بندوبست کر کے اور اوسے بلوا کر شام تک بھجوا دونگا۔ کمبخت نے وعدہ بھی کیا تھا مگر کیا جانے، ابھی تک اوس نے کیوں منھ نہ دکھلایا۔ شاید کچھ رونمائی کی ضرورت ہے! خیر اب دیکھ لیا جائیگا۔ (قصور وار آزاد)

"چھوکری" اور "کمسنی" پھر "آپ کی"، اور اوس پر طرّہ ایں کہ "آپ کی رحمت جیسی کمسن ہو" کیا سب باتیں، ایک وسیع مطلب نہیں رکھتیں؟ گستاخی معاف! ایں ہم طریقِ گفتگو است۔

بعالی خدمت جناب بھابی صاحبہ و دیگر بزرگ (و) خورد اہلِ بیت آداب و تسلیم از جانب

آزاد وہمشیرہ اش قبول فرمایند۔

آپ کا خادم
آزاد دہلوی

(۳۸)

بھائی رنجور
میں آج سات بجے سے آٹھ تک رات کو آؤنگا۔ اب میرا انتظار نہ کریں۔ مجھے اِس وقت ناول "گورا" کی سخت ضرورت ہے، حاملِ رقعہ کو دے دیجیے۔ کل واپس کر دونگا ضرور بالضرور!
اگر میرا کوئی خط آیا ہو، تو وہ آپ حاملِ رقعہ کو دے سکتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۳۹)

باسمہ سبحانہ
واقعی میں بہت نالائق آدمی ہوں۔ تم سے کتنے وعدے کرچکا، مگر ایک خط بھی نہیں بھیجا۔
بیشک، یہ میرا قصور ہے!
بیشک، یہ میری غلطی ہے! بیشک، میں تقصیروار ہوں! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سب کچھ صحیح ہے۔ مگر ساتھ ہی کچھ باتیں اور بھی ہیں۔ اونھیں بھی سُن لو!
(۱) میری کچھ دنوں سے عجیب حالت ہے۔ لکھنا بالکل بھول گیا ہوں۔ اور سوائے پڑھنے کے اور کوئی عملی شغل نہیں کرسکتا۔ اکثر لوگوں کے ضروری خطوط مدّت سے پڑے ہوئے ہیں، مگر میں نے ابھی تک جواب نہیں لکھا۔ مولوی رشید احمد سالم، مولوی عبدالرزّاق، قاضی حمیدالدین وغیرہ اشخاص کو جن کو خط لکھنے کی سوائے قلبی ضرورتوں کے علاوہ مالی

ضرورت بھی لاحق ہورہی ہے، میں نہیں لکھ سکا اور اسی سلسلہ میں ایک تمھارا ابھی عنایت نامہ ہے، جس کا جواب میں تاہنوز نہ لکھ سکا۔ تمھارا خط لکھنے رکا، کئی بار ارادہ کیا۔ دو چار سطریں لکھیں اور پھر مٹا دیں، حالانکہ میں بسیط مضامین بھی اس طرح نہیں لکھتا۔ قلم اوٹھایا اور لکھتے گئے۔ کل میں نے صبح کو خط لکھا تھا۔ مگر تم سے وعدہ کر کے شام کو جب تلاش کرنے لگا، تو خط ہی نہیں ملا۔ اور اب یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔

(۲) میں یہاں اپنا وہ دوامی پروگرام لکھتا ہوں جو ہمیشہ میری میز کے سامنے آویزاں رہتا ہے۔ اور جس پر آج سے تقریباً ایک ماہ پیشتر میں کامل طور سے عمل کرتا تھا۔ اوس سے آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ مجھے خط لکھنے کا وقت کہاں تک ملتا ہے:

۵ــ ۶ نماز وغیرہ

۶ــ ۸ سبق

۸ــ ۸.(ساڑھے آٹھ) ناشتہ

۸.ــ ۹.(ساڑھے نو) سبق دیگر

۹.ــ ۱۱ الہیت نویسی

۱۱ــ ۱۲ خوردن

۱۲ــ ۲ دیگر مضامین ورسالہ دیگر (؟)

۲ــ ۴ ملاقات وغیرہ

۴ــ ۵ خط نوشتن

۵ــ ۷.(ساڑھے سات) تفریح

ایک گھنٹہ اس میں خط لکھنے کا وقت ہے جس میں زیادہ تر ضروری خطوط لکھا کرتا ہوں۔ میرے اس پروگرام اور اس تمہید کے لکھنے سے یہ غرض نہیں ہے کہ میں اب خدانخواستہ تمھیں خط نہ لکھونگا۔ حاشا! اگر یہ خیال ہو۔ بلکہ یہ التماس ہے کہ اگر خط لکھنے میں غیر معمولی توقف

ہو جائے، تو تم معذور سمجھ کر رنج نہ ہو۔

(۴۰)

میں آج ٹھیک ۱۱۔ د ساڑھے گیارہ بجے آفس میں ملونگا۔ رات کا لکھا ہوا ہے۔

بھائی رنجور! میں مغرب کے بعد بھی نہیں آیا تم نے بہت انتظار کیا ہوگا۔ مگر کیوں نہیں آیا، اس کی وجہ بھی سُن لو!

"اسلام اور محرّم" نے شیعوں میں ایک سخت جوش پیدا کر دیا ہے۔[19] الحق مُر ضروری امر ہے اور اسی کا یہ سب نتیجہ ہے۔ اگرچہ سارے مضمون میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس میں شخصیت یا ذاتیت کا مضمون ہو، لیکن صاف صاف اور سیچے لفظوں نے ایک جاہلانہ جوش پیدا کر دیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فوجداری ہتکِ مذہب کی کرینگے۔ کوئی کہتا ہے کہ مُعَظّم السّلطان کے ذریعہ سے کوشش کرینگے، مگر یہ ایران نہیں ہے، بلکہ انڈیا ہے، جس پر برٹش پھریرا اُوڑ رہا ہے۔ جب تک قانونی گرفت نہ ہو، کچھ نہیں ہوسکتا۔ سلف کی کتابیں اس سے سخت لفظوں سے بھری پڑی ہیں۔ مگر ان پر کوئی اعتراض اس لیے نہیں کرتا کہ مذہبی پیرایہ میں ہے، اور اس لیے قابلِ تردید ہے، نہ کہ قابلِ غضب وغصہ۔ بعض حضرات اس امر پر تُلے ہیں کہ ذاتیات سے پیش (؟) آئیں۔ مجھے اس امر کا یقین ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، حق کہا ہے اور صرف مذہبِ اسلام کی تائید اور بالخصوص مخالفینِ اسلام کے اعتراض کے دفعیہ کے لیے۔ اور جب مجھے میرا کانشنس کہہ رہا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے، محض احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے، تو مجھے کچھ ڈر نہ ہونا چاہیے۔ گو کچھ بھی کیوں نہ ہو، مجھے دنیا کے مشہور ریفارمران کی لائف پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

مگر افسوس ہے اور بارے سخت افسوس ہے، اور ایسا افسوس ہے کہ میں اوسے ضبط نہیں کرسکتا کہ میں اپنے ساتھ ایک خاندان بھی لیے ہوئے ہوں۔ جو اس قسم کی اصلاح کو غیر ضروری، بلکہ ناجائز مصلحت اور تقیہ کو حق سمجھتے ہیں۔

اس لیے آج شام سے جب کہ چند جاہل عورتوں نے آکر کچھ کہا ہے، گھر میں ایک عجیب جوش پیدا
کیا کر دیا اور) ملامت کی بوچھار، خودکشی کی سی ناجائز اور تکلیف دِہ چیز کا لطف پیدا کر دیا ہے۔
اگر میں ان سے کہوں کہ جس بات کو میرا کانشنس اور ساتھ ہی مذہبِ اسلام ناجائز کہتا ہے، اوسے
زبان سے کہنے میں نہیں رہ سکتا۔ میرا ضمیر مجھے مجبور کر سکتا ہے (؟ کرتا ہے) تو وہ مصلحت مصلحت
کی آواز لگاتے ہیں۔

میرے دلسوز بھائی! میں مصلحت کو تقیہ سمجھتا ہوں اور اس لیے میں کر نہیں سکتا۔ میں اپنے خاندان
سے مخالفت کرنے پر، باوجود بہت ضبط کے، اپنے کانشنس کے ہاتھوں مجبور ہوں، تو اوروں کے
آگے کیوں نہ کہوں! بھائی، ایسی مصلحت مجھ سے قیامت تک نہ ہوگی، گو دار و رسن کا ہی مضمون
کیوں نہ ہو!

تمہارے خاندان کی حالت میرے پیشِ نظر ہے اور ثابت قدمی کی بہت سی مثالیں اور حق گوئی
کی بہت سی نظیریں دماغ میں موجود ہیں، اور اس لیے کبھی مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ بھائی ان
لفظوں کو میری باتیں ہی باتیں نہیں سمجھیے گا۔ واللہ یہ میں نہیں کہتا، بلکہ مرا وہ سچا کانشنس کہ
رہا ہے، جو مذہبِ اسلام اور توحید کی سچی محبت سے پیدا ہو گیا ہے۔ میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ
اس وقت میری کیا حالت ہے! طبیعت اومڈی آتی ہے اور بے اختیار رو رہا ہوں۔ بار بار افسوس
آتا ہے کہ اگر آج میں آزاد ہوتا، اور میری حالتوں (؟ حالت) اور عقائد کا (؟ پر) کوئی روک نہ
ہوتا (؟ ہوتی) میری مصیبت پر کوئی غم کرنے والا نہ ہوتا، تو مجھے کچھ افسوس نہ ہوتا، اور میں اپنے
عقائد کو صاف طور سے للکار کر کہہ سکتا۔ اگر مجھ پر مصیبت آتی، اسلام کی حمایت کی بدولت، تو میں
اوسے بخوشی قبول کرتا اور ذرہ بھر اس میں بیعزتی نہیں سمجھتا۔ مگر اب تو میرے افعال کا
سلسلہ اوروں تک پہونچ گیا، اور وہ اوسے باعثِ ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ سلف کے کارنامے بھول
گئے ہیں اور اس سے مجھ پر جانکنی کی حالت طاری ہو رہی ہے کہ میری وجہ سے ان کی۔ ان کے خیال
کے موافق، بیعزتی ہوگی۔ حالانکہ میں تو اسے باعثِ فخر سمجھتا ہوں۔ اور قسم خدا کی، اسے کبھی

باعثِ عار نہیں سمجھتا۔ ہاں اگر کچھ کہتا ہوں، تو اوس اسلام اور اوس خیالِ توحید کو جس کی محبت میں یہاں تک دیوانہ ہو گیا ہوں ؎

بجرمِ عشقِ توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست [۲۰]

کیا غضب کی بات ہے کہ اس قسم کی ہزاروں کتابیں لکھی جائیں، شیعہ مصحفِ عثمانی کو کہیں کہ اس قرآن کو جلا دو، اور ہمارے آبا و اجداد پر تبرّا بھیجیں۔ مگر ہم اگر کہیں کہ اس تماثیل پرستی کو ترک کرو تو ہم سے لڑنے اور فوجداری کے لیے آمادہ ہو جائیں! فوجداری وغیرہ تو غالباً نہ ہوگی۔ اب رہا ان کے ذاتیات کے حملے! تو میں ہرگز ہراساں نہیں ہوں۔ اوس خدا پر بھروسہ ہے جس کی توحید کے لیے میں نے لوگوں کی ملامت کا خیال نہیں کیا۔ مجھے بھائی صاحب وغیرہ ایسی کوشش کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، جس سے آگ بجھ جائے۔ آپ ابھی مؤید الاسلام سے جا کر ملیں اور فرمائیں کہ مناسب تو یہ ہے کہ اوس کی تردید لکھی جائے اور اوس سے سخت لفظ لکھ کر شائع کیے جائیں، بلکہ احسن الاخبار چھاپ دے گا۔ . . . . . سے بھی بڑا آدمی ہے؟ قاضی عبداللطیف آج بلا گئے ہیں ضرور جائیے ضرور۔ باقی عند الملاقات۔ (تم جانتے ہو)

(بغیر دستخط)

(۴۱)

اس وقت پونے آٹھ ہیں۔ ۸.۳۰ (ساڑھے آٹھ) تک میں پہونچونگا۔

بھائی رنجور! رات کو دس بجے جناب محمد کاظم تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے کہ آج جلسہ میں شیخ گیلانی علالت سے وعظ نہ کر سکے، مگر جعفر صاحب نے اچھی طرح اتفاق اور اصلاح کے فوائد بیان فرمائے۔ اور یہ کہا کہ تعزیہ وغیرہ کرنا محض لغویات ہے۔ اور اوس میں کوئی برائی نہیں، اگر شیعی عَلم سے متعلق کچھ کہا ہے۔ ہاں، اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ آیندہ سے ایسے مضامین نہ شائع ہوں۔ غرض (اوبھوں) نے آگ پر پانی ڈالنے کی اچھی طرح کوشش کی تھی۔ غرض خواص کا

خیال بدل گیا ہے، تمام لوگوں میں نااتفاقی ہوگئی ہے اب صرف ایک شخص ہے، جو مقدمہ چاہتا ہے۔ اور اوس کی بھی دوا موجود ہے، جو عندالملاقات کہونگا۔ کاظم صاحب رات کو بہت اطمینان بخش باتیں کر چکے ہیں۔ او نھوں) نے بہت سی نظیریں اس قسم کی دیں کہ علمائے عراق اور مفتی محمد حسن وغیرہ نے اس قسم کی باتوں کی سخت مخالفت کی تھی، اور چاہا تھا کہ عَلم وغیرہ موقوف ہوجائے۔ اگر جزوِ ایمان ہوتا، تو ضرور ہے کہ وہ لوگ کہ مستند شیعہ تھے، ایسا امر کیوں کرتے؟

مرزا بابر صاحب بھی بہت سنبھل گئے ہیں۔ آپ آٹھ بجے جاکر اون سے ملیں۔ اگر کوئی شخص موجود ہو، تو گفتگو نہ کریں۔ اِدھر اُدھر کی بات کر کے چلے جائیں۔ ورنہ اون سے ملیں اور اصلاح کی کوشش کریں۔ یہ نہ کہیں کہ مولینا کا فرستادہ ہوں۔ بلکہ بطور خود گفتگو کریں) متانت اور بردباری کے ساتھ۔ اور یہ بھی کہیے گا کہ میرے آنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ ابھی سنّیوں میں خبر کم پھیلی ہے اور عنقریب پھیلنے والی ہے۔ اس لیے بخوفِ فسادِ عظیم آپ کا ہمارا اور بالخصوص آپ کا بحیثیت لیڈر ہونے کے فرض ہے کہ اصلاح کیجیے۔ اور وہاں سے واپس آکر مجھے ملیے۔ ۹.۰ (ساڑھے نو) بجے بابر صاحب کے یہاں جلسہ ہے۔ آپ جلسہ سے پہلے جائیں۔

ایک انگریزی خط بھیجتا ہوں اس کا سرسری ترجمہ لکھ دیجیے گا، اسی وقت۔ اور بابر صاحب کے یہاں ساڑھے آٹھ تک چلے جائیے۔ ترجمہ جلد دیجیے۔

ابوالکلام

(۴۲)

برادرم

روپیہ کل میں نے اس لیے نہ بھیجے کہ کوئی جانے والا نہ تھا۔ رحمت (؟) بیمار، بتول مکان میں، امینہ گھر کے کاموں میں، کیسے بھیجوں! ترکی ٹوپی آج قالب پر چڑھا دی، چڑھ جائے گی تو بھیج دونگا جیسا میں نے وعدہ کیا تھا۔ ترجمہ خلیل صاحب نے دیکھ لیا۔

آج قاضی محمد سعید صاحب سے آپ مل سکتے ہیں یا نہیں؟ شیعوں میں اخبار کے بند ہونے کی خبریں گشت کھانے لگی ہیں، جن سے بہت بُرے نتائج نکل سکتے ہیں۔ اس لیے اگر اب اخبار نہ نکلا تو ان کو بہت زور مل جائیگا۔ آج آپ قاضی صاحب سے بعد العصر ملیں۔ اگر کچھ امید دلائیں تو کل مولوی صاحب کو لے جائیں، ورنہ سکوت کریں۔ کیا آپ یہ تکلیف گوارا کیجیگا؟

آج آپ سے چار بجے ملونگا اور اوس وقت قاضی صاحب کے پاس جانے کا مضمون فیصلہ پائیگا۔

کل تو آپ ۲۔ ڈھائی بجے آ کے چلے گئے۔ جب کہ میں دارالاخبار گیا ہوا تھا۔ آج چار بجے ملاقات کیجیے۔

آپ کا

ابو الکلام

(۴۳)

کلکتہ 3۔ 6۔ 5 (۸ جون ۱۹۰۳ء)

برادرم

آج آپ کو گئے کئی روز ہوگئے، مگر آپ کا ایک خط بھی نہیں پہنچا! اور نہ "اسلام و محرّم" کا ترجمہ ملا۔ آج انتظار کے بعد یہ خط لکھتا ہوں۔ جواب جلد تحریر فرمائیے۔

میں مع متعلقین بخیریت ہوں۔ شیعوں کی جانب (سے) بدستورِ سابق خموشی ہے۔ کل میرزا ہاشم صاحب دارالاخبار میں تشریف لائے تھے۔ اون کے بیان کے موافق معاملہ بہت سرد پڑ چکا ہے، صرف حاجی کاظم کی کارروائی جاری ہے۔ بہرکیف، کوئی قابلِ ذکر بات سننے میں نہیں آئی۔

مولوی عبد الباری صاحب پٹنہ سے واپس آئے ہیں۔ پرسوں، میں نے ان سے ملاقات کی۔ احسن الاخبار کا مضمون (اونھوں) نے استفساری طریقہ پر خود چھیڑا اور نہایت عمدہ ہمدردی

ظاہر کی۔ دوسری ملاقات میں میرا ارادہ ہے کہ اون سے احسن الاخبار کا تذکرہ خاص معاملہ میں چھیڑوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

مولوی احمد حسن ابھی تک کلکتہ میں ہیں۔ دار جیلنگ سے روپیہ اور جواب ابھی تک نہیں آیا۔ فرمائیں، مزاجِ شریف؟ آپ بخیریت ہیں، آپ کے متعلقین بخیریت ہیں۔ یہ خبر سننا چاہتا ہوں ہمشیرہ صاحبہ بخیریت اور مستفسرِ احوال ہیں۔ آیندہ اتوار کو جلسہ ہے۔ السّلام علیکم

آپ کا

ابوالکلام۔ ۲ شنبہ

(۴۴)

شفیق من، محبِّ یکرنگ، جناب مولینا رنجور صاحب!

آپ سے ٹریم میں رخصت ہوا اور مکان میں پہونچا تو وی پی لیے ہوئے ڈاکیا موجود تھا۔ آپ کو تکلیف دی اور ایک اور ضرورت سے نیومین کمپنی چلا گیا۔ لال بازار میں ٹریم ملی نہیں۔ انتظار کے بعد مکان پاؤں سے چل کر آیا۔ گرمی کی شدّت اور حرکتِ طبعی کی حرارت نے یہاں تک پریشان کیا کہ مکان تک پہنچ نہ سکا۔ خانۂ خدا کی راہ لی اور مسجد میں آکے بیٹھا۔ مکان پہونچا تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ دردِ سر، خفیف بخار، انجرات کا زور گھیرے ہوئے تھے۔ نیچے اوترا بھی بیٹھا ہوں۔ ہوا چل رہی ہے۔ طبیعت ذرا سنبھل گئی ہے۔ نمازِ مغرب تا ہنوز القط۔ اس لیے گزارش ہے کہ اگر نہیں آسکا، تو خلافِ وعدگی پر محمول نہ فرمایئے گا۔ صبح کو آٹھ بجے بحسابِ انگریزی ٹائم حاضر ہونگا۔

ساقی نامہ کی ابتدا کر دی ہے۔ دو شعر لکھ چکا ہوں۔

ساقیِ ماہ لقا نیک شیم ! یک نگہ برمنِ محزوں ز کرم
اے فدائے تو شوم، بندہ نواز! جام دربردہ زمے راز و نیاز

کیا یہ بحر مناسب ہے؟ آپ نے اپنے معزز ز(؟) خط میں جس چیز کو باعثِ ندامت سمجھا ہے، دراصل محبت میں وہ ندامت نہیں ہے۔ پرسوں(ں) تمام مبلغات حاضر ہو جائینگے۔

خادمِ احباب
آزاد دہلوی

(۴۵)

قطعہ فی البدیہہ

میرے شفیق رنجور!

گرچہ ہے وعدہ خلافی مری ثابت تم پر — اور وعدہ میرا پورا کبھی ہوتا ہی نہیں
جو وعدہ بھی ہوا پورا، تو یہ شکوہ ہے تمھیں — کہ کبھی وقتِ معین پہ میں آتا ہی نہیں
یعنی فی الجملہ نتیجہ یہ نکالا تم نے — میں گیا وقت ہوں، جاتا ہوں، تو آتا ہی نہیں
وقت کہتے ہو مجھے، سچ ہے، مگر یہ تو کہو — پہلے تو وقت میسّر کبھی ہوتا ہی نہیں
اور میسّر ہو تو پھر قدر کرو، قدر کرو — کہ جو جاتا ہے، تو پھر حشر تک آتا ہی نہیں
میں تو ہوں "وقت"، ہلو، تو غنیمت سمجھو — میں بھی سمجھا ہوں تمھیں "وقت" کہ ملتا ہی نہیں

آؤنگا آٹھ بجے ٹھیک میں انشاء اللہ
پھر نہ کہنا مجھے (رنجور!) کہ آتا ہی نہیں

ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی

خاک بر سرم باد کہ امروز باز فکرِ شعر کردم۔ استغفر اللہ! استغفر اللہ!

(۴۶)

(اس وقت اور کوئی کاغذ موجود نہ تھا۔ اس لیے اسس مکلّف کاغذ پر خط لکھ رہا ہوں ورنہ میری عادت ایسی نہیں ہے۔ لاتخفی)

پرائیویٹ)

بحیرتم کہ سرانجام من چہ خواہد شد؟

بھائی رنجور! اگر میں اس امر پر افسوس کروں تو کیا بیجا ہے کہ آپ ایسا شفیق، غمگسار دو مرتبہ عنایت فرمائے اور تشریف لائے، اور بدبخت آزاد، نالائق آزاد، ..... آزاد خدمت میں حاضر ہو کر ملاقات نہ کرے! پرسوں میں خوابِ غفلت میں پڑا سو رہا تھا کہ خوش قسمتی کی طرح آپ تشریف لائے ہمشیرہ صاحبہ نے اس خیال سے کہ مجھے اوٹھنے میں شاید تکلیف ہو، خوابِ بدبختی سے بیدار نہیں کیا (واقعی بُرا کیا) اور آپ تشریف لے گئے۔ آج آپ کا پرچہ مجھے بتول نے لاکر دیا۔ میں سویا ہوا تھا۔ آمادہ ہوا کہ حاضر ہوں۔ غنودگی سی آئی سو رہا۔ اوٹھا تو معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے گئے ہیں۔ ہیہات! ہیہات! الاسف! الاسف! بہرکیف، مجھے امید ہے کہ آپ میری اس معذورانہ نالائقی کو معاف فرمائینگے۔ اور اوسی نظرِ ترحم سے جس سے آپ ہمیشہ میری نالائقیوں کو دیکھا کرتے ہیں، اوسی نظرِ عفو سے جس سے آپ ہمیشہ میری نالائقیوں کو معاف کیا کرتے ہیں دیکھینگے اور معاف فرمائینگے۔ والعذر عند کرام النّاسِ مقبول

اگرچہ آپ نے ابھی تک پوری باتیں نہیں فرمائی ہیں، مگر میں سمجھ گیا ہوں جو کچھ بھائی صاحب نے میرے متعلق فرمایا ہوگا۔ آپ نے خود غور فرمایا ہوگا کہ میرا معاملہ کس قدر پیچیدہ ہوگیا ہے، اور کیسی پیچیدگیوں میں، مَیں گھرا ہوا ہوں، بحیرتم کہ سرانجامِ من چہ خواہد شد؟

جناب بھائی صاحب کی میرے متعلق جو رائے ہے، غالباً آپ نے اوسے اپنی خداداد فراست سے سمجھ لیا ہوگا۔ مگر میں اوسے مختصر یہاں پر لکھ دیتا ہوں۔ پہلے آپ اوسے ملاحظہ فرمالیں:

میں (یعنی گنہگار آزاد) نہایت بداعمال[1] (؟) نالائق[2]، کذّاب[3]، بےادب[4]، بدمذہب نیچری[5] (یا قریب بہ نیچری)، بیہودہ[6]، برگشتہ از خاندان[7]، آوارہ[8]، برے لوگوں کی صحبت میں رہنے[9] والا، بدمعاش[10] (یا قریب بدمعاش)، دشمنِ خاندان[11]، بدنام کنندہ خاندان[12]، بےعلم[13] وغیرہ وغیرہ۔

یہ اون کا خیال اکثر تقریروں کے ذریعہ سے لوگوں پر منکشف ہوچکا ہے، وہ بارہا صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں۔ بھائی رنجور! میں ایماناً کہتا ہوں وکفی باللہ شہیداً کہ مجھے اس امر کے ماننے میں ذرّہ بھر عذر نہیں ہے کہ واقعی جیسا اون کا خیال ہے، میں ویسا ہی ہوں۔ واقعی میں بداعمال ہوں (گو قائل کیسا ہی خوش اعمال، پابندِ صوم وصلوٰۃ ہو) نالائق نیچری وغیرہ سب ہوں۔ مگر ہاں، مجھے نمبر ۴ اور نمبر ۷ اور نمبر ۸ اور نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ سے انکار ہے۔ میرے دل میں بھائی صاحب اور والد صاحب قبلہ کی جتنی وقعت اور عزت ہے، اوس سے عالم الغیب جلّ جلالہٗ واقف ہے۔ ہاں، میرے نزدیک ادب عبارت ہے، تعظیم قلبی سے، نہ فضول لسانی سے۔ میں بھائی صاحب کا ہاتھ نہیں چومتا، مگر دل میں اونھیں اس تعظیم کے قابل سمجھتا ہوں۔ پس، اون کے خیال میں گو میں کیسا ہی بےادب کیوں نہ ہوں، مگر میں ہرگز بےادب نہیں ہوں۔ نمبر ۷ اور نمبر ۸ اور نمبر ۹ کا خیال، بیشک، اون کا، میرے لیے بہت آزاردہ ہے۔ میں نے آج تک بدمعاشوں کی صحبت سے احتراز کیا ہے۔ غلطی سے کسی بدمعاش سے ملاقات ہوئی اور بعد کو اوس کی حالت معلوم ہوئی، تو متنبّہ ہوگیا۔ میری حالت اور میرے کیرکٹر سے جو واقف ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ مجھ پر جو رنگ کہ چڑھنے والا تھا، چڑھ گیا۔ اب کسی کی صحبت سے کوئی رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ چاہے کوئی کیسا ہی بدمعاش کیسا ہی (؟ کیوں نہ) ہو۔ انشاءاللہ اوس کے لغو خیالات کا مجھ پر اثر نہیں ہوسکتا۔ ہاں، بھائی صاحب اور عرب صاحب نے جو اصول بدمعاشی کے لیے مقرر کیے ہوئے ہیں، اون اصول کے موافق میں، بیشک بدمعاشوں سے ملتا ہوں۔ مگر جب اون اصول کی صحت معرضِ بحث میں ہے، تو پھر میں کیونکر اس امر کو

تسلیم کر لوں کہ واقعی وہ علم دوست اشخاص بدمعاش ہیں۔

الغرض بھائی صاحب کے خیالات تو میرے متعلق ایسے ہیں اور اس پر اونھیں پورا بھروسہ ہے۔ اب آپ بتلائیں کہ میں ایسے موقعہ پر کیا کروں؟ جن قابل لوگوں سے میں ملتا ہوں، وہ بدمعاشی کا اون پر فتویٰ چلاتے ہیں۔ اب اون سے ملنا کس طرح ترک کروں؟

میں چار دن سے اسی فکر میں پریشان ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے، جس سے یہ روز کی زق زق بق بق بند ہو! میں نے اب یہ ارادہ کرلیا ہے کہ میں زیادہ باہر آنا جانا جوان حضرات (بھائی صاحب اور رعب صاحب) کو ناگوار معلوم ہوتا ہے، ترک کردوں۔ اور سوائے اوس پرانے معمول کے کہ بعد عصر مسجد یا اور کہیں تفریحاً چلے جانا، اور کہیں آؤں جاؤں نہیں۔ شاید اسی سے ان کے خیالات کچھ کم ہوجائیں اور مجھے کچھ دنوں کے لیے اطمینان نصیب ہو۔ زیادہ نہ کسی سے ملوں نہ جلوں، اور اگر ملوں بھی، تو وہ بھی شام کو بعد العصر۔ وہاں کی نشست بھی ترک کردوں۔ اب آپ فرمائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر آپ کے نزدیک واقعی یہ مناسب ہو، تو میں اس پر عمل کروں۔ میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اب مجھے جس قدر آپ پر بھروسہ ہے اور جس قدر آپ کی بات پر اعتبار، اور کسی پر نہیں ہے۔ گو وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے آپ کوئی صورت ارشاد فرمائیں، یا اسی صورت پر قلمِ صحت کھینچ دیں، تاکہ میں اس پر عمل کروں، مجھے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ باقی رہے میرے ذاتی خیالات، تو اس کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ میرے افعال اور روش پر کچھ دنوں تک کوئی پہرہ بٹھا سکتا ہے، مگر خیالات پر کوئی اختیار نہیں کرسکتا۔

خط بہت لمبا چوڑا ہوگیا۔ کاغذ بھی قریب الاختتام ہے۔ کل آفس سے واپسی کے وقت تشریف لائیے میں منتظر رہونگا۔ آپ آتے ہی اطلاع دیجیے گا، میں حاضر ہوجاؤنگا۔ مگر اس تحریر کا جواب تحریری ہی میں دیا جائے۔ خط آپ خود ساتھ لیتے آئیں، اگر کل لکھا جائے۔ نہیں تو پھر بالمشافہ گفتگو ہو رہیگی، خط پھر لکھ دیجیے گا۔ باقی عند التلاقی

ابو الکلام آزاد دہلوی

(۴۷)

باسمہ سبحانہ

محبتیکہ ترا بامنست، میدانم
ارادتیکہ مرا با توہست، میدانی![۲۲]
برادرِ شفیق، مکرم دوست! تسلیم

لارڈ ٹینی سن کا قول ہے کہ "دوست کا خط بیمارِ عشق کے لیے وہ نسخہ شفا ہے، جس کے استعمال سے مریض صحتِ کلّی پاتا ہے۔"

اگرچہ بادی النظر میں یہ شعری مبالغہ معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس امر کی تصدیق وہ شخص کرسکتا ہے جو واقعی بیمارِ عشق ہے، اور اوس کی بیماری اس امر کی محتاج ہے کہ مسیحائے عشق کوئی مجرّب نسخہ لکھ کر عنایت کرے۔ بیشک آپ کے نسخے مجھ بیمار کے لیے نہایت مفید ہیں، یعنی آپ کے خطوط میرے لیے بہت اچھا اثر پیدا کرتے ہیں۔

پرسوں (ل) بوجہ تعطیل تمام دن میں خطوں کی تقسیم کی دو ڈلیوریاں ہوئیں تھیں۔ اس لیے آپ کا خط ایک بجے کے قریب پہنچا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو اوس کا کس قدر انتظار تھا! سمجھ لیجیے کہ ایک دنیا سے رُوٹھے ہوئے کا انتظارِ مرگ تھا، جس کے لیے اوس کا اشتیاق اپنی اشتیاق کی حد سے نکل کر جنونِ انتظار میں قدم رکھے ہوئے ہے (؟)

مجھے اس ذرا سے بیان سے اپنی محبت نہیں جتانی ہے کیونکہ آپ کا دل خود میری کیفیت کا اندازہ کرتا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنے عزیز و اقارب کی محبّت اعلیٰ درجہ کی محبّت ہوا کرتی ہے۔ مگر جیسا کہ سر سیّد احمد خان مرحوم منفور نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے، واقعی ایک سچّی محبّت کے آگے اوس محبّت کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔

ہاں، بیشک آپ کی سچّی محبت عزیز و اقارب کی محبت سے ترجیح رکھتی ہے۔

میں الحمد للہ، اپنے اعزا کی محبّت کا شاکی نہیں ہوں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بھائی صاحب کی زیادتیاں بعض اوقات میرے دل کے لیے بُرا اثر پیدا کرتی ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ میرے خیال اپنے تمام گھر والوں میں اختلافی پہلو رکھتے ہیں، بالخصوص، بعض اصلاحی خیال، جن کو میں نے سر سیّد کی تحاریر سے اخذ کیا ہے، بالکل مختلف ہے۔ اور اسی لیے سوسائٹی کے خوف سے آج تک میں اون کو زبان پر نہیں لایا۔ (ہاں آپ سے میں (نے) کچھ ظاہر کیے ہیں اور ظاہر کرونگا) مثلاً پردہ، اور تعلیم نسواں، ضرورتِ تاویل در آیاتِ مبحوث فیہ، صحتِ فلسفۂ جدید و تغلیطِ فلسفۂ قدیم وغیرہ۔ جن پر مجھے امید ہے کہ عندالاظہار نیچریت کا فتوی جاری کیا جائیگا۔

پرسوں (ں) ایک صاحب نے تعدّدِ ازدواج کا مسئلہ چھیڑ دیا۔ میں نے کہا کہ قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بلاضرورت ایک سے زیادہ بی بی کی جائے۔ چونکہ یہ ایک (حسبِ اعتراضاتِ یورپ) نیا خیال تھا، بھائی صاحب اس پر چونک اوٹھے۔ اور لگے کہنے کہ پچھلے مفسرین نے یہ کہیں نہیں لکھا۔ میں نے کہا کہ سخنِ جہّال، وہم جہّال (؟) اونھوں (ں) نے اس پر غور نہیں کیا۔ چلیے غلطی سہی! کیا مضائقہ! مگر اس تعدّدِ ازدواج کے تسلیم کرنے سے جو مہذّب یورپ کا اعتراض قرآن شریف پر وارد ہوتا ہے، اوس کا جواب ضروری ہے۔ اس پر اونھوں (ں) نے صاف آدمیوں میں کہہ دیا کہ یہ خیالاتِ نیچریان اور ملحدانہ ہیں، یعنی تو نیچری ہیں (؟ ہے)

مجھے اس امر کی کوئی پروا نہیں کہ دس آدمی میرا ہاتھ نہ چومینگے، یا میری پرستش نہ کرینگے، مجھ کو نیچری کہینگے۔ بلکہ مجھے اس امر کا افسوس ہوا کہ کہیں اس امر کی خبر والد صاحب کو نہ ہو جائے اور وہ بھی مجھے نیچری نہ سمجھنے لگیں۔ مگر خیر! مجھے اب اس کی بھی پروا نہیں! کتمانِ حق غیر ممکن ہے۔ اعلانِ حق سے کبھی نہ رکونگا۔

بہرکیف میں اپنے خیالات بالاعلان اگر کسی شخص پر ظاہر کر سکتا ہوں، تو وہ صرف آپ کی ذات ہے اور اس لیے میں آپ کو اپنے اعزا سے زیادہ مخلص سمجھتا ہوں۔

میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی۔ معاف فرمائیے گا۔ کیا کروں مجبور ہوں، لاچار ہوں، عالمِ بے اختیاری میں کیا کیا لکھ جاتا ہوں! میری مضامین نویسی کا بھی یہی حال ہے۔ عنوان لکھا ہے اور قلم دوات لے کر بیٹھ گیا۔ جو جی میں آیا، دُھر گھسیٹا۔ لوگ اوس کی تعریف کرتے ہیں۔ واقعی ان کی یہ عنایت ہے۔

ہمشیرہ صاحبہ، بھابی صاحبہ مدّ ظلّہا کی خدمت میں آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔ اون کی حالت بدستور ہے۔ دعا فرمائیے۔ بھابی صاحبہ کا زیادہ حزن و ملال واقعی نا مناسب ہے، اور اون کی ضعیف، علیل حالت کے لیے مضر۔ اللہ انھیں صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

جناب مولوی محمد محبّ (شعیب) صاحب اور میرے غائبانہ کرمفرما حضرت نبی حسن صاحب کو سلامِ شوق قبول ہو۔ حضرت کی غائبانہ عنایت کا ممنون ہوں۔

آپ کا خادم

ابو الکلام الدہلوی

ضمیمہ

قطعۂ تاریخِ تالیف "حیاتِ حکیم خاقانی شروانی" از تصنیفاتِ صدیقی و حبیبی مولانا ابوالکلام[۲۳] محی الدّین احمد صاحب آزاد دہلوی

از اثرِ خامہ

محمد یوسف جعفری رنجورؔ عظیم آبادی، چیف مولوی بورڈ آف اگزامنرس، کلکتہ

خاقانیِ باکمال کا حال — اُس پُر لطف بیانِ آزاد

جو لفظ ہے، مصری کی ڈلی ہے — کیا شیریں ہے زبانِ آزاد

صفحے نہیں، تختہائے گل ہیں — کہیے اسے، گلستانِ آزاد

گو ہند میں ہیں بہت سخنور — ہے سب سے نرالی شانِ آزاد

بہرہ ہی نہیں اُنھیں سخن سے — ہیں جو کہ نہ قدردانِ آزاد

آزاد کو حق رکھے سلامت! — برباد ہوں دشمنانِ آزاد

ہو نشو و نما یہ، یا الٰہی! — دائم فکرِ جوانِ آزاد

ہر دم رہے باڑھ پر خدایا! — آبِ طبعِ روانِ آزاد

تاریخ کی فکر اگر ہے، رنجورؔ!

لکھ دو: "ہے ارمغانِ آزاد"

(۱۳۲۰ھ)

محمد بن یامین کے نام

باسمہ سبحانہٗ

میاں بنیامین سلمہ ربہ

آج اس وقت ایک ویلو پے ایبل غالباً چھبیس روپیہ کا میرے نام آئیگا۔ تم ڈاکیے کو کہہ دینا کہ آج یہ ویلو لے جاؤ، کل لانا کیونکہ ابھی مولوی صاحب باہر گئے ہوئے ہیں۔ اور وہ کہہ گئے ہیں کہ کل منگا لینا۔ اس لیے اسے لے جاؤ، کل لے آنا۔ سمجھے ؟

ابو الکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی

خواجہ حسن نظامی کے نام

(۱)

۱۱۔ کولوٹولہ اسٹریٹ

کلکتہ

۸ دسمبر ۱۹۰۶ء

بھائی نظامی، کیا حال ہے؟ "وکیل" نے علالت کی خبر سنائی۔ اور تم اپنے نحیف جثّہ کو لیے ہوئے سامنے آگئے۔ افسوس کہ تم ڈاکٹری علاج سے متنفّر ہو۔ بہرکیف، جلد اچھے ہو۔ اور خدا کرے کہ کانفرنس میں آکر ملو یہ سفرِ بنگالہ کا اس سے بہتر پھر موقع ہاتھ نہ آئیگا۔ وسطِ جنوری سے ایک مستقل اخبار میری اڈیٹری میں کلکتہ سے نکلیگا: "دارالسلطنت"، میری دلی خواہش ہے کہ اس کے پہلے نمبر میں تمھارا ایک دلآویز مضمون ہو۔ خدا نہ کرے کہ تمھاری علالت امید براری میں حارج ہو۔

میں نے دہلی میں تمھارا شام تک انتظار کیا۔ اور پھر مایوس ہو کر روانہ ہوگیا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۲)

بنگلہ حافظ حلیم صاحب

کانپور

۲۶ اکتوبر ۱۹۰۹ء

بھائی نظامی، عرصہ کے بعد تم ملے۔ اور پچھلی پُر از خلوص و بے تکلفانہ صحبتیں یاد آگئیں۔ مگر جھوٹ کا عادی نہیں۔ سچ یہ ہے کہ باوجود میرے مکرّر سہ کرّر اصرار کے تمھارا ایک دن کے لیے بھی نہ ٹھہرنا مجھے سخت گراں گزرا۔ یہ انکار اس لیے تو نہیں تھا کہ ایک عقیدت کیش کی معیّت تھی اور میری بیتکلفیاں خوف دلاتی تھیں کہ کہیں کوئی مضر اثر نہ پڑے۔ اگر ایسا خیال ہو، تو کچھ بیجا بھی نہیں۔ کلکتے اور بمبئی میں خود مجھ کو اپنے احباب بیتکلف سے کبھی کبھی ایسا خوف ہوجاتا ہے۔ مگر چند گھنٹوں کی صحبت میں اُن کا تو تم نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ ارادت اندیشوں کی موجودگی میں میرا سلوک کیسا ہوتا ہے! ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے کسی قدر متضاد و مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت میں اوڑھنے پہننے کا مجرم ہوں۔ پس، اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہوسکتی ہے کہ ہم ایک دوست سے جو سلوک میخانہ کی چھت پر کریں، اسی کا مستحق اسے جادۂ خانقاہ پر بھی سمجھیں۔

اِس کی طرف سے تو مطمئن رہو۔ اور مجھے تم اپنا سچّا خیر خواہ، اعزاز طلب، اور دوست سمجھو۔ جیسا کہ برسوں سے باہم سمجھا کیے ہیں۔ مگر خدا کے لیے یہ تبلاؤ کہ اس اعراض و اغماض کا کیا مطلب تھا۔

آج کل جو کام تم نے شروع کیا ہے، گو میرا راستہ اس سے الگ ہے۔ مگر میں تو ہر راہ میں تیز گام ہوں۔ اگر ضرورت سمجھو تو یہاں مجھ سے کافی اعانت مل سکتی ہے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۳)

۳ ۱ میکاوڈ سٹریٹ
کلکتہ

برادرم، پتہ بدل گیا ہے۔ آئندہ سے مندرجۂ صدر نشان پر خط لکھا کیجیے۔
پرچہ پہنچا۔ کھولا، تو آپ کا مضمون نظر پڑا۔ دمدار تارے کے اثرِ نحوست کا اقرار صالح اور نیز اس کے علاج سے اتفاقِ کلّی؛ لیکن ۹۲ کی قید پر اصرار کیجیے گا، تو مجھے مجبوراً الگ ہو جانا پڑیگا۔ یہ یُسر پسندی کے خلاف ہے۔ پھر سورت بھی منتخب کی تو عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ کے جزر اخیر کو نظر انداز کر دیا جائے حالآں کہ ایسے کاموں کے لیے تو سورۃ اِنَّا اَعْطَیْنٰا اور قُلْ هُوَ اللّٰہُ سے بڑھ کر اور کوئی مفید نہیں۔ بہتر یہی ہو گا کہ ۹۲ کے جزر دوم کے حذف کر دینے پر ہم آپ باہم سمجھوتہ کریں۔ اختلاف کو طول دینا مُضر ہے۔ انصاف کیجیے کہ اگر میں پانی دم کر کے گھر سے نکلوں کہ کلکتے کے تمام کونوں پر چھڑک دیا جائے، تو دو ماہ سے پہلے واپسی ممکن نہیں۔

خیر، یہ تو لطیفہ تھا۔ جی چاہتا تھا کہ آپ سے کچھ ہنس بول لوں۔ اب یہ کہیے کہ جواب کیوں نہیں دیتے؟ دو خط لکھ چکا ہوں۔ اجمیر کا ارادہ قطعی کیجیے، تو شاید میں بھی نکلوں، اگرچہ وقت نکلنا مشکل ہے کیونکہ چاہتا ہوں کہ پہلی رجب سے اخبار نکال دوں۔
مشورۃً بہت کچھ کہنا ہے، بشرطے کہ پچھلے مراسلات کا جواب مل جائے۔ کلکتہ کا مکرّر عزم کیجیے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۴)

کلنگا بازار اسٹریٹ

کلکتہ

۳ جون ۱۹۱۰ء

یہ متّصل خاموشی کیوں؟ کہیے، تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بھیجوں۔ بمبئی سے آتے ہوئے سرمد یاد آ گئے تھے۔ ان کی رباعیات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا۔ کبھی نظر پڑ جاتی ہے، تو خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ آپ چاہیں تو قلمبند کر کے بھیج دوں۔

علامہ امام الدین لاہیجی الفنجابی دہلی میں آپ سے ملے نہیں، معلوم نہیں، کیسی گزری!

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۵)

۸۹ کلنگا بازار اسٹریٹ

کلکتہ

۱۵ جون ۱۹۱۰ء

بھئی، اصل بات یہ ہے کہ عدیم الفرصت بہت ہوں۔ اپنے ذاتی اشغال کے علاوہ چند کام ایسے سر پڑ گئے ہیں کہ ایک گھنٹہ بھی فرصت کا نصیب نہیں ہوتا۔

چند تفصیلی مضامین بعض اہم معاملات کے متعلق ہیں کہ بہت جلد شائع ہو جانے چاہییں ان کی بھی فکر ہے۔ اُن سب پر طرّہ اخبار، جو ۱۵ رجب سے شائع ہو جائیگا۔ پھر بعض تالیفات جن کو مکمل کر دینا چاہتا ہوں کہ جو زندگی عنقریب شروع ہونے والی ہے، وہ اس کی مہلت بہت کم دیگی۔

سرمد کا ذکر تو یوں آ گیا کہ آپ خاموش تھے۔ اور چاہتا تھا کہ کوئی ذکر چھیڑ دوں کہ بات کا

پہلو نکل آئے۔ قطعی وعدہ نہیں کرتا[۱۲]۔ پہلی رجب کو دیر ہی کتنی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن ہاتھ آجائے، اور لکھ کر بھیج دوں۔ بمبئی پہنچا تو کتبخانہ پر نظر ڈالی۔ حالات بھی زیادہ معلوم ہوئے ہیں۔

کیا اب کے اجمیر کا ارادہ ہے[۱۳]؟ ضعیف سا ارادہ میرا بھی ہے۔ اگر آپ کا آنا قطعی طور پر معلوم ہو جائے، تو ممکن ہے، ضعیف اپنی جگہ، ارادۂ مصمّم کے حوالہ کر دے۔ صاف صاف لکھیے۔

واحدی صاحب کو خدا جلد شفا دے۔ یہ دوسری بات ہے۔ مگر مجھ سے پوچھیے، تو آدمی کو ہمیشہ بیمار رہنا چاہیے۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۶)

۶/۵۷

ہمدردانہ کہتا ہوں کہ یہ آپ نے اچھا نہ کیا کہ لوگوں کو مخالف بننے دیا۔ مصلحت اندیشی اور حزم و احتیاط کا راستہ دوسرا ہے۔ کام خاکساری اور فروتنی سے کرنا چاہیے کہ دشمنوں کو خاکسار بنانے کی گنجایش نظر نہ آئے۔ اب آپ کی مخالفت زور شور سے کی جائیگی۔ کلکتہ اس دنیا سے الگ ہے، مگر یہاں بھی مخالفانہ خیالات سخت درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ ایک بہت بڑا مضمون لکھا جا رہا ہے۔ مجھ سے کہا گیا۔ میں نے کہا، مجھے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔

چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس آگ کو دبا دیا جائے۔ اگر آپ پسند کریں، تو میں تفصیلی مشورہ دے سکتا ہوں!

ابوالکلام آزاد دہلوی

(۷)

۴ا میکلاؤڈ اسٹریٹ

کلکتہ

محبّی

خط پہنچا تھا۔ علالت اور عدیم الفرصتی نے مہلت نہ دی۔ اب تو خود حاضر ہو رہا ہوں، نامہ بر کی منّت پذیری کیوں!

کل رات کو پونے گیارہ بجے کی دربار اسپیشل ٹرین سے روانہ ہونگا۔ بشرطِ زندگی، انشاءاللہ دہلی میں ملاقات ہو۔

واحدی صاحب کو سلام شوق۔

ابوالکلام

(۸)

۲۳ میکلاؤڈ روڈ اسٹریٹ

کلکتہ

۳ نومبر ۱۹۱۲ء

زادنا اللہ سبحانہ و ایاکم حمیۃ الاسلام

خط پہنچا۔ یہ سچ ہے۔ مگر اس میں مصر و شام کی کیا خصوصیت ہے! سیاحتِ قلبی کے جغرافیہ کی کوئی حد نہیں۔

یہ تمام مواقع جو آپ نے لکھے ہیں، پیشتر ہی سے پیشِ نظر تھے ..... کو میں نے ان کی افسردہ جوابی پر ۶ صفحے کا خط لکھا، جو اگر حس و غیرت مر نہیں گئی۔ تو نشتر بن کر مدّت العمر چبھتا رہیگا۔ تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ اِن خوش پوش غلاموں سے کوئی

امید نہیں۔ علی گڑھ کی تحریک نے مسلمانوں کو عضوِ شل بنا دیا ہے۔ لیکن بہر حال فرصت قلیل اور وقت نازک ہے۔ فتحپوری میں جو مجلس ہوئی، کافی نہیں۔ اس کی روئیداد بھی متضاد چیزوں کا مجموعہ۔ ایک صاحب حکیم جی کو صدر بتاتے ہیں۔ دوسرے صاحب سرے سے شرکتِ محض ہی سے ساکت ہیں۔ چندے کا طالب نہیں، لیکن صرف ایک اجتماعِ عام ہونا چاہیے۔ باہم دعائے نصرت و فتح، اصلی مقصود اتحاد بین الملی کہ بنیادِ حقیقی ...... واصل رشتہ ارتقا و اصلاحِ اسلام ہے۔ اور اس کے لیے اس موقعہ سے بہتر اور پھر کوئی وقت نہ ملیگا۔ آج کوئی وطنی یا مقامی تحریک مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی، خواہ وہ یونیورسٹی کا افسانہ ہی کیوں نہ ہو، جب تک تمام دنیائے اسلام میں ایک بین الاقوامی و عالمگیر اتحادی تحریک نہیں ہوگی۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چالیس کروڑ مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں! بہر حال یہ داستان طویل ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ سرِ دست ایک جلسہ کا انتظام ہو سکے: جو عام، اور زیادہ تر عام، آبادی پر مشتمل ہو۔ کچھ ضرور نہیں کہ دہلی کا کوئی سربرآوردہ یا خطاب یافتہ بھی اُس میں شریک ہو۔ آپ پر اس پر غور کیجیے۔ اور جلد جواب دیجیے۔ آتے اتوار کو دوسرا جلسۂ عام ہے۔ اس کے بعد قطعی ارادۂ سفر۔ والاتمام من اللہ۔

وانا الفقیر المکیّ بابی الکلام الدہلوی

(۹)

۹/۶۰

علیکم السلام

(۱) قائل ہوں۔

(۲) اس کا اتفاق نہیں ہوا۔

(۳) ایک اتنا بڑا مذہبی اجتماع کیوں نہ مفید ہو! البتہ ضرور ہے کہ اصلاح کی جائے۔ نیز ضرور ہے کہ تبدیلیاں ہوں۔

فقیر ابو الکلام

مولوی انشاء اللہ خاں کے نام

(۱)

نمبر ۱۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ

۱۲ دسمبر ۱۹۰۶ء

شفیقِ مکرم

اظہارِ ندامت و معذرت کے لیے الفاظ نہیں ملتے کہ میرے عدمِ اطلاع میں آپ کا وی پی واپس ہوگیا۔ قطعی ارادہ ہے کہ وسطِ جنوری سے مرحوم "دارالسلطنت" کو زندہ کروں۔ غالباً آپ بھی اس کو پسند کرینگے کہ ایک مستقل اخبار میرے زیرِ قلم ہو۔

اب کچھ کام کی باتیں سنیے۔ آپ کو تاریخِ ہندوستان فارسی سرجان مارشمین کلارک۔ مطبوعہ قدیم کلکتہ، ارکانِ اربعہ، مآثرِ عالمگیری اور تاریخِ نادری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ متعدد بار اس ضرورت کا آپ اظہار کرچکے ہیں۔ ان چاروں کتابوں کے کافی نسخے میرے پاس موجود ہیں۔ مگر اب مبادلہ کتب نہیں ہوسکتا، نقد قیمت پر معاملہ کیجیے۔

آپ تاریخِ ہند اور مآثرِ عالمگیری کو چھ چھ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں۔ مجھ سے ۵؎ اور ۸؎ میں لیجیے۔ اوّل الذکر آپ تین میں بصیغۂ مبادلہ لے چکے ہیں، اور بصورت نقد آٹھ آنے کی تخفیف۔ ارکانِ اربعہ اور تاریخ نادری، ایک روپیہ اور دو روپے سے کم ممکن نہیں۔ امید ہے کہ بہت جلد تفصیلی جواب دینگے۔

کوئی کارآمد اور قیمتی کتاب معاوضے میں دیجیے، تو لینے کے لیے تیار ہوں مثلاً
تمدّن عرب یا مطبوعاتِ عربی۔

"دارالسلطنت" کی نسبت اب تک کوئی نوٹ[۳] "وطن" میں نہیں نکلا: "دارالسلطنت"، "وطن"
کے مقاصد کا حامی اور اس کی اسلامی خدمات کا ہمیشہ معترف رہیگا۔

ابوالکلام آزاد دہلوی

مالکِ اخبار دار السلطنت

مولوی عبداللطیف[۱] کے نام

۱۱ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ   (دسمبر ۱۹۰۶ء)

جنابِ مکرم

افسوس ہے کہ کثرتِ کار اور ہجومِ احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ خود حاضرِ خدمت ہوں۔ قیام پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ چکی ہیں، اور صرف ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہے۔ میں اس کو بھی ابھی طے کر دیتا، مگر ہجومِ احباب ایک گھنٹہ کی فرصت نہیں دیتا۔ اس لیے آج شام کو ڈھاکہ روانہ ہونگا اور پہلی جنوری کو یقیناً واپس آجاؤنگا۔ پہلی سے ۷ تک کافی وقت ہے اور انشاءاللہ تب جلد قیامِ پریس کی صورت ہوجائیگی۔

لیکن ایک نہایت ضروری معاملہ ہے جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورتیں متقاضی نہ ہوتیں، تو میری خودداری اس خط کے لکھنے سے سخت مانع آتی۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق اخبار مجھے اس وقت پیشگی دے دیں، بشرطے کہ پیشگی دینے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ ڈھاکہ سے واپسی پر اخبار جاری ہوجائیگا۔ اور ان شاءاللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہو جائیگی۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر نہ ہوگا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ یہ پیشگی رقم اس وقت میرے لیے نہایت کار آمد اور بیحد مفید رقم ہوگی۔

اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپ کی دوستانہ توجہ کا ممنون ہوں اور ممنون رہونگا[۲]

ابوالکلام آزاد

مُلّا واحدی کے نام

۱۴ فورٹ اسٹریٹ بمبئی

واحدی صاحب! تسلیم

مضمون[۲] قصداً ناتمام بھیجا تھا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں جتنے صفحے قلم سے نکلے، انھیں کو غنیمت سمجھ کر بھیج دینا مناسب نظر آیا۔ تین دن کے بعد پھر کچھ مہلت ملی، تو باقی مضمون مرتّب کیا۔ اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیج دیا۔ حیرت ہے کہ اب تک صرف پہلی قسط کیوں بھیجی گئی۔ بہر کیف، اگر ضائع ہوگیا ہے، تو اب نہ اتنی مہلت ہے کہ پھر لکھوں، اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہے کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے۔ یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا کہ سرمد کے حالات لکھیے۔ ورنہ تاریخ کے سیکڑوں اربابِ اجتہاد و تجدید شکوہ سنجِ بے التفاتی ہیں۔ انھیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضائع کرے!

یاد فرمائی کا شکریہ!

ابوالکلام آزاد دہلوی

عبدالماجد دریابادی کے نام

(۱)

۷ - امیکلاؤڈ اسٹریٹ، کلکتہ

۱۲ اگست ۱۹۱۲ء

صدیقی العزیز!

والا نامہ پہنچا۔ آج صبح مہلت ملی تو عین صبح کے وقت کہ ذہن و دماغ کے سکون اور جمعیت کا وقت ہوتا ہے، اوّل سے آخر تک پڑھا۔ یقین فرمائیے کہ اس مخلصانہ اظہار رائے و مشورہ کے لیے کمال متشکر اور ممنون ہوں۔

میں آج ہی تفصیلی طور پر اپنی معروضات بھی عرض کرتا، لیکن خود بیمار رہوں، گھر میں شب سے سخت علالت۔ دو چار دن کی مہلت دیجیے۔ انشاء جمعرات یا جمعہ کے دن خط لکھونگا۔

آپ کا پتہ مجھے معلوم نہ تھا۔ مولانا شبلی[2] یہیں مقیم تھے، ان سے پوچھا تھا اور خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔

مولانا شبلی کی بھی الہلال کے لب و لہجہ کی نسبت وہی رائے ہے، جو آپ کی ہے۔[1]

ابوالکلام

---

[1] مولانا کے محفوظ خطوں میں یہی سب سے پہلا خط ہے۔ مکتوب الیہ اس وقت بی اے پاس کرکے ایم اے میں (فلسفہ لے کر) داخل ہونے کی فکر میں تھا اور اس وقت مسلمان طالب علم کے لیے یہ ایک حد تک نئی سی بات تھی۔

(۲)

۷۔ امیکلاؤڈ اسٹریٹ۔ کلکتہ

۷۔ دسمبر ۱۲ ۱۹ء

صدیقِ العزیز!

سخت نادم ہوں کہ خط کا جواب وقت پر نہ دے سکا و خواستگارِ معافی۔

امید ہے کہ آپ بصحت و عافیت ہونگے۔ یہ سُن کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے ایم اے میں فلسفہ لیا ہے، نیز تحصیلِ زبانِ جرمن۔

بقیۂ حاشیہ

الہلال کو نکلے ہوئے ابھی تھوڑا ہی زمانہ ہوا۔ علی گڑھ کے خلاف اس کی شدید اور تُند پالیسی سے مکتوب الیہ متفق نہ تھا اور یہی مولانا کو مفصل خط میں لکھ بھیجا تھا۔ مولانا شبلی تو علی گڑھ کی سیاست کے خود ہی بہت مخالف تھے۔ تاہم الہلال کی حد تک جانے کو تیار نہ تھے۔

صاحبِ الہلال کا مرتبہ اس وقت بھی بلند تھا۔ یہ ان کا نہایت کرم تھا کہ ایک طالب علم سے وہ مساویانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھے۔

لفظ "صدیقی" جس سے یہ مکتوب شروع ہوا ہے، اور آیندہ بھی عموماً اسی سے سارے مکتوب شروع ہوتے رہینگے، عربی کا لفظ صدیق بروزنِ فَعیل و کریم ہے۔ نہ کہ اردو میں چلا ہوا لفظ صِدّیق (دال مشدّد کے ساتھ) اور اس کے معنی دوست کے ہیں۔

ے مکتوب الیہ لکھنؤ چھوڑ کر اب علی گڑھ پہنچا ہے (لکھنؤ میں ایم اے میں فلسفہ کی تعلیم کا انتظام نہ ہو سکا)۔ علی گڑھ میں پروفیسر ہورووٹز (جرمن یہودی و مستشرق) سے جرمن زبان میں کچھ شُد بُد شروع کر دی تھی اور وہ شُد بُد سے آگے بڑھی ہی نہیں۔ مولوی عبدالقادر بھاگلپوری بھی ایم اے بی کے طالب علم تھے۔ فلسفہ میں کوئی اور مضمون لیے ہوئے۔ مسلک قادیانی (احمدی) رکھتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد اُن کے علم و نظر کے مدّاحوں میں تھے۔

مولوی عبدالقادر صاحب خط کا جواب نہیں دیتے۔ امر تسر میں نے خطوط لکھے اور عرصے تک انتظار کیا۔ میرا سلام پہنچا دیجیے۔

ابوالکلام

(۳)

۲۶ مئی ۱۹۱۳ء

دیر آمدی، اے نگارِ سرمست!
زود ت ندہم دامن از دست

صدیقی العزیز!

عطیۂ گرامی کا شکریہ۔ حسب الارشاد دو نمبروں میں شائع ہو جائیگا۔

کیا آپ اس کو پسند فرمائینگے کہ البصائر کے لیے جو ایک ماہوار غیر سیاسی خالص دینی پرچہ ہوگا جو جولائی سے شائع ہو جائیگا، کوئی مضمون مخصوص ارقام فرمائیں؟ اہم علمی موضوع پر ہو اور ترجمہ ہو یا بطور خود۔

ایک مستقل کتاب[۵] کے زیرِ ترتیب ہونے کی خبر پڑھ کر خوشی ہوئی۔

البصائر کے لیے مضمون ۱۵ جولائی تک ضرور مل جانا چاہیے۔ پہلا نمبر مدت سے مرتب

---

۵ "مستقل کتاب" سے اشارہ مکتوب الیہ کی "فلسفۂ جذبات" کی جانب ہے۔ اس کتاب کا ایک باب دو نمبروں میں چھپنے کے لیے الہلال کو پیش کیا گیا تھا۔ الہلال نے اسے چھاپا تو لیکن بعض مصطلحات پر ایک تنقیدی نوٹ دے کر جس کا لہجہ مولانا کے مکتوب کے محبت آمیز لہجہ سے بالکل مختلف تھا۔ البصائر کا نکلنا اس وقت یاد نہیں پڑ رہا ہے۔

ہے۔ صرف بعض ابواب باقی ہیں۔

مخلصکم الوفیٰ
ابوالکلام

جناب عبدالماجد بی اے۔ اسکوئر
گھسیاری منڈی۔ لکھنؤ۔

(۴)

۲۳ ستمبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!
آپ کا مضمون پہنچا۔ لیکن آپ نے کسی قدر جلدی کی، میری تحریر ناتمام ہے۔ میں اسے بجنسہٖ الہلال میں شائع کردونگا، مگر اپنی بقیہ تحریر کے ساتھ یا بعد۔
آپ کے غصہ نے بڑا لطف دیا[1]۔
لکھنؤ میں مولوی ظفر حسن صاحب[2] کے متعلق آپ سے گفتگو ہوئی تھی اور یہ بات قرار پاگئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آکر یہاں ٹھہریں۔ لیکن پچھلے دنوں ان کا ایک خط مراد آباد

---

[1] الہلال کے تنقیدی نوٹ کے جواب میں ادھر سے بھی ایک مضمون ترکی بہ ترکی لکھا گیا تھا۔ مکتوب میں مکتوب الیہ کے غصہ کا حوالہ اسی جوابی مضمون کے سلسلہ میں ہے۔

[2] ظفر حسن خاںؔ سے مراد ہیں آج کے خان بہادر ظفر حسن خان، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز اور ریٹائرڈ پرنسپل، شیعہ کالج لکھنؤ ــــــ لکھنؤ کیننگ کالج میں مکتوب الیہ کے خصوصی دوستوں میں تھے۔ اور انہی کے توسط سے مولانا سے ملے تھے، جب وہ سول اینڈ ملٹری ہوٹل (آج کے برنگٹن ہوٹل) لکھنؤ میں مقیم تھے۔ مولانا انھیں الہلال کے اسٹاف میں لینے کو آمادہ تھے۔

سے آیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اس قرارداد کی کچھ خبر نہیں۔ اب غالباً وہ لکھنؤ میں ہونگے۔ جو گفتگو آپ سے ہوئی تھی، وہ اُن سے فرما دیجیے۔ اب تک اس کا پورا موقع باقی ہے کہ وہ تشریف لائیں۔
ہاں، یہ آپ کو معلوم ہے کہ آج کل مسلم گزٹ کا اڈیٹر کون ہے[۱]؟

ابوالکلام

(۵)

۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط پہنچا۔ یہ تو میں نے پیشتر ہی آپ کو لکھ دیا تھا اور اجازت طلب کی تھی کہ مضمون کی اشاعت میں تاخیر ہوگی۔ اور لکھا تھا کہ میں اپنی تحریر کے اختتام کے بعد جو نمبروار چھپ رہی ہے، اسے درج کرونگا۔ چنانچہ اس کی نسبت آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اِدھر میں اَور معاملات میں اس طرح مصروف رہا کہ بقیہ مضمون کے لکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بانکی پور چلا گیا تھا، وہاں سے واپس ہوا اور بیمار ہوں۔ پس، آپ کی تحریر آیندہ اشاعت میں بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد کی اشاعت میں شائع ہوگی مع میرے مضمون کے تیسرے آخری نمبر کے۔ رہا یہ کہ آپ اس کو دوسرے اخبارات میں شائع فرمائینگے، تو شاید میں نے اب تک کوئی کوشش اس طرح کی نہیں کی ہے کہ لوگ اپنے مضامین الہلال کے سوا دیگر رسائل میں شائع نہ کریں۔ یہ آپ کے

---

[۱] مسلم گزٹ اس وقت لکھنؤ کا ایک مشہور ہفتہ وار تھا۔ مولوی وحید الدین سلیمؔ پانی پتی کی ادارت میں نکلتا تھا۔

لیے جس طرح اس وقت ممکن تھا، جب آپ نے وہ تحریر مجھے بھیجی۔ اب بھی ممکن ہے اور آیندہ بھی ممکن رہیگا۔ آپ جس اخبار میں شائع کرنا چاہیں، شائع فرمادیں۔ مجھے تو کوئی عذر نہیں البتہ بصورتِ عدمِ اشاعت، سامنے بدھ کے بعد والے بدھ کو الہلال میں درج ہوسکیگی، اور بصورتِ اشاعت اس کا تذکرہ بحوالۂ اخبار شائع کنندہ ہے

آپ کو معلوم نہیں مراسلات وغیرہ الہلال میں ہمیشہ تاخیر سے شائع ہوتے ہیں۔ کئی کئی ایک ایک ماہ کے بعد نکلے ہیں، یہ بدنظمی ہو یا سوءِ قصد، لیکن ایک عام بات ہے۔

مسلم گزٹ تو بالآخر بند ہی ہو گیا لیکن افسوس ہے کہ بے موقع اور بہت ہی بُری طرح۔

مولوی ظفر حسن صاحب کا خط آیا۔ انھوں نے اپنی موجودہ حالت جو بیان کی ہے، مجھے ہمدردی ہے۔ خدا انھیں کامیاب فرمائے! ایسی صورت میں تو واقعی ان کا تشریف لانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ابوالکلام

ے مکتوب کے بیشتر حصّہ میں تذکرہ اسی ناخوشگوار مناظرانہ رنگ کے سلسلۂ مضامین کا ہے اب بات کتنی ہلکی، بلکہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہے، اس وقت مرکزِ اہمیت بنی ہوئی تھی۔

مسلم گزٹ سرکاری عتاب کی زد میں آکر بند ہوگیا تھا۔ سلیم صاحب کے ہٹ جانے کے بعد اس کے اڈیٹر بریلی کے ایک پُرجوش اور دردمند مسلمان، مولوی ابوالکمال عبدالودود درد ہو گئے تھے۔ مولانا شبلی اس کے قبل ہی، اس کی سرپرستی سے دستکش ہو چکے تھے۔

ظفر حسن خاں صاحب کے والد کا دفعۃً انتقال ہو گیا تھا۔ اور وہ اپنی ذاتی و خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھے۔

(۶)

رانچی (بہار)

۱۵ مارچ ۱۹۱۸ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

یاد فرمائی کے لیے ممنون و شکر گزار اور تاخیر کے لیے خواستگار معافی ہوں۔ امید کہ معذرت مقبول ہوگی۔ عثمانیہ یونیورسٹی اگر وجود میں آگئی، تو بلاشبہ موجودہ زمانہ میں ہندوستان کا سب سے بڑا علمی کام ہوگا۔ البتہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، اشخاص کی کمی ہے، اور ضرور ہے کہ کچھ عرصہ تک مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہوں۔ لیکن ابتدا میں کوئی کام بھی بلا انتظار و تدریج متوقع نتائج پیدا نہیں کرتا۔ کام صحیح اور مفید ہونا چاہیے، نقائص رفتہ رفتہ دور ہوجائینگے۔ عدم سے وجود مع النقائص بہر حال بہتر ہے۔ اور اشخاص کے فقدان کا بھی علاج یہی ہے کہ کام ہو۔ آپ نے لکھا ہے کہ سردست صرف معمولی درجہ کی فلسفہ و منطق کی کتابوں کو لکھنا پڑتا ہے، اور اس لیے طبیعت لگتی نہیں۔ لیکن یہ تو ناگزیر ہے، اور ترتیب مبادیات و اوائل کا کام بھی منتہیوں ہی کو کرنا پڑیگا۔ مبتدیوں کے لیے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ اگر آپ کے قیام و تعلق سے عثمانیہ یونیورسٹی نے اتنا ہی فائدہ حاصل کیا کہ ہر فن میں مبادیات کا سلسلہ مکمل ہوگیا، تو کیا یہ کوئی چھوٹا کام ہے؟

آپ نے فلسفہ کے ساتھ منطق کا بھی ذکر کیا ہے۔ منطق میں مولوی نذیر احمد مرحوم کا رسالہ "مبادی الحکمۃ" ہر لحاظ سے بہت عمدہ ہے، اور بیانِ مسائل میں اس درجہ کا ہے کہ ہمارے قدیم عربی نصاب کے ابتدائی رسائل الیساغوجی وغیرہ سے لے کر قطبی تک کا قائم مقام ہوسکتا ہے، اور حسنِ بیان و تعبیر و ترتیب و امثلہ کے لحاظ سے بدرجہا ان پر فائق۔ انگریزی کا حال مجھے معلوم نہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ اس کے بعد کا صرف ایک رسالہ سردست اور مرتب کیا جائے۔ مجوزہ یونیورسٹی میں ہمارے عربی مدارس کی

طرح منطق ابتدا ہی میں نہیں رکھی جائیگی، بلکہ جدید نظامِ تعلیم کے مطابق، ابتدائی سنینِ تعلیم کے گزر جانے کے بعد۔ اور اس وقت کے لیے "مبادی الحکمۃ" بہت اچھی پہلی کتاب ہے۔

لیکن یہ صرف مقدمات و مسائل تک ہے۔ مباحث کے لیے اس کے بعد کی دوسری کتاب تیار کرنی چاہیے۔ متعدّد چھوٹے چھوٹے رسائل مفید ہونگے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "تین چار سال اُدھر شاید بعض غلط فہمیوں کی بنا پر دلوں کی صفائی میں زنگ آگیا تھا"۔ آپ نے دل کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، حال آں کہ ہونا چاہیے مفرد۔ میں آپ کو پوری سچّائی کے ساتھ یقین دلاتا ہوں کہ میرے حافظہ میں کوئی گذشتہ زمانہ ایسا موجود نہیں ہے، جس میں آپ کی جانب سے میرا قلب زنگ آلود رہا ہو۔ دنیا میں باہمی علائق کے تکدّر کے مختلف اسباب ہوا کرتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ اس قسم کا کون سبب پیدا ہوگیا تھا۔ کیا اس پورے زمانہ میں آپ نے کوئی بات میری جانب سے دیکھی یا سنی؟

میں نے تو جب کبھی کوئی بات مولانا شبلی مرحوم یا بعض دیگر حضرات سے نقلاً سُنی، تو خدا شاہد ہے کہ، اس کا کوئی اثر اپنے قلب میں حسبِ عادۃً محسوس نہ کیا۔ بلکہ اس کو کسی ایسے سبب پر مبنی خیال کیا، جو مجھے معلوم نہیں۔ اس طرف سے جناب بالکل مطمئن رہیں۔ میں آپ کے جن اوصاف کا علماً یقین کرتا ہوں، اور جو باعثِ نیازمندی ہوسکتے ہیں۔ جب تک ان میں تغیّر نہ آئے، میری نیازمندی متغیّر نہیں ہوسکتی۔ ایسے تو الحمدللہ مجھ کو کوئی وجہ شکایت نہیں، لیکن اگر ہوتی بھی تو انشاراللہ آپ مجھ کو کبھی شاکی نہ پاتے۔

نہ ثمینِ عشق، بہ کونین صلح کُل کردیم
تو خصم باش و ز ما دوستی تماشا کن

آپ کی توجہ فرمائی بالکل مخلصانہ اور بے لاگ ہے۔ موجودہ حالات میں کہ نظر بند و معتوبِ حکومت ہوں[۹]، آپ کے لیے کوئی وجہ مراسلت نہیں ہوسکتی تھی۔ الّا یہ کہ مخلصانہ و بے غرضانہ لطف و نوازش و مقتضائے خلقِ طبع، اس بات کو محسوس کرتا ہوں اور ممنون و متشکّر ہوں۔

آپ نے جناب مولانا حمید الدین[۱] کا ذکرِ خیر فرمایا ملاقات ہو تو اس دُور افتادہ کا سلام شوق عرض کر دیں۔

معارف آتا ہے۔ نہایت شوق و دلچسپی سے "مکالماتِ برکلے" کا سلسلہ پڑھ رہا ہوں، اور آپ کے حسنِ بیان و قوتِ نقلِ علوم و تسہیلِ مطالب کی تعریف نہیں کرسکتا۔ آپ انشاءاللہ اردو کے لیے وہ کام کرینگے، جو اب تک کسی سے نہیں ہوا یعنی نقلِ علوم۔ سرسیّد مرحوم کے مجمع نے اردو کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں۔ لیکن اس مد میں اب تک کچھ نہیں ہوا۔ حکیم عباری[۱] صاحب تصوّراتِ کلّیہ بھی اس بارے میں اتنی ہی مدح کے مستحق ہیں، جس قدر کہ آپ ؎

فقیر ابوالکلام

؎ الہلال مدت ہوئی بند ہوچکا ہے۔ اور مولانا اب عرصہ سے رانچی (صوبہ بہار) میں نظر بند ہیں۔

پہلی جنگ عظیم ابھی جاری ہے۔

مکتوب الیہ یکم ستمبر ۱۹۱۷ء سے حیدر آباد آگیا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی ابھی باقاعدہ نہیں کھلی ہے۔ لیکن اس کا مقدمۃ الجیش سررشتۂ تالیف و ترجمہ مولوی عبدالحق صاحب (جو بابائے اردو کے نام سے مشہور ہیں) کی نظامت میں قائم ہوچکا ہے۔ اور مکتوب الیہ کے سپرد شعبۂ فلسفہ و منطق ہے۔

۱۳ء میں جو تلخ و تند مباحثہ الہلال کے صفحات میں مجنس اصطلاحات کے پیچھے ہو پڑا تھا، اب مکتوب الیہ

(۷)

۱۶ مارچ ۱۹۱۸ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

کل خط بھیج چکا ہوں لیکن ایک غلطی ہوگئی جو آپ کو حیران کردیگی ۔ کل ایک خط بمبئی کے ایک تاجرِ کتب کے نام بھی لکھا تھا۔ اور اس کو فہرست کی قیمت ۵ر بھیجی تھی۔ غلطی سے ۵ر کے ٹکٹ آپ کے خط میں رکھ دیے گئے اور اس کا خط یہیں پڑا رہا حیران ہونگے کہ یہ ٹکٹ کیوں بھیجے گئے ۔؎

فقیر ابوالکلام

کو اس پر ندامت و تاسف تھا۔ اور اپنے خط میں مولانا سے معذرت کی تھی ـــــ مولانا نے جواب میں جو شرلیفانہ انداز اختیار کیا، اور لطف و نوازش کی جو بارش کی، اس سے مکتوب الیہ پانی پانی ہوگیا۔

ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں مکتوب الیہ کے قلم سے، انگلستان کے فلسفی بشپ بارکلے کے مکالمات Dialogues کا ترجمہ نکل رہا تھا۔ مولانا نے حوصلہ افزائی اس کی فرمائی ہے۔

مولانا حمید الدین صاحب فراہی اعظم گڑھی (صاحبِ تفسیر القرآن عربی)، اس وقت تک حیدرآباد میں دارالعلوم کالج کے صدر تھے۔

عباری سے مراد ہیں مولانا عبدالباری ندوی۔ وہ اور میں فلسفی بارکلے کے مکالمات کو اردو میں معارف کے صفحات میں لا رہے تھے، "تصوراتِ کلیہ" کے عنوان سے۔

؎ ظاہر ہے کہ یہ مکتوب نمبر (۶) کا محض ضمیمہ ہے۔

(۸)

۲۷ جنوری ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یاد فرمائی کا شکریہ۔ یہ آپ نے خوب کیا کہ حیدرآباد سے کنارہ کش ہوگئے۔ اوّل تو علمی زندگی ملازمت کے ساتھ نبھ نہیں سکتی پھر ملازمت بھی دیسی ریاستوں کی، اور ریاست بھی حیدرآباد جیسی ساز شکدہ۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا ابھی نیا نیا غلغلہ ہے۔ چند دنوں کے بعد دیکھیے گا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ آپ نے اپنی ایک تصنیف کا ذکر کیا تھا۔ غالباً اس سے فارغ ہوچکے ہونگے۔

یہ تکفیر کا معاملہ بہت ہی دلچسپ رہا۔ مجھ کو امید نہ تھی کہ آپ اس قدر جلد مسلمان ثابت ہوجائینگے، اگرچہ کفر کا مقام اس سے ارفع ہے۔

کافر نتوانی شد لاچار مسلمان شو[12]

امید ہے کہ آیندہ آپ اس طرح کے علائق سے آزاد و کنارہ کش رہینگے۔ اور آزادانہ و خود مختارانہ اپنے اشغال میں منہمک و مستغرق۔ اگر ایسی زندگی میسّر آئے، تو اس سے بہتر و کامیاب زندگی کوئی نہیں ہے

ابوالکلام

ے مولانا ابھی تک بدستور رانچی میں نظربند ہیں۔

مکتوب الیہ تقریباً ایک سال کی مدّت پوری کر کے حیدرآباد سے لکھنؤ واپس چلا آیا ہے۔ اور ملازمت سے استعفا دے دیا ہے۔ مکتوب الیہ کا دل حیدرآباد کے شاہی ماحول میں بالکل نہ لگ سکا تھا، وہاں کے بہت سے بزرگوں، دوستوں، عزیزوں کی انتہائی خاطرداریوں کے باوجود۔ مکتوب الیہ کی ایک کتاب "نفسیاتِ اجتماعی" کے موضوع پر دو تین سال قبل کی چھپی ہوئی تھی۔ اس میں مذہب پر جابجا حملے تھے۔

(۹)

۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء

صدیقی العزیز! السلام علیکم

مدّت کے بعد آپ کا خط آیا۔ خوش وقت فرمایا۔ "تذکرہ"[۱۳] کوئی ایسی چیز نہ تھی جو خصوصیت کے ساتھ شائع کی جاتی۔ ایک صاحب نے بطورِ خود شائع کر دیا۔ بوجوہ اس کی اشاعت میرے لیے خوش آیند نہ ہوئی[۱]۔

"حقیقت" کے کئی نمبر آچکے ہیں۔ آپ کے خط کے بعد خصوصیت سے میں نے دیکھا۔ بلا تامّل کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت یہ سب سے اچھا ویکلی[۱۴] اُردو اخبار ہے۔ اگر استقلال کے ساتھ جاری رہا اور مذاقِ عوام کی پیروی نہ کی گئی تو یہ ایک بڑی ضرورت پوری کریگا۔

(اور خود الہلال پر بھی جابجا چوٹیں تھیں) حیدرآباد میں اس پر ایک ہنگامۂ تکفیر برپا ہوگیا تھا۔ مکتوب الیہ انگریزیت کے اثر سے واقعۃً اس وقت "عقلیت" اور الحاد میں مبتلا تھا۔ از سرِ نو مسلمان اس کے ایک عرصہ کے بعد ہوا۔

۱؎ "تذکرہ" سے مراد خود مولانا کی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب "تذکرہ" ہے۔ نئی نئی شائع ہوئی تھی۔ اور اس کا بڑا غلغلہ تھا۔ مکتوب الیہ نے اسے کہیں پڑھ کر اس پر اپنی رائے لکھ بھیجی تھی۔

۲؎ مکتوب الیہ اب لکھنؤ میں ہے اور آزاد ہے۔ مولوی ظفر الملک علوی کاکوروی مرحوم کی شرکت سے اور اپنی نگرانی میں اس نے ایک ہفتہ وار پرچہ "حقیقت" نامی شروع کرایا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد ظفر الملک مرحوم اور مکتوب الیہ دونوں اس سے الگ ہوگئے اور پرچہ تمام تر انیس احمد صاحب عبّاسی کے ہاتھ میں آگیا جس زمانہ میں مولانا نے یہ داد لکھ کر بھیجی ہے، مکتوب الیہ ہی کی نگرانی میں نکلتا تھا۔

آپ نے لکھا ہے کہ تعطّل کا زمانہ کیوں نہ تمدّنی اصلاحات[۱] کی سعی میں بسر کیا جائے؟ لیکن زمانۂ تعطّل کی قید کیوں؟ یہ کام تو ایسا ہے کہ بڑی بڑی طاقتور کارکن زندگیوں کو وقف ہو جانا چاہیے۔ جس چیز کو لوگ سیاسی اصلاح و ترقی کہتے ہیں، وہ بھی دراصل تمدّنی اصلاحات و ترقیات کی ایک خاص مجتمعہ حالت ہی سے عبارت ہے۔ سیاستِ مصطلحہ کا اس سے باہر کوئی وجود ہی نہیں۔ اور جس قدر بھی جماعتی مطلوبات ہیں، بغیر درستگیِ علم و عملِ افراد و حصولِ حقوقِ معاشرت و مدنیتہ ممکن نہیں۔ بہرحال ایسا ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن آپ نے جس مسئلہ کی نسبت لکھا ہے، وہ صرف پنجاب و بمبئی کی بعض اقوام سے تعلّق رکھتا ہے۔ یعنی مسئلۂ توریث میں رواج اور ہنود[۱۵] ولا پر عمل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل پیشِ نظر ہوں، تو تحریر فرمائیے۔ میں "حقیقت" کے لیے ضرور لکھونگا۔ مولانا سیّد سلیمان[۱۶] صاحب دو بار لطف فرما چکے ہیں۔ انجمن کے جلسہ کے موقع پر بھی تشریف لائے تھے۔ آپ کی ملاقات کی یاد آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیاں گزر گئیں۔

ابوالکلام رانچی ۲۶ نومبر ۱۹۱۹ء

(۱۰)

رانچی ۳ جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز!

مسئلہ توریث میں یوپی کے مسلمانوں کا حال معلوم نہ تھا، آپ کے خط سے معلوم ہوا۔

---

۱۵ مکتوب الیہ نے یہ بھی لکھا تھا کہ سیاسی کام سے تو آپ کی معذوری ظاہر ہے۔ لیکن مسلمانوں کے اور اصلاحی کام تو اس وقت بھی آپ کر سکتے ہیں۔

مکتوب الیہ کی شدّتِ الحاد باقی نہیں رہی تھی، اور اب وہ اسلام سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔

جن مفاسد کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ اور اسی طرح کے بے شمار مفاسد ہیں، جن کی اصلاح مقدم ترین امور سے ہے۔ لیکن اس کے بارے میں سب سے پہلا سوال طریقِ اصلاح کا ہے۔ کسی جماعت کے رسوم و عوائد اور صدیوں کی مالوفات میں تبدیلی پیدا کرنا ایک ایسا کام ہے، جو صرف بحث و نظر سے کامیاب نہیں ہوسکتا یعنی محض دلائل و معلومات کی اشاعت اس کے لیے سُود مند نہیں ہوسکتی۔ جہاں تک تعلّق احساس واعترافِ مفاسد اور معلوماتِ مانعہ کا ہے، بہت کم تعلیم یافتہ آدمی ایسے نکلینگے، جو ان سے بیخبر ہوں، یا ضرورتِ اصلاح سے اختلاف رکھتے ہوں۔ تاہم یہ طاقت کسی میں نہیں ہے کہ عملاً اپنے اندر تبدیلی پیدا کرے، اور داعیات و بواعثِ مفاسد کا عزم و ہمّت سے مقابلہ کرے۔ آپ جانتے ہیں کہ تمام فضائلِ عملیہ کا یہی حال ہے۔ مجرّد بحث و نظر سے یہ مرحلہ نہ کبھی طے ہوا ہے، نہ ہوگا۔ مفاسدِ معاشرت میں بڑا حصّہ ایسے رسوم و اعمال کا ہے، جو شرعاً بھی داخلِ اشد معاصی و فسق، اس لیے کم سے کم ان کے لیے تو علمار و مشائخ کو ضرور سعی کرنی چاہیے۔ مگر جو حال علمار کا ہے، آپ کو معلوم ہے۔ علمار، غیر علمار سے نفسِ معلومات میں ممتاز ہیں، عمل میں نہیں۔ مفاسد کے دواعی و ترغیبات جس طرح عوام کے لیے قہر و تسلّط رکھتی ہیں، ان کے لیے بھی۔ اس لیے باوجودِ علم، وہ خود بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔

ضرورت اس کے لیے دو باتوں کی ہے۔ ایک توسعیِ اصلاح کے ساتھ ساتھ دفع و انسدادِ دواعی و ترغیبات کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ان محرکات کا دفعیہ نہ ہوگا، جو مفاسد کے لیے باعث ہیں، مجرّد ترک و منع کی دعوت سُود مند نہیں ہوسکتی۔ آپ لوگوں سے کہتے ہیں۔ گرد و غبار سے بچو اور سڑک پر چھڑکاؤ کا انتظام نہیں کرتے۔ ثانیاً ایک ایسی جماعت کا وجود، اور منظرِ عام پر آجانا، جو عملاً اصلاح کا نمونہ ہو اور اصلاح کا وجود خارج میں مجسّم و ممثّل دکھا دے۔ چند عازم انسانوں کا فعلِ نفوذ،

اخبارات کے سیکڑوں آرٹکلوں سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت بھی اصلاح و تعمیر کے چند ممتاز خصائص کے ساتھ قائم ہو جائے تو چند سالوں کے اندر تمام قوم کی حالت بدل جائے، علی الخصوص انگریزی تعلیم یافتہ جماعت جس میں احساسِ حال اور طلبِ اصلاح کی استعداد سب سے زیادہ موجود ہے۔

آپ تصنیف و تالیف میں علم اور سعی و عمل میں اصلاحِ معاشرت ــــــ ان دو چیزوں کو اپنا مطمحِ نظر بنائیے۔ پہلی بات تو موجود ہے، دوسری کے لیے بھی آمادہ ہو جائیے۔ اپنے تعلیم یافتہ احباب میں سے چند عزمِ صادق رکھنے والے اشخاص منتخب کیجیے۔ اور ایک انجمن قائم کیجیے۔ ابتدا میں صرف دو چار نہایت ضروری اور بنیادی باتیں لے لی جائیں، اور صرف ان لوگوں کو شریک کیا جائے، جو ان پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہوں، اور تمام موانع کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ کوئی ایسی جماعت وجود میں آجائے، تو پھر اخبارات کے مباحث مفید ہو سکتے ہیں، ورنہ مجرد مضامین نویسی سے اردو میں معاشرتی مباحث کا ایک نیا لٹریچر فراہم ہو جائیگا، عملاً اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لوگوں کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی دعوت دینا جس کے خصائص و اعمال کا ذہن سے باہر کوئی وجود نہیں، معاشرت کا فلسفہ ہے، اصلاحِ معاشرت نہیں ہے[1]

تاہم مقصود یہ نہیں کہ مضامین نہ لکھے جائیں۔ ان کی ضرورت سے انکار نہیں۔ بہر حال بہتر ہے۔ "حقیقت" کے لیے ضرور لکھونگا۔ لیکن براہِ عنایت حاجی بغلول اور تجاہلِ عامیانہ وغیرہ کو تو رکوائیے، یہ کیا مصیبت ہے۔ اگر یہی حال رہا تو وہی "ہمدرد" وغیرہ کا حال ہو کر رہ جائیگا۔[2]

---

[1] اس طرح کے مکتوب سے مولانا کے اصولِ زندگی کے بہت سے گوشوں پر خوب روشنی پڑجاتی ہے۔

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

والسّلام علیکم۔ دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے!

ابوالکلام

(۱۱)

کلکتہ

۲۷ جنوری ۱۹۲۰ء

صدیقی العزیز!

آپ کا خط رانچی میں ملا تھا۔ معافی خواہ ہوں کہ جواب میں تاخیر ہوئی[1]۔ کلکتہ میں ایک ہی دن قیام کر سکا۔ پھر دہلی چلا گیا۔ اب واپس آیا ہوں۔ خط میں آپ نے اپنی علمی خدمات کے ساتھ عملی اقدام کے لیے بھی جو مستعدی ظاہر فرمائی ہے، اس سے طبیعت نہایت درجہ مسرور ہوئی۔ کاش اس کا جلد ظہور ہو! ہمراہیوں کا انتظار بےسود ہوگا۔ سب سے پہلا اور سب سے بہتر رفیق خود اپنا ارادہ اور یقین ہے۔ آپ نے مسٹر محمد علی کی شعلہ بیانی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، بالکل متفق ہوں اور اتنا اس پر اضافہ کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اپنی ہتھیلی کے لیے انگاروں ہی کو منتخب کرتا ہے، تو خیر، یہ بھی ایک راہ ہے، بشرطیکہ جلد پھینک نہ دے۔ بہرحال وہ ایک بڑی آزمائش سے کامیاب نکلے ہیں، اور ان کی بڑی سی بڑی اور زیادہ سے زیادہ عزت کے لیے یہ بس کرتا ہے[2]۔

پچھلے کا بقیہ

[3] ''حقیقت''، سے مکتوب الیہ کا تعلق ختم ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں عام پسند ظرافت و مزاح کے خاصے عنوانات اب ہونے لگے تھے۔

[1] مولانا اب رہائی پا کر کلکتہ پہنچ چکے ہیں۔

[2] مولانا محمد علی و شوکت علی کو بھی ۱۹۱۹ء کے آخر میں قید و بند سے رہائی مل گئی تھی۔ اور مولانا محمد علی نے جیل سے باہر آتے ہی اس وقت کے معیار سے تیز و تند تقریریں شروع کر دی تھیں۔

دیکھیے آپ سے کب ملاقات ہوتی ہے! رانچی میں نہیں، تو کلکتہ میں تو آپ آسکتے ہیں!

ابوالکلام

(۱۲)

ری ٹریٹ

شاہی باغ۔ احمد آباد

۲۹ جون ۱۹۲۴ء

صدیقی العزیز! السّلام علیکم

سفر سے واپس کلکتہ پہنچا، تو آپ کا خط ملا۔ لیکن ہجوم کار نے مہلت جواب نہ دی۔ پھر دہلی اور احمد آباد کا سفر پیش آیا۔ ڈاک رکھ لی تھی کہ جہاں کہیں مہلت ملیگی، جواب لکھونگا۔ امید ہے، اس تاخیر کو معاف فرمائینگے[1]

آپ نے مولوی طفیل احمد[18] صاحب کی نسبت دریافت کیا ہے کہ میں نے ان سے جوازِ سود کے باب میں کوئی گفتگو کی ہے؟ جہاں تک میرا حافظہ کام دیتا ہے، مجھے یاد نہیں، مولوی صاحب موصوف سے کبھی اس باب میں کوئی گفتگو ہوئی ہو، بلکہ شاید ان سے ملاقات بھی کبھی نہیں ہوئی میں نہیں کہہ سکتا: کیوں انھیں ایسا خیال ہوا۔ غالباً اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے ان کے نام کے ساتھ "صاحب

---

[1] ملک میں ترکِ موالات وخلافت وغیرہ تحریکات کا غلغلہ برپا ہے۔ بلکہ ابتدائی جوش اب دھیما پڑ چکا ہے۔ مولانا کا شمار اب آل انڈیا سیاسی لیڈروں میں ہے۔ اور مسلسل سفر اور دورہ اس کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ اس افراطِ مشغولی کے باوجود، علمی بحثوں کے لیے بھی مولانا وقت وفرصت نکال لیتے ہیں۔

جوازِ سود[1]" لکھا ہے۔ کیا اس سے مقصود کوئی ان کی مصنفہ کتاب ہے؟

باقی رہا اصل مسئلہ، تو جہاں تک قرآن اور اسلام کا تعلق ہے، نفسِ ربا کی حرمت میں تو گنجایش قیل و قال نہیں۔ فَاذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُولِهٖ[19]۔ البتہ ربا کے تعین و تشریح میں، متعدد فقہی مباحث اور مذاہب و آرا ہیں۔ جنھیں فقہ و حدیث کی کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اوائلِ حکومتِ انگریزی سے ایک بحث یہ بھی شروع ہوگئی ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے، یا دار الاسلام؟ اگر دار الحرب ہے، تو فقہاء کا قاعدہ ہے: لا ربا بین الحربی والمسلم یعنی دار الحرب میں مسلمان اور حربیوں کا معاملہ ربا نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک حربی کی قید بھی زائد ہے۔ پس اس بنا پر متعدد علماء کی رائے یہ رہی ہے کہ ہندوستان کی موجودہ پولیٹکل حالت میں مسلمان غیر مسلم سے سود لے سکتے ہیں۔ مولوی عبداللہ[20] مرحوم ٹونکی اور مولانا شبلی مرحوم کی یہی رائے تھی۔ مولانا شبلی مرحوم نے اس پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا، اور ندوۃ العلماء کی کونسل کے علماء کے سامنے پیش کیا تھا، غالباً ان کے مسودات میں ہوگا۔

پھر دار الحرب کے شروط میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے دوسری ہے، صاحبین[21] کی دوسری ہے۔ پھر بعض کے نزدیک ایک ملک دار الاسلام ہو کر دار الحرب ہو جا سکتا ہے، بعض کے نزدیک نہیں۔

حقیقت ان اختلافات سے بالاتر ہے۔ اور دار الحرب میں جوازِ اخذِ سود کی جو تعلیل کی گئی ہے، وہ بھی محلِ نظر ہے۔ صحیح تعلیل دوسری ہے۔ اگر ضرورت ہوئی، اور مہلت ملی، تو اس باب میں غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

ابوالکلام

---

[1] "جوازِ سود"، مولوی سید طفیل احمد مرحوم کے ایک رسالہ کا نام تھا۔ اللہ ان مرحوم کی لغزشیں معاف فرمائے، بیچارے کو دھن ہو گئی تھی، مسلمانوں میں ترویجِ سود کی۔

(۱۳)

کلکتہ

۲۶ اکتوبر ۲۶ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

خط پہنچا، دہلی سے واپس آکر دو ہفتہ تک مبتلائے بخار و تپش رہا۔ اس وقت تک طبیعت بحال صاف نہیں ہے۔ جہاں تک مسئلہ حجاز[1] کا تعلق ہے، جو کچھ ہو رہا ہے تمامتر افراط و تفریط ہے بڑی مصیبت یہ پیش آگئی ہے کہ مسئلہ دینی احکام و مصالح سے ممزوج ہو گیا ہے۔ اور جو لوگ اس جھگڑے میں ہیں، انھیں ان کی خبر نہیں۔ ذاتی کاوشیں اور جماعت بندی کا جذبہ ایک مزید آفت ہے۔ مسئلہ پر لوگوں کی تقسیم حقیقت کی بنا پر نہیں، بلکہ محض پارٹی کی بنا پر ہوتی ہے۔ مختلف حالات و اسباب ایسے ہیں کہ اصلاح حال کی امید بہت ہی کمزور ہے الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔

لکھنؤ میں جلسے کے موقع پر آنا ہی پڑیگا، اگرچہ سرے سے یہ جلسہ ہی بیکار ہے[2]۔ ممکن ہے جلسہ کی تاریخیں بدل دی جائیں۔ لوگوں کو اعتراض ہے کہ دہلی میں جلسہ صرف اس لیے قرار دیا

---

[1] مولانا اس وقت تک آل انڈیا خلافت کمیٹی کے صدر تھے اور کمیٹی کے اندر مسئلہ حجاز کے باب میں ایک عجیب خلفشار برپا ہو گیا تھا۔ علی برادران اور حضرات فرنگی محل و بدایوں وغیرہ سلطان عبدالعزیز بن سعود کے شدید مخالفوں میں ہو گئے تھے۔ اور ظفر علی خان صاحب اور اہلحدیث جماعت کے حضرات ان کے اسی شدید درجے میں حامی اور حمایتی تھے۔ مکتوب الیہ اودھ خلافت کمیٹی کا صدر تھا۔

[2] جس جلسے کا ذکر ہے وہ مرکزی خلافت کمیٹی کا ہو رہا تھا جس میں شدید جنگ اور زور آزمائی کا خطرہ تھا۔ رپورٹ سے مراد اس وفد خلافت کی رپورٹ ہے جو ۱۹۲۶ء میں حج کے موقعہ پر جاکر سلطان سے ملا تھا۔ اس کے ارکان مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی تھے۔

گیا تھا کہ رپورٹ وفد چھپ کر شائع ہو جائے اور ممبروں کو مطالعہ و نظر کا کافی وقت ملے۔ لیکن رپورٹ اس وقت تک تقسیم نہ ہو سکی۔ غالباً آج بمبئی سے روانہ ہوئی ہو گی۔ میں نے شوکت صاحب[۲۲] کو لکھا ہے کہ جلسہ ۱۵ نومبر یا دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو۔ غالباً ۱۵ نومبر قرار پائے۔ بہرحال امید ہے آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔ قیام غالباً نواب[۲۳] علی حسن صاحب ہی کے یہاں ہو۔ لیکن میں تو آپ کے یہاں ٹھہروں، اگر آپ ٹھہرائیں۔

مولوی عبدالرزاق[۲۴] صاحب کا ادھر کئی ہفتہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ مجھے ان کی صحت کی طرف سے برابر تشویش رہتی ہے۔ اگر ممکن ہو، تو ملیے اور خط لکھنے کے لیے کہیے۔ مولوی ظفر الملک صاحب[۲] ملیں تو سلام شوق۔

ابوالکلام

(۱۴)

کلکتہ

۲۹ اکتوبر ۲۶ء

حبی فی اللہ! السلام علیکم

ایک خط بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا، شاید مجوزہ تاریخوں میں جلسہ کا انعقاد ملتوی

---

۱ ؎ نواب علی حسن خان (صفی الدولہ حسام الملک) مرحوم، مشہور اہلِ حدیث فاضل، نواب صدیق حسن خان قنوجی بھوپالی کے صاحبزادے، خود بھی صاحبِ علم رئیس تھے۔ ندوہ اور مولانا شبلی کے شیدائی، کوٹھی بھوپال ہاؤس، واقع لال باغ میں رہتے تھے۔

۲ ؎ مولوی ظفر الملک اس وقت خلافت کے کارکنِ خصوصی تھے، مولانا نے از خود مکتوب الیہ کے ہاں قیام فرمانے کا ذکر فرمایا۔ یہ دلیل ان کے کمالِ شفقت و عنایت کی ہے۔

ہو جائے۔ چنانچہ ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوگا۔ التوا کا باعث یہ ہوا کہ تقریباً ان ہی تاریخوں میں ہر جگہ کونسل کے انتخابات کی کشمکش درپیش ہے۔ مرکزی کے ممبروں میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو انتخابات میں مشغول ہیں، خصوصاً بنگال اور پنجاب کے ممبر۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ ہماری شرکت ممکن نہیں۔ علاوہ بریں رپورٹ وفد حجاز کی اشاعت میں بھی تاخیر ہو گئی۔ یہ تاخیر قصداً نہیں ہوئی، ناگزیر تھی، رپورٹ ضخیم ہے۔ باوجود سعی ۲۶ سے پہلے مکمل نہ ہو سکی۔ ایسی حالت میں یہی مناسب تھا کہ تاریخیں بدل دی جائیں۔ پیشتر ہی سے کافی نزاعات موجود ہیں۔ اب محض تاریخ انعقاد کا معاملہ مابہ النزاع کیوں بنا دیا جائے۔ نومبر میں انتخابات کی کشمکش ختم ہو جائیگی۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں باطمینان جلسہ ہو سکیگا۔ آپ لوگوں نے لکھنؤ میں جلسہ کا اہتمام کیا تھا۔ ممکن ہے اس تاخیر کی وجہ سے کارکنوں کو بیلطفی ہو۔ لیکن اُمید ہے دسمبر کا اہتمام اس کی تلافی کر دے۔

افسوس ہے کہ زمیندار اور ہمدرد کی نزاع[1] کسی طرح ختم ہونے پر نہیں آتی۔ پچھلی دفعہ جب شروع ہوئی تھی تو میں نے بہت کوشش کی کہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب سے تو دہلی میں قول و قرار کرا لیا تھا کہ وہ مولانا محمد علی کے خلاف کچھ نہ لکھیں۔ چنانچہ سلسلہ رُک گیا تھا۔ مگر اب پھر شروع ہو گیا ہے۔ اور بڑھتا ہی جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تحریک کا جو کچھ بھی رہا سہا اثر عوام میں باقی تھا، وہ بھی اُمید نہیں کہ قائم رہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۲۰ء سے پہلے مسلمانانِ ہند میں جس قدر جماعتی قویٰ کا نظم اور دماغی انضمام تھا، اُتنا بھی اب نہیں ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس ردِ فعل کا، جو ۲۰ء کی حرکت کے بعد ظہور میں آیا۔ اب مسلمانوں کی دماغی و اجتماعی تالیف و تنظم کے لیے از سرِ نو دعوت و

---

[1] ہمدرد (دہلی) سے مراد مولانا محمد علی کا روزنامہ ہے اور زمیندار (لاہور) سے مراد مولانا ظفر علی خان کا۔ وہی سعودی نزاعات دونوں میں زور شور سے جاری تھے۔

تحریک کی ضرورت ہے۔
مولوی عبدالرزاق[۲] اور مولوی ظفرالملک صاحب ملیں تو سلام پہنچا دیں۔ آپ کے اخبار
سچ[۱] کا اب کیا حال ہے؟ کتنی اشاعت ہے؟ ممکن ہو تو تفصیلات سے مطلع کریں۔

ابوالکلام

(۱۵)

کلکتہ

۱۳ نومبر ۲۹ء

صدیقی!

آپ کا رجسٹرڈ خط دہلی سے واپس ہو کر یہاں ملا۔ سچ میں آپ نے جس کتاب[۳] کا ذکر کیا ہے،
میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ نے جو اقتباسات پیش کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ
مصنّف کو تاریخ اسلام کے مبادیات تک معلوم نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس کے مترجم کون
صاحب ہیں اور کیوں انھوں نے یہ کتاب ترجمہ کے لیے منتخب کی۔ اگر مقصود یہ تھا کہ ایک
مخالف کا نقطہ نظر واضح کیا جائے، تو ضروری تھا کہ مقدمہ میں اس کی تصریح کی جاتی اور

۱ـ سچ، صدق کا نقشِ اول تھا، اور اس وقت تک مولوی ظفرالملک کے اہتمام میں نکل رہا تھا۔

۲ـ مولوی عبدالرازق ندوی ملیح آبادی تو مولانا کے سلسلے میں ایک معروف شخصیت رکھنے والے تھے۔

۳ـ جس کتاب کا ذکر ہے وہ ہیل (HELL) کی کتاب کا ترجمہ تھا۔ جو "عربوں کا تمدن" کے عنوان سے جامعہ ملیہ (دہلی) کے ایک استاد کے قلم سے اردو میں شائع ہوا تھا۔ اور سچ نے اس پر شدید گرفت کی تھی۔

جابجا فٹ نوٹس[۲۶] بڑھائے جاتے۔ مصیبت یہ ہے کہ یا تو لوگوں کو کام کا شوق نہیں ہوتا، ہوتا ہے، تو نظر و امتیاز میسّر نہیں۔ یورپ کی زبانوں خصوصاً جرمن میں اسلامی تاریخ و علوم کے متعلق مفید چیزیں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے نئے مترجموں کو صرف ایسی ہی کتابیں مل سکتی ہیں۔
لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا، آپ نے اسے جامعہ کے کارنامہ سے کیوں تعبیر کیا! اس قسم کے اخبار نویسانہ مبالغوں سے بحث و نقد کی وقعت اور سنجیدگی کو صدمہ پہنچتا ہے۔ اگر جامعہ کے کسی پروفیسر نے ایک غلط کتاب ترجمہ کے لیے منتخب کی، یا اس کے نقد و تبصرہ میں کوتاہی کی، تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ بحیثیت ایک مترجم کے اسے مخاطب کرنا چاہیے۔ جامعہ کے کارناموں کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

(۱۶)

۲۲ پرتھوی راج روڈ، نئی دہلی

۱۱ فروری ۱۹۴۴ء

جناب محترم! تسلیم

آپ کا تحفہ[۷] حضرت مولانا کو پہنچ گیا۔ اس کے لیے وہ شکر گزار ہیں۔ مکتوب گرامی بھی موصول ہوا۔

ترجمان القرآن (جلد اوّل) زمزم کمپنی لمیٹڈ، لاہور میں چھپ رہی ہے۔ وہ غالباً ہفتہ عشرہ میں

---

۷ یقیناً میں نے اپنی کوئی کتاب تحفۃً پیش کی ہوگی، اسی کا یہ جواب ہے اور مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں بھی ضرور دریافت کیا ہوگا۔

پریس سے نکل جائیگی۔ اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

نیاز مند:

محمد اجمل خاں سیکریٹری مولانا آزاد

(۱۷)

۱۷/۸۰

آل انڈیا کانگریس کمیٹی

سوراج بھون۔ الہ آباد

۱۹ جولائی ۴۵ء

صدیقی!

شملہ سے واپس آکر یہاں کی ڈاک دیکھی، تو آپ کا کارڈ[۵] ملا۔ ایک مدّت کے بعد ایک عزیز کی صورت دیکھ کر جو خوشی ہوتی ہے، وہ آپ کا کارڈ دیکھ کر ہوئی شکرگزار ہوں اور دُعا کرتا ہوں۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۱۸)

۱۹۔ اکبر روڈ، نئی دہلی

یکم اپریل ۱۹۴۸ء

جنابِ محترم! تسلیم

آپ کا خط حضرت مولانا کو ملا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۵ اپریل کو آپ مندرجہ بالا پتے پر ۱۲ بجے

---

۵ اب بالکل ذہن میں نہیں کہ اس کارڈ کا مضمون کیا تھا۔

تشریف لائیں اور لنچ بھی نوش فرمائیں[1]

راقم:

محمد اجمل خاں

(۱۹)

۲۲ مئی ۴۸ء

صدیقی!

خط مورخہ ۷ مئی پہنچا۔ جس معاملہ کی نسبت آپ نے لکھا ہے وہ پیشِ نظر ہے۔ ہر بات اپنے مناسب وقت ہی پر انجام پا سکتی ہے اور انشاء اللہ انجام پائیگی۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] آل انڈیا ریڈیو کی مرکزی اردو کمیٹی کا میں ممبر تھا اور اس کے جلسہ میں شرکت کے لیے ۵ اپریل ۴۸ء کو جانا ہو رہا تھا ـــــ اجمل خاں صاحب کا دوسرا دستی احتیاطی خط ۵ اپریل کو کمیٹی کے عین دفتر میں بھی اسی مضمون کا موصول ہوا تھا۔

میں تو اپنی کتابیں مولانا کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا۔ اُدھر سے بھی ایک بار "غبارِ خاطر" کی جلد عنایت ہوئی۔ اس کے ساتھ کوئی عنایت نامہ بھی ضرور ہوگا۔ لیکن وہ مجموعہ میں ملا نہیں۔

[2] اب مولانا وزیرِ تعلیمات سرکارِ ہند ہیں۔ غالباً ندوہ یا دار المصنفین ایسے ہی کسی ادارے کی سرکاری امداد کی تحریک کی گئی تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالیؔ[۱] کے نام

خواہی کہ بتو بیش شود شوقِ نظیری
از پیش خودش گاہ براں گاہ نگہ دار[۲]

یاجناب الجلیل الاعز، انعم اللہ علی بقائکم

دفتر سے معلوم ہوا کہ "الہلال" کے جو پرچے خدمتِ عالی میں جاتے ہیں بجنسہٖ واپس آجاتے ہیں۔ ایک پرچہ میں نے بھی دیکھا۔ اس پر لکھا تھا کہ مکتوب الیہ کو لینے سے انکار ہے۔

میرے دلِ عقیدت کیش کے لیے تو اتنی نسبت بھی بہت ہے کہ آستانۂ مبارک تک "الہلال" پہنچے اور محروم واپس آئے۔ تاہم اس بے التفاتی کا سبب معلوم کرنے کے لیے بیقرار ہوں۔

میں نے پیشتر ہی عرض کر دیا تھا کہ حاضری سے ارادت کیشوں کو نہ روکیے، ردی کی ٹوکری میں تو آخر جگہ مل ہی سکتی ہے۔

جب کبھی کلکتہ سے نکلتا ہوں، تو ارادہ کرتا ہوں کہ آستانۂ مبارک پر قدمبوسی

کے لیے حاضر ہوں۔ لیکن محرومی پہنچنے نہیں دیتی۔ شاید اواخرِ دسمبر میں پانی پت حاضر ہوں، گو ڈرتا ہوں کہ "الہلال" کی طرح میری دلی عقیدت کی قبولیت سے بھی انکار ہو۔[۱]

---

[۱] مولینا نے 'الہلال' ان کی خدمت میں اعزازی جاری کیا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم ہر پرچے پر یہ لکھ کر واپس فرما دیتے کہ مکتوب الیہ لینے سے انکاری ہے، اس لیے کہ وہ خود پڑھ نہیں سکتے تھے، اور یہ گوارا نہیں تھا کہ پرچہ بھیجنے والے کو خواہ مخواہ نقصان ہو۔ مولانا نے اصرار کیا تو پھر "الہلال" کو خواجہ صاحب نے قبول فرما لیا۔ اور دوسروں سے پڑھوا کر سن لیا کرتے تھے۔ یہ مکتوب ۱۹۱۲ء کا ہے (مہر)

غلام رسول مہؔر کے نام

(۱)

رجب ۱۳۳۱ھ (مئی ۱۹۱۳ء)

عزیزی الاعز ثبتنا و ایاکم جادۃ العلم والعمل

آپ کے دونوں[٥] خط پہنچے۔ میں سفر میں رہا اور خط لکھنے کی بالکل مہلت نہیں ملی۔ آج صبح سے اسی کام میں مصروف ہوں۔

---

٥ یہ پہلا نہیں، دوسرا مکتوب گرامی ہے، جیساکہ دوسرے پیرے کے پہلے فقرے سے ظاہر ہے۔ افسوس کہ پہلا مکتوب ضائع ہوگیا۔ پہلی جنگِ یورپ کے دوران میں مولانا کو صوبۂ بنگال سے اخراج کا حکم ہوا تھا (۲۳۔ مارچ ۱۹۱۶ء) اور وہ کلکتہ چھوڑ کر رانچی (صوبۂ بہار) چلے گئے۔ وہاں انھیں نظربند کردیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے۔ ان کے بیشتر کاغذات قبضے میں لے لیے گئے تھے، انھیں کاغذات میں جماعت "حزب اللہ"[٢] کا رجسٹر بھی تھا جس میں تمام ارکانِ جماعت کے نام اور پتے درج تھے۔ چنانچہ ہر صوبے کی خفیہ پولیس نے اپنے ہاں کے ارکان کا تعاقب شروع کردیا۔ میں بھی "حزب اللہ" کا رکن تھا۔ پولیس نے میرے متعلق بھی چھان بین شروع کردی۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ عزیزوں نے مولانا کے متعلق میرے تمام کاغذات اور "الہلال" کے ضبط شدہ پرچے بہ نظرِ احتیاط زمین میں دفن کردیے۔ خاتمۂ جنگ کے بعد یہ کاغذات نکالے گئے تو پہلا مکتوب نہ مل سکا۔ وہ بہت مختصر تھا۔ پانچ چھ سطر سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ لیکن اب اس کا کوئی بھی فقرہ ذہن میں محفوظ نہیں۔

اس مکتوب کے ورود کے وقت میں بی اے کی آخری جماعت میں پڑھتا تھا اور خیال یہ تھا کہ امتحان سے فارغ ہوکر مولانا کی خدمت میں پہنچوں گا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں "الہلال" دو ہزار کی ضمانت ضبط ہونے کے باعث بند ہوگیا۔ میں مئی ۱۹۱۵ء میں امتحان سے

الحمدللہ آپ کا جواب میری توقع اور اُمید کے عین مطابق تھا۔ اگر غفلت طاری نہ ہوئی، تو میں آپ کے اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ ہر وقت اسے پیش نظر رکھیے کہ استقامت اصل کار ہے۔ اگر ایک آدمی فوج کی نوکری قبول نہیں کرتا، تو کوئی جرم نہیں۔ لیکن اگر سپاہی بن کر اور میدان جنگ میں آکر پیچھے ہٹتا ہے، تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی:

ہاں، رہِ عشق است، کج تقتن نہ دارد بازگشت!

جرم را ایں جا عقوبت ہست و استغفار نیست [۳]

دریا میں اترنے سے پہلے سب کچھ سوچ لینا چاہیے۔ لیکن جب اُتر گئے تو پھر موجوں کا شکوہ فضول ہے اور کبھی بھی سُنا نہ جائیگا۔ ممکن ہے پہلے ہی غوطے میں خونخوار نہنگوں سے سامنا ہو جائے۔ لیکن جو شخص سمندر میں کودتا ہے، اسے نہنگوں کے وجود سے بےخبر نہیں ہونا چاہیے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ بہرحال واقعات بہترین معیار ہمارے ارادوں اور ہماری استقامت کی آزمائش کے لیے ہیں۔ آپ مندرجہ ذیل امور کا جواب دیں:

(گزشتہ سے پیوستہ)

فارغ ہوا۔ مولانا نے "البلاغ" جاری کیا، نیز جماعتِ حزب اللہ" کے مختلف ارکان کی تربیت کے لیے "دارالارشاد" قائم کر دیا۔ پھر انھیں اخراج اور نظر بندی کی منزل پیش آگئی۔

وہ نظر بندی سے رہا ہوتے ہی ترکِ موالات میں مصروف ہو گئے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں انھوں نے جمعیتہ العلماء کے اجلاس لاہور کی صدارت فرمائی۔ یہاں سے واپس کلکتہ پہنچے تو ۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو گرفتار ہو گئے۔ مقدمہ چلا اور ایک سال قید کی سزا ہوئی۔ رہائی کے بعد ان سے تجدید روابط کی نوبت آئی۔

۱۔ آپ نے یا آپ کے بزرگوں نے آپ کی تعلیم کے متعلق کیا ارادہ کیا ہے اور کب تک جاری رہیگی ؟

۲۔ آپ کے بزرگوں میں سے کون کون بزرگ موجود ہیں ؟

۳۔ آپ کو میں اگر کچھ دنوں کے لیے بلاؤں، تو معاً آسکتے ہیں یا نہیں ؟

۴۔ آپ کی شادی ہو گئی ہے یا نہیں ؟

فقیر ابوالکلام

(۲)

۴۲۔ رپن اسٹریٹ کلکتہ
۲۴۔ جولائی ۱۹۲۳ء

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اخبار "خلافت" روزانہ جو مرکزی خلافت کمیٹی کی جانب سے بمبئی میں جاری ہے آجکل سخت بدنظمی کی حالت میں ہے۔ بدنظمی انتظام اور پریس کی نہیں ہے، تحریر اور اڈیٹری کی ہے۔ اس وقت تک چودھری عبدالغنی اڈیٹر رہے۔ اُن پر مقدمہ چلا ہے اور اب کوئی شخص موجود نہیں۔ تنخواہ نہایت معقول ہے، اتنی جتنی شاید اُردو اخبارات میں نہ دی جاتی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بالفعل اس کی اڈیٹری کا چارج لے لیں۔ اگر کسی وجہ سے لاہور نہ چھوڑ سکیں، تو عارضی طور پر ہی سہی، لیکن اس میں تساہل نہ کیجیے۔ "زمیندار" میں سالکؔ صاحب موجود ہیں اور لاہور میں مزید مدد بھی انہیں مل سکتی ہے۔ لیکن اخبار "خلافت" کے لیے کوئی انتظام نہیں۔ اتنی بڑی رقم اس کے لیے خرچ ہو رہی ہے، جتنی شاید آج تک کسی اُردو اخبار کے لیے خرچ نہیں ہوئی لیکن اچھے اڈیٹر نہ ہونے کی وجہ سے کوئی بہتر نتیجہ حاصل

نہیں۔
اُمید ہے کہ حتی الوسع آپ کوتاہی نہ کریں گے وہاں ضرورت فوری ہے۔ مجھے بذریعہ تار جواب دیجیے۔ نیز مسٹر عثمان سوبانی دفتر "بمبے کرانیکل" بمبئی کو بھی بذریعہ تار اپنی مستعدی اور میرے حوالے سے مطلع کیجیے۔[۵]
فقیر ابوالکلام کان اللہ لہٗ

(۳)

۳/۸۶

۱۹۲۳ء

حبّی فی اللہ　　السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

خط پہنچا، اللہ تعالیٰ آپ کی نیتوں کو اپنی راہ میں قبول فرمائے۔ خلافت کمیٹی میں آپ کا رسنا نہایت مستحسن تھا، لیکن "زمیندار" کی بقا بھی ضروری ہے اور اگر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے لیے آپ کی خدمات ناگزیر ہیں، تو اس کو ترجیح دیجیے،

---

[۵] میں پہلے پہل نومبر ۱۹۲۱ء میں "زمیندار" میں آیا۔ سالک صاحب میرے آنے سے پیشتر گرفتار ہو چکے تھے۔ پھر میرے عزیز اس تعلق کو جاری رکھنے میں مزاحم ہوئے اور مجبوراً مجھے "زمیندار" کو چھوڑنا پڑا۔ چند روز بعد دو ہزار کی ضمانت طلب ہوئی اور "زمیندار" پندرہ بیس روز بند رہا۔ ضمانت داخل کر دینے کے بعد دوبارہ جاری ہوا، تو عزیزوں کو راضی کر کے میں نے وائل فروری ۱۹۲۲ء میں پھر زمیندار کی ادارت سنبھال لی۔ ۱۹۲۲ء کے اواخر میں سالک صاحب ایک سال کی قید پوری کر کے واپس آ گئے۔ لہٰذا مولانا کی رائے یہ تھی کہ مجھے بمبئی چلے جانا چاہیے اور سالک صاحب "زمیندار" کو بخوبی چلاتے رہیں گے۔ لیکن اس زمانے میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور اختر علی خاں دونوں قید تھے۔ اور حالات ایسے تھے کہ مجھے معذرت کرنی پڑی جیسا کہ مولانا کے اگلے خط سے واضح ہے۔

لیکن جو کچھ کیجیے مولوی عبدالقادر صاحب[1] کے علم و مشورہ سے کیجیے۔ ان کی رائے عین میری رائے ہے اور ان شاء اللہ وہ کسی ضروری معاملے سے مانع نہ ہونگے۔ کلکتہ سے مولوی محمد اکرم خان صاحب نے "زمانہ" جاری کیا تھا، لیکن آج تک اسے کوئی ایڈیٹر نہیں ملا۔ کیا لاہور میں کوئی صاحب اس کام کے لیے اہل مل سکتے ہیں؟

فقیر ابو الکلام

(۴)

۱۷ جون ۱۹۲۴ء

حبّی فی اللہ۔ السلام علیکم

میرے مضمون کا "زمیندار" میں جو حشر ہوا، وہ ناقابل برداشت ہے۔ اوّل تو کتابت اور چھپائی کا یہ حال ہے کہ نصف عبارت ناقابل قرأت، پھر جا بجا مضمون کے حصص میں اضافہ کتابت کے اغلاط، کاتب صاحب یا مصحح کی اصلاحات۔

۱۔ ابتدا کے دو ٹکڑوں کا خاتمہ اس پر ہوا تھا کہ "آیندہ حسب ذیل امور پر نظر ڈالی جائیگی" پھر ان مواد کی تفصیل تھی، "زمیندار" میں صرف "حسب ذیل" تک چھپ گیا۔ اس کے بعد مواد کا حصہ نہ تو اس نمبر کے کسی دوسرے حصے میں آیا اور نہ اس کے بعد چھپا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بعد کے حصے کے ساتھ پہلے حصے کا کوئی ربط باقی نہ رہا۔ یہ کیا افسوسناک تساہل ہے؟

---

[1] مولانا عبدالقادر قصوری مرحوم و مغفور جو اُس زمانے میں مجلس خلافت، پنجاب کے صدر اور قومی تحریک کے بہت بڑے ستون تھے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے یہ بھی عرض کیا کہ مولانا عبدالقادر بھی ممبئی جانے کے بجائے میرا یہاں رہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نہ محض موصوف، بلکہ ان کے پورے خاندان کے ساتھ مولانا کے تعلقات بہت گہرے تھے۔

کی گئی۔
۲۔ اس کے بعد نیا سلسلہ شروع ہوا، تو عبارت ابتدا ہی میں خبط کر دی گئی۔ سب سے مقدم بات یہ ہے کہ "موجودہ ترکی حکومت" کی جگہ "بات یہ ہے کہ" سے مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے عبارت اس قدر مسخ ہو گئی ہے کہ اس کے تصور سے اذیت ہوتی ہے، تعجب ہے کہ "زمیندار" میں متعدد حضرات اہل قلم موجود ہیں، پھر مضامین کی یوں مٹی پلید کی جاتی ہے۔
۳۔ جا بجا کاتب صاحب کی اصلاحات نے عبارت کی رہی سہی نوعیت بھی ختم کر دی۔ "اسلام کی مطابق احوال ظروف خصوصیات" ان کی سمجھ میں آیا تو "اسلام کی مطابق احوال و ظروف کی خصوصیات" بنا دیا۔ "کی" صاف بعد کو لکھی ہوئی یا پھر پر بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔
۴۔ جس طرح پچھلے دو نمبر ناتمام چھپے اسی طرح اس نمبر میں بھی، خلافت کی بحث کے بعد عصمت پاشا کی تقریر کا ذکر تھا۔ یہ پورا حصّہ حذف کر دیا۔
حیران ہوں کہ مضمون کہاں بھیجوں۔ یہ کیسی مصیبت ہے کہ ہندوستان بھر میں ایک اخبار بھی ایسا نہیں، جہاں چار سطریں قرینے سے نکل جائیں۔ لوجوہ میں ہمیشہ "زمیندار" کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ "خلافت" بمبئی کو باوجود شدید اصرار کے بقیہ حصّہ نہیں بھیجا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں[1] نہ تو بجز ابتدا کے ایک صفحہ کی گنجائش ہے اور نہ کوئی نگرانِ کار۔ سوچ رہا ہوں کہ اب "ہمدم" کو بھیجوں۔ شاید وہاں کچھ اہتمام ہو[2]۔

---

[1] یعنی "زمیندار" میں
[2] یہ اُس مضمون کا ذکر ہے، جو منصبِ خلافت کی تنقیح پر مولانا نے تحریر فرمایا تھا۔ یہ بہت طویل تھا اور اس میں معاملے کے تمام اطراف پر سیر حاصل بحث فرمائی تھی۔ مضمون کی نگرانی اور تصحیح میں یقیناً تساہل ہوا اور اس کے لیے اسی زمانے میں معذرت کر دی گئی تھی۔

(۵)

"زمیندار" کی جدید ترقی اور تکمیل پر ارکان دفتر مستحق مبارکباد ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ملک پوری گرمجوشی کے ساتھ اس نئے دور کا استقبال کریگا اور بہت جلد اس کی مقبولیت اور اشاعت اس درجے تک پہنچ جائیگی، جس کا وہ فی الحقیقت مستحق ہے۔[۱]

ابوالکلام

(۶)

۳۰۔ ستمبر ۱۹۲۵ء

حبیّی فی اللہ، السلام علیکم

ایک سلسلۂ مضمون بھیجتا ہوں۔ یہ بہت طویل ہوگیا ہے اور ابھی بڑا حصّہ مباحث کا باقی ہے۔ اس کی مسلسل اشاعت کا ایسا انتظام کیجیے کہ "زمیندار" کے ہر نمبر میں کافی حصّہ نکل جائے اور نامناسب طریقے پر ادھر اُدھر منتشر ہو کر لطف مطالعہ ضائع نہ ہو جائے۔ مضمون میں جا بجا سرخیاں ہیں اور مباحث کے ٹکڑے ہیں۔ ہر نمبر میں کوشش کی جائے (مضمون) ایسے مقام پر ختم ہو جس کے بعد سے کوئی نیا عنوان شروع ہوتا ہو اور کوئی ایک ٹکڑا بیان و بحث کا پورا آسکے۔ مقصود یہ ہے کہ کوئی ٹکڑا الشتہ نہ رہے۔

مشکل یہ ہے کہ "زمیندار" میں بجز پہلے صفحہ کے گنجائش نہیں

---

[۱] "زمیندار" پہلے ۲۲ × ۱۸ سائز پر چھپتا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ہم نے ۔ (مہر، شفاعت اللہ خان، سالک اور مرتضیٰ احمد خان میکش) اس کا سائز بڑھا کر ۲۹ × ۲۲ کر دیا۔ مولانا نے یہ اعلان اسی موقع پر بھیجا تھا۔

مختلف وجوہ سے میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ اگر کوئی تحریر لکھوں، تو صرف "زمیندار" ہی میں بغرض اشاعت بھیجوں۔ لیکن پچھلی دفعہ ایک تحریر سی۔ آر داس کی نسبت بھیجی تھی۔ اس میں نہیں معلوم "زمیندار" کے خوشنویس صاحب نے یا مصحین نے یا ایڈیٹر نے جابجا اس قدر تبدیلیاں کر دی تھیں کہ کسی طرح بھی انھیں اتفاقی سہوِ کتابت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو تراکیب و الفاظ ان کی سمجھ میں غلط یا غیر فصیح ہوئے انھیں بطور اصلاح بدل دیا گیا حتیٰ کہ بعض مقامات میں تو پورے جملے کی نشست ہی مسخ ہو گئی۔ علاوہ بریں جہاں کہیں مسٹر یا لیجس لیٹو کا ونسل کا لفظ آیا تھا وہاں "جناب" اور "مجلسِ شوریٰ" کر دیا گیا تھا مثلاً جناب داس، جناب ٹیگور اور مجلس شوریٰ بنگال۔

براہِ عنایت "زمیندار" کے خوشنویسوں اور مصححوں تک میری التجا پہنچا دیجیے کہ اس مضمون کے ساتھ خدارا یہ سلوک نہ کیا جائے۔ جو الفاظ و تراکیب ان کے خیال میں ٹھیک نہ ہوں، انھیں بجنسہٖ نقل کر دیں اور شائع ہونے دیں۔ ذمہ داری صاحبِ مضمون کی ہے، نہ کہ کاتبوں اور مصححوں کی۔

اور اگر یہ اصلاحات آپ کی جانب سے یا دوسرے ایڈیٹروں کی جانب سے تھیں تو قطع نظر اس کے کہ یہ میری توقعات کے کس درجہ خلاف ہے، صرف اس پر اکتفا کرونگا کہ اس مضمون میں یا آیندہ کسی میرے مضمون میں ایسی تبدیلیاں نہ کی جائیں۔ مجھے امید ہے، بالتصریح میری اس خواہش کے اظہار کے بعد ضرور آپ حضرات اس کا خیال رکھینگے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہونگے کئی بار خیال آیا کہ آپ کو تحریر اور انشا کے بارے میں بعض باتیں لکھوں۔ آپ کی ترقیِ ذوق سے حد درجہ مسرور ہوں اور چاہتا

ہوں کہ اس باب میں مزید پختگی اور انسجام پیدا ہو۔ بوقتِ فرصت انشاء اللہ کبھی لکھونگا۔ سالک صاحب کو سلام پہنچا دیجیے[1]

فقیر ابوالکلام

(۷)

کاتب صاحب اور مصحح صاحب سے گزارش

۱۔ براہِ عنایت مضمون میں کسی طرح کی اصلاح نہ فرمائیں۔ اگر کوئی ترکیب اور لفظ آپ کی تحقیق میں سہواً یا غیر فصیح ہو، تو اس کی ذمّہ داری صاحبِ مضمون پر ہے، آپ پر یا اخبار پر نہیں ہے۔ اس کی تصحیح نہ کی جائے۔ سکوت ممکن نہ ہو تو حاشیہ پر تصحیح کردی جائے۔ لیکن خدارا اصل عبارت میں کانٹ چھانٹ نہ ہو۔

۲۔ مضمون میں اگر کوئی انگریزی لفظ آیا ہے، تو براہِ عنایت اس میں بھی تبدیلی نہ کی جائے۔ مثلاً اگر کہیں کمیٹی ہے تو اسے مجلس نہ کردیجیے۔ مسٹر ہے، تو

---

[1] یہ مکتوب میرے نام تھا اور آخری سطور میں مولانا نے میری ہی تحریر کے متعلق حسنِ ظن کرمانہ کا اظہار فرماتے ہوئے مزید پختگی اور انسجام یعنی روانی کی خواہش ظاہر کی تھی، لیکن جس ہدایت نامے کو انھوں نے وقتِ فرصت پر ملتوی فرمایا تھا، اس کا موقع نہ ملا۔
یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا نے مضمون میں جن تبدیلیوں کی شکایت کی، ان کے ذمّے دار ہم لوگ تھے۔ انگریزی حکومت کی مخالفت کے جوش میں انگریزوں کا طریقِ خطاب بھی ہمیں سخت ناپسندیدہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ "مسٹر" کی جگہ "جناب" لکھتے اور اداروں کے انگریزی ناموں کی جگہ بھی اپنے وضع کردہ نام استعمال کرتے، حال آنکہ مولانا کے مضمون میں اس نوع کے تصرفات کا نہ ہمیں حق تھا اور نہ یہ طرزِ عمل مناسب سمجھا جاسکتا تھا۔ اگلی تحریر بھی اسی کا ایک حصّہ ہے

اسے جناب سے نہ بدل دیجیے۔

۳۔ "کہ" "کے" "کو" کے استعمال کی جو صورت تراکیب میں ہو اس کی بھی اصلاح نہ کیجیے۔ مثلاً اگر کہیں آپ کو "کہ" بیانیہ چھوٹا نظر آئے اُسے غلطی کتابت نہ سمجھیے قصداً چھوڑ دیا گیا ہے، اسی طرح رہنے دیا جائے۔ یا مثلاً اس طرح کی ترکیب میں "جس کے کام مقاصد کے مطابق پاتے ہیں" اس طرح کی اصلاح نہ کر دیا کیجیے کہ "جس کے کام کو مقاصد کے مطابق پاتے ہیں" یہاں "کو" قصداً نہیں بولا جاتا یا سہو نہیں ہے۔ یا مثلاً اس جملے میں کہ "حقیقتِ حال بالکل منقلب کر دو" حقیقتِ حال کے بعد "کو" نہ بڑھا دیجیے۔

۴۔ مثال دینا مشکل ہے۔ اس سے پہلے سی۔ آر۔ داس والا مضمون اصلاحات و تغیرات سے چھلنی ہو چکا ہے۔ پس براہِ کرم میرے مضمون کی غلطیاں درست نہ کی جائیں بجنسہٖ نقل ہو۔ امید ہے اس کا اب پوری طرح خیال رہیگا۔

ابو الکلام

(۸)

۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ، کلکتہ

۳۱۔ مارچ ۱۹۲۶ء

حبیّ فی اللہ، السلام علیکم

کئی دن سے خیال کر رہا تھا، آپ کو خط لکھوں۔ اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ دہلی کے مشورہ کے مطابق "زمیندار" میں اعلان کر دیا گیا اور رد و مراسلت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ جیسا کہ میرا خیال تھا، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ طرفِ ثانی کے لیے گنجایش باقی نہ رہی اور نزاع ختم ہو گئی۔ ویسے بھی مجھے امید دلائی گئی تھی کہ آیندہ "ہمدرد"

میں اس جھگڑے کو طول نہ دیا جائیگا۔[۱]

میں نے جو آخری خط براہِ راست امیر ابن سعود[۲] کو بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں ایک تار ملا ہے غالباً خط متعاقب آرہا ہوگا۔ مؤتمر کرنے کے لیے وہ مستعد ہیں، تاکہ وہ حجاز کی اصلاح و ترقی و حفاظت پر غور کرے۔ ۲۰۔ ذی قعدہ (۱۳۴۴ھ)

۱۔ جھگڑے سے اشارہ اس بحث و نزاع کی طرف ہے جو "زمیندار" اور "ہمدرد" میں سلطان عبدالعزیز ابن سعود فرمانروائے نجد کے ملک الحجاز بن جانے پر چھڑ گئی تھی۔ مولانا محمد علی مرحوم و مغفور کی رائے یہ تھی کہ حجاز کا انتظام ایک بین الاقوامی اسلامی مجلس کے حوالے کیا جائے اور اس مقدس خطے کو، جس میں حرمین شریفین واقع ہیں، حکمرانوں کی کشاکش سے باہر رکھا جائے۔ مجلس خلافت نے بھی اسی مضمون کی قرار داد منظور کر رکھی تھی۔ سلطان ابن سعود نے حجاز کو شریفی خاندان سے نجات دی، تو خود اہل حجاز کے اصرار پر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ ۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو حرم پاک میں اس کی بادشاہی کی بیعت ہوگئی سلطان کہتا تھا کہ عالم اسلام کے بعض حصے اجنبیوں کے تابع ہیں مثلاً ہندوستان پر انگریز مسلط ہیں اور مصر بھی انگریزوں کے تابع ہے۔ ان اقطاع کے مسلمان ایک آزاد خطے کا انتظام سنبھالنے یا اس انتظام میں شریک ہونے کے اہل نہیں، البتہ انتظاماتِ حج کی بہتری اور حجاج کی سہولتوں کے سلسلے میں دنیائے اسلام کوئی مجلس بنالے تو اس کے مناسب مشورں کو جامۂ عمل پہنانے کا بندوبست ضرور ہو جائیگا اور سلطان کی حکومت اس مجلس سے پورا تعاون کریگی۔ "زمیندار" میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اُس کا مفاد یہ تھا کہ سلطان کی مخالفت کی بجائے افہام و تفہیم اور تعاون سے اصلاحی قدم اُٹھایا جائے، مولانا نے اور بعض دوسرے اکابر نے فرمایا تھا کہ "زمیندار" میں ردّ و کد کا سلسلہ بند کر دیا جائے۔ اس پر عمل ہوا اور معاملات رُو بہ اصلاح ہونے لگے۔

۲۔ امیر ابن سعود سے سلطان عبدالعزیز مرحوم بن عبدالرحمٰن آل سعود مراد ہیں۔

یعنی ۲۔ جون ۱۹۲۶ء تاریخ قرار دی ہے اور باقاعدہ دعوت مختلف ممالک و جماعات کو بھیجی جا رہی ہے میں آج انہیں ایک مفصّل ٹیلی گرام بھیج رہا ہوں اور چاہتا ہوں خلافت کمیٹی کی جانب سے بہ غرضِ تشویق و ترغیب مصر، افغانستان، ٹرکی، ایران وغیرہ بلادِ اسلامیہ کو پیغامات بھیجے جائیں۔ وقت کم ہے اور ابھی مؤتمر کے دائرۂ بحث کا مسئلہ مزید وضاحت طلب ہے۔ تاہم کم سے کم آیندہ حج کے موقع پر ایک ابتدائی کانفرنس منعقد کی جا سکتی ہے، جو مجوزہ مؤتمر کا باقاعدہ فیصلہ کرے۔ اس کے لیے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی کا انتظام ہو اور آیندہ حج کے موقع پر مطلوبہ درجہ اہمیت اور اجتماع کی کانفرنس منعقد ہو سکے۔ اسلام کی بین القومی مؤتمر بجائے خود اس درجہ اہم معاملہ ہے کہ دفعتہً اس کا وجود میں آجانا ممکن نہیں۔ تدریج و ترتیب ناگزیر ہے۔ اس سال اگر بنیاد پڑ جائے اور ایک باقاعدہ ابتدائی کانفرنس ہو جائے، تو یہ بہت بڑی کامیابی ہو گی۔

میں نے ایک مختصر اطلاع پریس میں دے دی ہے۔ بالفعل اس قدر کافی ہے۔ پس آپ بھی اس اطلاع سے زیادہ شائع نہ کریں۔ مندرجۂ صدر تفصیلات آپ کو شخصاً لکھ رہا ہوں۔ ان امور و افکار کی بالفعل اشاعت نہیں کرنی چاہیے۔ ممکن ہے مؤتمر پر ایک تحریر لکھ کر بغرض اشاعت آپ کو بھیج دوں، کیونکہ اس مقصدِ قدیم و عظیم کے متعلق بہت کم صحیح خیالات قائم کرنے کا لوگوں کو موقع ملا ہے۔

میرے اس خیال کی روز بروز تصدیق ہوتی جاتی ہے کہ صحیح طور پر افکار و مقاصد کے واضح نہ ہونے نے یہ تمام الجھاؤ پیدا کر دیا۔ اگر امیر ابن سعود پر ابتدا ہی میں بہ طریقِ صحیح و اوقع ہمارا مسلک واضح ہو جاتا، تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ غیر مطمئن ہو کر مستعجل ہو جاتے۔ فی الحقیقت انتظار میں خود اس کا اور تمام عالم اسلامی کا فائدہ تھا۔ اب بھی اگر افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رہے، تو حالات اپنا

صحیح مجرا اختیار کر سکتے ہیں۔ ١٠

میں سر دست مولوی عبدالرزاق صاحب کو بھیج رہا ہوں اور ان شاء اللہ اگر توفیق الٰہی سازگار رہی تو ذی قعدہ تک خود بھی قصد کروں گا۔[1]

مولوی ظفر علی خاں صاحب اگر لاہور میں ہوں تو سلام شوق پہنچایئے اور کہیے حسب وعدہ ۱۹۔ اپریل کو دہلی میں مرکزی خلافت کمیٹی کا اور ۱۸ کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ قرار پایا ہے، تاکہ کاؤنسلوں کے معاملے پر اور ملک کے اندرونی تعمیری کاموں پر غور کرے۔ اب آپ کی سعی و تدبیر کا "نقطۂ ماسکہ" یہ ہونا چاہیے کہ تمام ممبران پنجاب (کثرہم اللہ تعالیٰ) شریک ہوں اور غور و فکر کے بعد مسائل کا فیصلہ کریں۔ مجھے قوی امید ہے کہ ان شاء اللہ مناسب فیصلہ ہو جائیگا۔ جو گفتگو اس باب میں دہلی میں ہوئی تھی، وہ کفایت کرتی ہے، ضرورت اعادہ نہیں۔

امید ہے آپ بھی اس موقع پر دہلی آئیں۔ یقین کریں کہ آپ کو عزیز رکھتا ہوں اور متمنی ہوں، اللہ تعالیٰ مزید توفیق علم و عمل دے اور خدمات شائستۂ قوم و ملت کا وسیلہ بنائے۔ والعاقبۃ للمتقین۔ سالک صاحب کو بھی سلام پہنچایئے۔ امید ہے بعافیت ہونگے۔

فقیر ابوالکلام

---

[1] مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اس سال حجاز گئے تھے۔ مولانا نہ جا سکے۔ البتہ مولانا محمد علی مرحوم، مولانا شوکت علی، مولانا محمد عرفان مرحوم، محترم شعیب صاحب قریشی ایک وفد کی صورت میں حجاز گئے تھے اور حج کے موقع پر مؤتمر میں شریک ہوئے تھے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ عالم اسلام کی کوئی نمایندہ مجلس ترتیب نہ پا سکی۔ اس کے وجوہ و اسباب کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۹)

کلکتہ ۱۹ جنوری ۱۹۲۷ء

حبیّ فی اللہ، السلام علیکم

ایک عرصے سے شفاعت اللہ خاں صاحب کہہ رہے ہیں کہ ان میں آپ میں اور سالک صاحب میں کوئی مشورہ ہوا ہے اور مصمّم قصد ہے کہ لاہور یا دہلی سے ایک روزنامہ اخبار مشترکہ کوشش سے جاری کیا جائے۔ جب پچھلے دنوں میں نے دہلی جانے کا قصد کیا تھا تو میں نے ان سے کہا تھا: میں خود تو اس کی ذمّہ داری نہیں لونگا، لیکن جس قدر مدد دے سکتا ہوں، دونگا۔ لیکن وہ وقت مع اپنے ارادوں کے نکل گیا۔ اس مرتبہ جب دہلی میں وہ ملے تو انھوں نے کہا کہ اس بارے میں وہ کچھ تیاریاں کر چکے ہیں اور آپ اور سالک صاحب دونوں تیار ہیں۔ میں نے کہا، اگر واقعی ایسا قصد ہے، تو دو باتوں پر غور کر لینا ضروری ہے: اوّل یہ کہ کوئی طریقہ عمداً ایسا اختیار نہیں کرنا چاہیے، جس سے "زمیندار" کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ مہر صاحب اور سالک صاحب کو چاہیے، مولوی ظفر علی خاں صاحب سے گفتگو کر کے باہمی رضامندی کے ساتھ علیٰحدہ ہوں۔ ثانیاً ایک کافی رقم کا انتظام ضروری ہے۔ بغیر اس کے اخبار نکال دینا صحیح نہ ہوگا۔ اوّل الذکر معاملے کے متعلق انھوں نے جو کچھ کہا وہ قابلِ اطمینان نہ تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مہر صاحب کو بُلا کر اُن سے بھی گفتگو کر لی جائے۔ انھوں نے آپ کو تار بھی بھیجا تھا، لیکن آپ نہ آسکے۔ اب پھر فروز پور سے ان کا خط آیا ہے کہ اس کا فیصلہ ہو جانا چاہیے۔ میں نے ضرورت محسوس کی کہ انھیں جواب دینے کے ساتھ براہِ راست آپ کو بھی لکھوں

آپ کو یاد ہوگا، ستمبر میں جب آپ دہلی میں ملے تھے تو آپ نے مولوی عبدالقادر

صاحب کی زبانی مجھ سے مشورہ چاہا تھا اور میں نے یہی رائے دی تھی کہ سردست "زمیندار" میں مشغولیت جاری رکھی جائے، تاآنکہ کوئی بہتر صورت نکل آئے۔

میں اب بھی آپ کو یہی مشورہ دونگا۔

۱۔ زمیندار سے ایسی حالت میں علیحدہ نہیں ہونا چاہیے کہ "زمیندار" کو نقصان پہنچے۔ علانیہ گفتگو کرکے اور مناسب انتظام کے بعد علیحدہ ہونا چاہیے۔

۲۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ آپ کو بالاستقلال اپنی کسی صحیح اور نتیجہ خیز مشغولیت میں دیکھوں۔ اگر روزانہ اخبار کے اجراء کا مصمم ارادہ کرلیا ہے، تو اس میں شک نہیں، ملک کو اس وقت جن چیزوں کی نہایت سخت ضرورت ہے، اُن میں اوّلین روزانہ اخبارات ہیں۔ اُردو میں اس وقت تک روزانہ اپنے کمتر سے کمتر معنوں میں بھی وجود پذیر نہ ہوسکا۔ دہلی سے ایک اچھا اخبار نکل سکتا ہے۔ میں وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر ارادہ کرچکا ہوں کہ کسی نہ کسی طرح چند اخبارات جاری کر دیے جائیں۔ بالفعل کلکتہ سے روزانہ اخبار جاری کر رہا ہوں اور دہلی سے اجراء کا سامان ممکن ہے۔ آپ اور سالک صاحب نے شفاعت اللہ خاں صاحب سے مل کر اگر یہ کام کرنے کا ارادہ کرلیا ہے تو بالتفصیل لکھیے۔ اس کے بعد میں لکھونگا کہ کونسی صورت پیشِ نظر ہے۔

مولوی شفاعت اللہ خاں کو بھی لکھ رہا ہوں۔ کاتبوں کی ضرورت ہے کلکتہ اور لکھنؤ سے انتظام ہوچکا ہے، لیکن اگر کوئی اچھا خوشنویس پنجاب سے آنے کے لیے تیار ہو، تو ضرور لکھیے۔[1]

فقیر ابوالکلام

---

[1] ابتدا میں "زمیندار" سے علیحدگی کا خیال نہ تھا، اس لیے کہ مقصود خدمت تھا،

(۱۰)

۱۹۲۷ء

عزیزی : السلام علیکم

خط پہنچا۔ رمضان نے مہلت نہ دی کہ بہ اطمینان جواب دیتا۔ آج عید ہے یہ پہلا خط آپ کے جواب میں لکھ رہا ہوں۔ افسوس ہے آپ نے اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ آپ کے خط کی مجموعی اسپرٹ میرے لیے تعجب و افسوس دونوں کا باعث ہوئی

آپ نے پہلے بطور خود یہ مقدمہ فرض کر لیا ہے کہ میں نے آپ کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر بہت سے عقائد و اصول اس پر متفرع کرتے چلے گئے ہیں۔ سب سے پہلے (بقیہ گزشتہ) اس کے لیے "زمیندار" میں مناسب ذرائع موجود تھے۔ پھر آہستہ آہستہ حالات نے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ایسی صورت اختیار کر لی، کہ ہمارے لیے "زمیندار" سے تعلق قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ شفاعت اللہ خان صاحب بہت پہلے الگ ہو چکے تھے۔ سالک صاحب نے رخصت لے لی تھی اور میں نے بھی رخصت کے لیے درخواست دے دی تھی۔ مولانا ظفر علی خان کو ہماری علیحدگی منظور نہ تھی لیکن وہ خواہش و عزم کے باوجود حالات کی درستی پر بھی قادر نہ تھے۔ میں نے اور سالک صاحب نے تو آخری فیصلہ کر لیا تھا کہ نیا اخبار جاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہمیں "زمیندار" کو چھوڑ کر علمی و ادبی مشاغل اختیار کر لینے چاہییں۔ مارچ ۱۹۲۷ء میں اچانک ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ ہم دونوں کو بیک وقت استعفی دینا پڑا۔ اس کے بعد ہماری خواہش اور مشورے کے بغیر باقی عملے کا بیشتر حصہ بھی مستعفی ہو گیا۔ عملے میں ایڈیٹر اور مترجم بھی تھے اور کاتب بھی تھے۔ یہ ذمہ داری سر پر آ پڑی تو آٹھ روز کے اندر اندر ہم نے "انقلاب" کے اجراء کا بندوبست کر لیا جس کا پہلا پرچہ ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔ ان مشغولیتوں میں مجھے مولانا کے گرامی نامے کا جواب دینے کی فرصت نہ مل سکی۔

یہ بات صاف ہونی چاہیے کہ خط کے جواب نہ دینے سے مقصود کیا ہے۔ اگر خط سے مقصود وہ خط ہے، جو میرے خط کے جواب میں آپ نے غالباً جنوری میں بھیجا تھا تو یہ قطعاً غلط ہے کہ میں نے اس کا جواب نہیں بھیجا۔ جس دن وہ خط پہنچا ہے اسی دن میں نے جواب لکھا ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دوسرے دن روانہ کر دیا گیا ہے اور اگر جواب نہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ اس خط میں، میں نے دلی آنے اور آپ کو بذریعۂ تار اطلاع دے کر بلوانے کا جو وعدہ کیا تھا، اس میں تاخیر ہوئی تو اس میں شک نہیں کہ ضرور تاخیر ہوئی، لیکن قصداً نہیں ہوئی۔ کانگرس اور لیگ کی مفاہمت میں جانا ضروری تھا کہ اس موقع پر آپ سے بھی بسہولت ملاقات ہو جائے گی لیکن کلکتہ میں پریس کے انتظامات نے مہلت نہ دی۔ پھر بعض اعزہ کی علالتوں سے پریشانی رہی۔ اس کے بعد رمضان آ گیا۔ سفر میں روزہ رکھ نہیں سکتا اور ترک طبیعت پر شاق گزرتا ہے، اس لیے سفر پر طبیعت مائل نہ ہوئی اور اسی لیے آپ کو بلانے کا بھی موقع نہیں نکلا۔

بالفرض قصداً تاخیر ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ نتائج کہاں سے اخذ کیے گئے، جن کے بیان میں آپ نے اس قدر ادیبانہ سرگرمیوں کا اسراف کیا ہے؟ داد و دہش کی نمائش، کاسۂ گدائی، آپ کی امداد و اعانت کی حقیقت، رائیگاں بخشی، دستِ سوال اور کیا کیا ترکیبیں ہیں، جو اس عجیب و ضخیم خطاب میں صرف کی گئی ہیں۔ بھلا کاسۂ گدائی اور دستِ سوال کا اس سے کیا علاقہ اور جذبۂ داد و دہش کی نمائش کا یہاں کیا سوال؟ اگر میں نے داد و دہش کی نمائش کی ہوتی، تو آپ کو حق تھا کہ اس نمائش پر ملامت کرتے اور اس کی 'حقیقت' معلوم کر لینے پر سجدۂ شکر بجا لاتے لیکن میں حیران ہوں کہ موجودہ صورت حال کو ان باتوں سے کیا تعلق؟ کس نے نمائش کی؟ کس نے امداد کا اظہار کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتا کن تاثرات نے

آپ کو اس طرزِ کلام پر آمادہ کیا؟ یا تو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا کوئی خاص حالت آپ پر طاری ہوگئی ہے۔ مجھے آپ سے یکایک اس طرزِ کلام کی اُمیّد نہ تھی۔ میں آپ کا خط واپس بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے آپ غور کر سکیں کہ کن خیالات و تاثرات کے ماتحت یہ اسلوبِ بیان پیدا ہوا!

باقی رہا "زمیندار" سے علیحدگی اور اخبار کے اجراء کا معاملہ تو اس میں شک نہیں، میرے خیال میں وہی صورت زیادہ مناسب تھی، جو میں نے آپ کو لکھی تھی۔ اس میں ضرورت اور معیشت سے زیادہ مقصد کا عنصر کام کرتا تھا، لیکن اب کہ آپ نے علیحدہ ہو کر فوراً دوسرے اخبار کا انتظام شروع کر دیا ہے شاید یہ مشورہ بعد از وقت ہو۔ نئے حالات ادھر کیا پیش آئے! مجھے معلوم نہیں۔ البتہ یہ حقیقت واضح تھی کہ "زمیندار" کا تعلق چل نہیں سکتا تھا۔ بہتر تھا کہ کسی بہتر اور اقرب الی المقصد طریقِ عمل کے حصول کے بعد یہ قدم اٹھایا جاتا، مگر اب جب کہ اٹھ چکا ہے تو بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ خدا آپ کو کامیاب بنائے!

البتہ اجراءِ کار کے بعد بھی اگر ممکن ہو تو اس مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔

آپ یقین کیجیے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں اور اس لیے آپ کی جانب سے یکایک ایک نئی قسم کی غیر متوقع اسپرٹ کا اظہار میرے لیے تکلیف دِہ ہوا۔ ممکن ہو تو مجھے اس کا سبب بتلائیے۔ کم از کم یہ تو معلوم کر لوں کہ میری کن باتوں سے یہ اثرات آپ پر طاری ہوئے! آپ نے یہ بھی نہیں لکھا کہ نئے اخبار کا انتظام کیونکر ہوا ہے اور کہاں تک ہوا ہے۔ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو اس کی تفصیلات بھی لکھیے۔

یہ کہنا ضروری نہیں کہ علیحدگی کے بعد اب "زمیندار" سے کسی طرح کے رقیبانہ طرزِ عمل کا رکھنا ہر اعتبار سے غلط اور مضر ہوگا۔ اخبار تجارت بھی ہے اور قومی خدمت

بھی ہے تجارت کا حال معلوم ہے کہ ایک ہی بازار میں کپڑے کی بیس دکانیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں اور ہر صاحبِ دوکان رزق حاصل کر لیتا ہے۔ قومی خدمات کے اعتبار سے تو تعدد و کثرت محمود و مطلوب ہے، نہ کہ موجبِ تحاسد و نزاع۔ پھر کیوں نزاع و مخالفت ہو!

مولوی ظفر علی خان صاحب نے "زمیندار" میں جو کچھ لکھا ہے، وہ میری نظر سے گزرا ہے۔ اگر وہ اس طرزِ عمل پر قائم رہے تو یقیناً تعریف و تحسین کے مستحق ثابت ہونگے۔

آپ نے "پیغام"[۱۲] کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں میرے مضامین نہیں نکلے، اس لیے اس پر لوگوں کو توجہ نہ ہوئی۔ یہ بات نہیں ہے۔ مضامین کی اشاعت بغیر اس کے بیچل ہے کہ وہ ابتدائی مراحل سے گزر جائے اور کافی حلقۂ اشاعت پیدا ہو جائے۔ اب بتدریج شائع ہونگے۔ اسے قلتِ اشاعت کی شکایت نہیں ہے، اشخاص کی قلت موجبِ تعب ہے۔[۱]

ابوالکلام

(۱۱)

۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء

عزیزی، السلام علیکم

پچھلے خط کا جواب آپ نے اب تک نہیں بھیجا۔ غالباً اخبار کے اہتمام میں مشغول ہیں،

---

[۱] اب بالکل یاد نہیں آتا کہ میں نے کیا لکھا تھا اور کس وجہ سے کہ ایک ایسا انداز اختیار کیا، جسے مولانا جیسی شفیق شخصیت نے خلاف توقع قرار دیا لیکن بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شفقت و نوازش کے بھروسے پر کوئی نالائقی سرزد ہوئی ہوگی۔ نیز یہ پہلا مکتوب ہے جس میں مولانا نے ازراہِ شفقت "عزیزی" کہہ کر شرفِ امتیاز بخشا۔ اس سے پیشتر وہ تمام مکاتیب میں (بہ استثنائے مکتوب اول) "حبی فی اللہ" کہہ کر خطاب فرماتے رہے اور خط و کتابت میں ان کا عام طریقہ یہی تھا۔

میں نے مولوی عبدالرزاق صاحب سے کہہ دیا تھا کہ آپ کے نئے اخبار کے جتنے پرچے آئیں، فائل بنا کر رکھ دیں، تاکہ میں بوقتِ فرصت دیکھ سکوں۔ آج شب کو دیکھنے کی مہلت ملی۔ اس وقت نمازِ صبح کے بعد قلم اٹھایا، تو سب سے پہلے آپ یاد آئے۔ چند امور جو ذہن میں آئے لکھتا ہوں:

۱۔ "انقلاب" کے پانچ نمبر تھے، جو میری نظر سے گزرے۔ آپ نے "زمیندار" سے الگ ہو کر نیا اخبار جاری کیا، لیکن اس سے زیادہ کوشش نہ کی کہ "زمیندار" کی ہو بہو ایک دوسری شکل ہو۔ جہاں تک مسلک کا تعلق ہے، ضرورت نہ تھی کہ کسی تغیر کا اعلان کیا جاتا، لیکن کوشش کرنی تھی کہ اس سطح سے نسبتہً بلند سطح کے لوگوں کے سامنے آتے، جو "زمیندار" کی قائم ہو چکی ہے۔ جہاں تک روزانہ اخبار کا تعلق ہے، اردو میں اس وقت تک کوئی بلند کام انجام نہیں پایا اور سعی و تلاش کا پورا میدان باقی ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی محنت گوارا کریں، تو کم از کم "زمیندار" کی سطح سے ایک بلند سطح قائم ہو جائے اور جو لوگ "زمیندار" خریدتے ہیں، وہ بھی "انقلاب" کی ضرورت محسوس کریں۔ مثلاً اس پر قناعت نہ کیجیے کہ تار کی خبروں کا ترجمہ کر دینے اور ایڈیٹوریل صفحے کے لکھ دینے کے بعد ایڈیٹوریل اسٹاف کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ مواد اخبار میں ہونا چاہیے اور اس کا بآسانی انتظام ہو سکتا ہے۔ عام انگریزی اخبارات میں فوائد اور دلچسپی کی اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ اگر کسی ایک اخبار ہی سے کالم نصف کالم کا مواد اخذ کر لیا جائے تو اردو روزانہ کے دو تین کالموں کے لیے بہترین ذخیرہ مہیا ہو جا سکتا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ تو یہ ہوگا کہ دس پندرہ روپیہ ماہوار کا خرچ گوارا کر کے انگلستان کے چند رسائل اور اخبارات منگوا لیے جائیں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے، تو خود ہندوستان کے انگریزی اخبارات کافی ہیں: "اسٹیٹسمین"، "انگلش مین"، "ٹائمز آف انڈیا"، "مدراس ٹائمز"

اور "پایونیر" بیشمار چیزیں کام کی ہوتی ہیں اور اُردو اخبار کا ایک قلم بھی انھیں مس نہیں کرتا خصوصاً "اسٹیٹسمین" اور "انگلش مین" کے ہفتہ وار پرچوں میں تو اس قدر مفید معلومات ہوتی ہیں کہ صرف انھیں کا اقتباس ہفتہ بھر تک کام دے سکتا ہے۔ اُردو میں صرف ترجمہ اور اقتباس سے اس قدر مفید اور دلچسپ اخبار بن سکتا ہے کہ اس کا ہر نمبر پڑھنے والوں کے لیے فوائد و معلومات کا ایک درس ہو۔

عام مسلمانوں کو بلا شبہہ سیاسی و معاشرتی معلومات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن اگر ہماری اخبار نویسی مقاصد سے خالی نہیں ہے، تو ہمیں پیدا کرنی چاہیے۔ عوام کی دلچسپی کی چیزیں لکھی جائیں لیکن اس کے ساتھ ہی مفید سیاسی معلومات بھی ان تک پہنچا دی جائیں۔ دنیا کے ہر گوشے میں زمانے کی رفتار تیز ہے ہندوستان کے لیے سست نہیں ہو سکتی۔ یہاں بھی وقت تیزی کے ساتھ نکل جائیگا اور مسلمان اس منزل پر بہت جلد اپنے آپ کو پائینگے۔ جہاں خود ہندوستان کی اسلامی زندگی کے لیے انھیں اپنی عدم استعداد پر متاسف ہونا پڑیگا۔ ضرورت ہے کہ لوگوں میں مسائل و حوادث کے فہم و نظر کا صحیح سیاسی ذوق پیدا کیا جائے اور ایسی چیزیں ان کی معلومات میں لائی جائیں، جن سے ان کی ذہنیت میں بلندی و متانت پیدا ہو۔ دنیا کی عام سیاسی و معاشرتی حالت، دنیا کی مختلف قومی تحریکات علمی و تمدنی تغیرات، مغرب و مشرق کی کشمکش کے نئے گوشے، مشرقی ممالک و اقوام کی نئی سرگرمیاں اور اسی طرح کی ضروری معلومات سے اگر مسلمانوں کے اخبارات خالی رہیں، تو یہ ان کی ذہنی پستی کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگا۔

اس سے بھی بڑھ کر روزانہ اخبارات کے لیے لکھنے کی جو چیزیں ہیں، وہ ملک کی سیاسی حالت و نوعیت ہے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں بہ حیثیت جماعت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ان کے (ہندوؤں کے) عوام ملک کی سیاسی حالت سے

جس قدر واقفیت رکھتے ہیں اس قدر ہمارے (مسلمانوں کے) خواص بھی نہیں رکھتے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اگرچہ ہندوؤں کے مقابلے میں شور وغل بہت مچایا جاتا ہے لیکن سیاسی مقابلہ و کشاکش کی صحیح استعداد پیدا کرنے کی کوئی فکر نہیں کرتا۔ ہندوستان جدید سیاسی اور کانسٹی ٹیوشنل زندگی اختیار کر چکا ہے۔ آیندہ جو کچھ بھی ہوگا، نیابتی اور انتخابی اصولوں پر ہوگا اور زندگی کے ہر میدان میں وہی جماعت کامیاب ہوگی، جو سیاسی زندگی کے لیے صحیح اور طاقتور رائے عامہ اپنے ساتھ رکھےگی۔ نوکریوں اور فرقہ وارانہ حقوق کا بھی تمام تر دارومدار اسی پر ہے۔ پس ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کی سیاسی تعلیم و ترقی کے لیے بہ کثرت مضامین لکھے جائیں۔ انھیں بتلایا جائے کہ ہندوستان کا نظام حکومت کیا ہے؟ مستقبل کے تغیرات کیا کیا متوقع ہیں؟ دنیا کے موجودہ سیاسی اصول مملکت کس طرح ہندوستان پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ نیابتی اور انتخابی اصولوں سے کیا مقصود ہے؟ اور مسلمان کیونکر ہندوستان میں ایک طاقتور نیابتی زندگی حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ مباحث اس قدر بہل اور پیش پا افتادہ ہیں کہ بغیر کسی محنت و کاوش کے لکھے جا سکتے ہیں کم از کم دوسرے تیسرے دن بہ عنوان مختلف اس کا کوئی نہ کوئی پہلو واضح کرنا چاہیے۔ صرف شدھی اور سنگھٹن کو پیٹتے رہنے سے مسلمان طاقتور نہیں ہو جائیںگے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ یہ چیزیں اس طرح نہ لکھی جائیں کہ لوگ اکتا جائیں۔ آپ کو اخبار چلانا اور عوام ہی میں مقبول بنانا ہے۔ ایڈیٹوریل کالموں میں وہ سب کچھ لکھتے رہیں، جو لکھا کرتے ہیں۔ پہلے صفحے کی گنجایش اچھی خاصی ہے، جو نصف کے قریب لوح میں ضائع چلی جاتی ہے۔ اس میں گنجایش نکالیے اور کم از کم دو تین کالم اس قسم کے تراجم و مطالب کے لیے مخصوص کر دیجیے۔[1]

[1] مولانا نے اردو اخبار نویسی کے متعلق ۱۹۲۷ء میں جو کچھ فرمایا، وہ میرے نزدیک

۲۔ آپ نے یہ بہت ہی بہتر کیا کہ باوجود "زمیندار" سے علیحدگی کے تلخ حالات کے، کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس سے چشمک و رقابت پائی جاتی ہو۔ امید ہے آیندہ بھی شدت کے ساتھ اسی مسلک پر قائم رہینگے۔ مولوی ظفر علی خان صاحب نے بھی "زمیندار" میں مخالفت کی جگہ موافقت و مساعدت کی اسپرٹ ظاہر کی۔ مجھے امید ہے کہ وہ بھی اسی پر قائم رہینگے۔

۳۔ باوجود آپ کی کوشش و محنت کے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ نے علیحدگی اور اجراء اخبار میں جلدی کی۔ خدا کرے، جلد از جلد آپ کامیاب ہوں! اب چونکہ اخبار جاری ہو چکا ہے، اسے جاری ہی رہنا چاہیے اور راہ کی تمام مشکلات دور کرنی چاہئیں۔ اگر آپ نے اپنے حالات لکھے، تو جو کچھ سمجھ میں آئیگا، لکھونگا۔[1]

گزشتہ خط کا جواب وصول نہیں ہوا۔

فقیر ابوالکلام

(بقیہ گزشتہ) آج بھی اتنا ہی مفید اور قابلِ عمل ہے جتنا کہ پہلے تھا۔ "انقلاب" یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ اس نے ان گرانقدر ارشادات پر پورا پورا عمل کیا، لیکن اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ "انقلاب" نے خالص سیاسی، انتظامی اور دستوری مسائل پر مفصل مباحث کا آغاز کیا۔ ترکِ موالات کے دور میں جن جذباتی مضامین و مقالات کا عام رواج ہو چکا تھا، ان کی جگہ ٹھوس قومی اور ملکی مباحث کی طرح "انقلاب" ہی نے ڈالی اور فخر کے طور پر نہیں بلکہ صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر یہ عرض کرنا غالباً بیجا نہ سمجھا جائیگا کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے "انقلاب" کی آواز کو پذیرائی کا شرف بخشا۔

[1] "انقلاب" کے اجرا کی پوری تفصیل، یہاں تک کہ فراہمیٔ سرمایہ کی کیفیت بھی میں نے مولانا کی خدمت میں عرض کی تھی۔

مولوی عبدالرزاق اس وقت تک نوجوانی کے حدود کے اندر ہیں، اس لیے طبیعت میں نوجوانی کی جراتیں تیز ہیں۔ انھیں آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے ان کا ایک مضمون نقل کیا، مگر ظاہر یہ کیا کہ نقل نہیں ہے۔ وہ صرف اتنی سی بات پر اس درجہ متاثر ہوئے کہ جب آپ کے "انقلاب" کا ذکر کرتا ہوں، جوش میں آ جاتے ہیں۔ ہر چند اُن سے کہتا ہوں، یہ اخبارات کے اخذ و نقل کی معمولی باتیں ہیں، مگر وہ نہیں مانتے۔ چونکہ مشرب وہابیت کی گرمجوشی میں وہ آپ کے خواجہ تاش ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ آپ دونوں معاملہ طے کر لیں۔[1]

(۱۲)

کلکتہ

۲۷ اپریل ۔ ۲۷ء

عزیزی السلام علیکم

خط پہنچا۔ ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہ کیجیے کہ کسی عذر خواہی کی ضرورت ہے۔ جس وقت تک خدمت حق و ملت کا وہ رشتہ برقرار ہے جس نے آپ کو مجھ سے وابستہ کیا تھا، اس وقت تک آپ کی کوئی بھی بات میرے دل کو برگشتہ نہیں کر سکتی اور الحمدللہ یہ تو کوئی ایسی بات بھی نہ تھی، جو لائق اعتنا ہو۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ نے سب کچھ لکھا مگر یہ عقدہ حل نہیں کیا کہ جس خط کے جواب نہ ملنے کی شکایت کی گئی تھی وہ کونسا خط ہے، اور اس کا مضمون کیا تھا؟ یہی بات میں نے آپ سے

[1] برادر مکرم مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی شکایت بالکل بجا تھی۔ لیکن حوالہ نہ دینا صرف اتفاقی فروگذاشت کا نتیجہ تھا۔ ارادے کو اس میں کوئی دخل نہ تھا اور اس فروگذاشت کے لیے ان سے معافی مانگ لی گئی تھی۔

دریافت کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ادھر آپ کا کوئی خط بھی مجھے ایسا نہیں ملا ہے جس کا جواب نہ دیا گیا ہو۔ برخلاف اس کے میرے اس مفصل خط کا جواب آج تک نہیں ملا، جو میں نے غالباً جنوری میں آپ کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔

اس بات سے نہایت خوشی ہوئی کہ شفاعت اللہ صاحب آپ کے ساتھ "انقلاب" کی مساعی میں شریک ہو گئے۔ انشاء اللہ ان کی مستعدی و تجربہ کاری سے اس کام کو پوری مدد ملیگی۔

"انقلاب" کے لیے سرمایہ کا جو انتظام کیا گیا اگر وہ پوری طرح وجود میں آ جائے، تو کافی تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ نصف سے زیادہ وعدے عموماً نا قابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا، بحالتِ موجودہ کہاں تک ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ کوئی نہ کوئی دوسری صورت نکالنی چاہیئے، تاکہ اخبار کو اس کے ابتدائی دور میں مشکلات پیش نہ آئیں۔ اب مواعید کے حصول کی ایک آخری کوشش کیجیے۔ پھر نتیجہ سے اطلاع دیجیے[1]۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے متعلق جو کچھ میرے علم میں ہے، یہ ہے کہ تنخواہوں کے دینے میں بلا وجہ تساہل کیا جاتا تھا اور حصولِ زر کے لیے ہمیشہ ایسی کوششیں جاری رہتی تھیں جو اصول کے اعتقاد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ خصوصاً وہ کوششیں جو افضل اور توفیق شریف سے حصولِ زر کے لیے یکے بعد

[1] ہم نے "انقلاب" کے لیے فراہمیِ سرمایہ کی یہ تجویز سوچی تھی۔ اپنے ایک سو دوستوں کی فہرست تیار کی اور ان سب سے کہہ دیا کہ ایک ایک سو روپیہ فوراً دے دیں۔ بعض دوستوں نے تین تین بلکہ پانچ پانچ حصوں کی رقمیں دیں اور ایک دو روز میں کم و بیش ساڑھے تین ہزار کی رقم فراہم ہو گئی۔ اسی کی بنا پر اخبار جاری ہوا۔ بعض احباب نے اپنے حصے بعد میں ادا کیے۔ لیکن اس فہرست کی پوری رقم نہ فراہم ہوئی اور نہ ہم فراہمی کا اہتمام کر سکے۔ اخبار جاری ہو گیا، تو ہمارا پورا وقت اسی کی نذر ہوتا رہا۔

دیگرے کی گئیں۔ اس سے زیادہ کوئی بات میرے علم میں نہیں۔ آپکے اخبار نکالنے کے بعد ان کا جو کچھ طرزِ عمل رہا، وہ بھی مجھے معلوم نہیں ....! میں انھوں نے جو مضمون لکھا تھا وہ میری نظر سے گذرا تھا اور اس میں کوئی بات مخالفانہ نہ تھی۔ اگر ممکن ہو تو تفصیلات سے مطلع کیجیے۔

حالات کی نوعیت سے یقیناً قطع نظر نہیں کیا جاسکتا، تاہم میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ لوگ اپنی جانب سے کسی حالت میں بھی مخالفت نہ کریں اور صرف اپنے کام کی تحسین و تکمیل میں مشغول رہیں۔ بوجوہ یہ نہ صرف آپ کے کام کے لیے بلکہ بہ حیثیتِ مجموعی مفادِ عامّہ کے لیے ضروری ہے۔ آپنے اگر مضبوطی کے ساتھ یہ مسلک اختیار کرلیا تو یقین کیجیے کہ ہر حال میں کامیابی آپ ہی کے لیے ہوگی، گو ابتدا میں تشویشِ خاطر کے اسباب پیدا ہوتے رہیں۔

آج میں نے مسٹر ایبٹ نامی ایک امریکن ایجنٹ کو اشتہارات کے لیے "انقلاب" کا نام بھی نوٹ کرا دیا ہے۔ وہ غالباً آپسے مقدارِ اشاعت وغیرہ دریافت کریگا۔ آپ مناسب جواب دے دیجیے گا۔ یہ شخص مجھ سے مشورہ لینے کے لیے آیا تھا میں نے مناسب موقع دیکھ کر بعض اخبارات کے نام نوٹ کرا دیے۔

ابوالکلام

(۱۴)

کلکتہ

۲۹۔ ستمبر ۱۹۲۷ء

عزیزی، السّلام علیکم

بہتر تھا کہ شملہ میں آپ مجھ سے مل لیتے۔ "بہتر تھا" یعنی آپ کے لیے بہتر تھا۔

یہ مقصود نہ تھا کہ اپنی کسی غرض سے آپ کو شملہ تک آنے کے مصارف سے گرانبار کروں۔ میں شملہ ۱۷ کو پہنچا اور ۲۲ تک ٹھہرا۔ ۲۱ کو ایک خط ملا جو کوئی صاحب ہوٹل میں دے گئے تھے۔ کھولا تو آپ کا خط، غالباً آپ کے بھائی کے نام تھا۔ اس میں آپ لکھتے ہیں کہ میری موجودگی سے مطلع کیا جائے اولاً تو جس موجودگی کی اطلاع بذریعۂ تار آپ کو ۱۶ تک مل چکی تھی، اس کی مزید تحقیق کی علت ناقابلِ فہم ہے۔ ثانیاً قیام شملہ کے ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد ۲۱ کو اظہارِ آمادگی میرے لیے کیا سود مند ہو سکتا تھا! میں کمیٹی کے اختتام کے بعد ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً عدم اجتماع پر قناعت کی میں نے اپنے طور پر آپ کے اور مولوی عبدالقادر صاحب کے نہ آنے کی علت سمجھ لی ہے۔ یہ خط اس لیے لکھتا ہوں تاکہ شملہ کے بعد از وقت خط کا جواب بھیج دوں۔ امید ہے اپنے کاموں میں مشغول اور مسرور و مطمئن ہونگے

شملہ کمیٹی کی تمام تجاویز شائع ہو چکی ہیں۔ یہ بہ اصرار اس لیے شائع کرائی گئیں تاکہ رائے عامہ کو نظر و بحث کا موقع ملے۔ خاموش نہیں رہنا چاہیئے، بلکہ دو پہلوؤں پر بہ تفصیل دفعات بحث کرنی چاہیے۔

لہ مولانا ایک کمیٹی کے اجلاس کے لیے شملہ تشریف لائے تھے اور اس موقع پر مجھے بھی بلایا تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ ممکن ہے وہ نہ آسکیں اور شملہ کا سفر میرے لیے دورانِ سر اور امتلا کی وجہ سے اس درجہ تکلیف دِہ تھا کہ انتہائی مجبوری کے بغیر اس پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنے بھائی کو سنا در نزد دِ دھرم پور خط لکھا کہ شملہ پہنچ کر مولانا کی تشریف آوری کے متعلق تار کے ذریعے سے اطلاع دی جائے۔ اسے شملہ پہنچنے میں دو روز کی دیر ہو گئی۔ اس اثنا میں وہ کام پورا ہو گیا جس کے لیے مولانا آئے تھے۔ میرے شملہ پہنچنے میں صرف اس لیے تاخیر ہوئی تھی کہ مولانا کی تشریف آوری کا یقین حاصل کیے بغیر سفر کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ معلوم نہیں، ان کے ذہن مبارک میں میرے اور مولانا عبدالقادر قصوری کے نہ پہنچنے کی کیا علت آئی تھی۔

۱۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تجاویز کا موازنہ کر کے دکھلانا چاہیے کہ مسلمانوں کی اسپرٹ کس درجہ کشادہ دلی، معقولیت اور حریت عمل و فکر پر مبنی ہے اور ہندوؤں کی تجاویز میں کس درجہ تنگدلی اور غیر منطقی تضاد فکر اور ناہمواری رائے پائی جاتی ہے۔

۲۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے لیے ضروری تھا کہ جہاں تک مذہبی جھگڑوں کا تعلق ہے، یونیٹی کانفرنس دہلی کی تجاویز کو بنیاد بحث قرار دیتے۔ کیونکہ جس نقطے تک وہ پہنچ چکے ہیں (گو عمل کی توفیق نہ ملی ہو) اس سے آگے بڑھنا یا اقلاً اس پر قائم رہ کر مزید طریق مصالحت پر غور کرنا چاہیے، نہ کہ پیچھے ہٹنا چاہیے لیکن یہ بات نظر انداز کر دی گئی۔ ضرورت ہے کہ آیندہ اس غلطی سے احتراز کیا جائے۔ جہانتک مذہبی نزاعات کا تعلق ہے، دہلی کی تجاویز بنا رکا رہیں الا یہ کہ مزید اصلاح و عملیت کے لحاظ سے نظر ڈالی جائے۔ آیندہ سلسلہ بحث پولٹیکل نزاعات سے شروع ہونا چاہیے۔

مسٹر سری نواس آینگر پریسیڈنٹ کانگرس نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ جہاں تک گاؤکشی کا تعلق ہے، ہندوؤں کو مسلمانوں پر کوئی شرط عائد نہیں کرنا چاہیے اور جہاں تک میوزک کا تعلق ہے مسلمانوں کو بھی یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے مسلمان ممبروں نے بالاتفاق اسے منظور کر لیا لیکن ہندو ممبروں نے بالاتفاق اس سے اختلاف کیا سب کمیٹی کے مسلمان ممبروں نے یہی تجویز اپنی جانب سے پیش کر دی، جو رپورٹ میں موجود ہے۔

اس پر بحث کرنی چاہیے اور دونوں جماعتوں کے نقطۂ نظر کا فرق واضح کرنا چاہیے۔

مولوی صاحب[۵] سے اگر ملاقات ہو تو میرا سلام پہنچا دیں اور کہیں، مقصود صرف یہ تھا کہ ایک مدت کے بعد ملاقات ہو جائے اس کے سوا کوئی بات پیش نظر نہ تھی۔

ابو الکلام

(۱۴۷)

۸ اگست ۲۸ء

عزیزی،

کچھ معلوم نہیں آپ کس حال میں ہیں، کچھ عرصہ ہوا مولوی محی الدین صاحب اور مولوی عبداللہ صاحب سے دریافت کیا تھا لیکن تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے دہلی نہ آنے کا فیصلہ کر کے غلطی کی ہے۔ آپ صرف گردوپیش سے متاثر ہیں اور مستقبل کے لیے کوئی نگاہ نہیں رکھتے۔ تاہم اصل مقصد سلامتی و فلاح ہے۔ جہاں اور جس حالت میں حاصل ہو اس کو ترجیح ہے۔ اس بارے میں میری جانب سے تعدی تھی، اصرار نہ تھا۔

سر دست ایک نہایت ضروری معاملہ مرکزی خلافت کمیٹی کا آئندہ اجلاس ہے جو ۲۵ اگست کو دہلی میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس سال کمیٹی کا کوئی اجلاس نہیں بلایا گیا تھا اور بظاہر پورا سال اسی عالم میں نکل جانے والا تھا، لیکن چونکہ کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا معاملہ پیش آ گیا۔ نیز ایک خاص تجویز جو سوال فنڈ[۶]

---

۵ مولوی صاحب سے مراد مولانا عبدالقادر قصوری ہیں۔

۶ انگورہ فنڈ کا روپیہ سیٹھ چھوٹانی مرحوم[۱۵] کے پاس جمع تھا۔ انھیں کاروبار میں خسارہ ہوا تو اس سرمایے پر بھی زد پڑی۔ خسارے کی وجہ بھی یہ تھی کہ انھوں نے تحریک خلافت میں پیش قدمی کی تھی، اس بنا پر حکومت کے مخالفانہ اثرات نے انھیں نقصان کا ہدف بنا دیا۔

Saw Mill کے تصرف کے لیے کی گئی تھی۔ اس پر میری جانب سے اعتراض ہوا، اس لیے جلسے کا اعلان کیا گیا ہے۔

غالباً سوا مل والا معاملہ اس میں پیش کیا جائے۔ یہ انگورہ فنڈ کا تقریباً سترہ لاکھ روپیہ نقد تھا، جو لکڑیوں کی فروخت سے حاصل ہوا تھا اور ہلالِ احمر کو نہیں بھیجا گیا تھا۔ خلافت کمیٹی یکے بعد دیگرے بہ اسم قرض، روپیہ لے کر خرچ کرتی رہی اور اب یہ تجویز پیش ہے کہ بقیہ روپیہ (بہ اسم قرض) لے کر بمبئی میں ایک مکان خرید لیا جائے تاکہ مرکزی کمیٹی کا مستقل دفتر قائم ہو جائے۔

بغیر اس کے کہ مرکزی کمیٹی کی رائے لی جائے، یہ محض ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے رائے لے کر (اور وہ بھی تحریراً) مکان خریدا جا رہا تھا لیکن میں نے شوکت صاحب کو لکھا کہ یہ کارروائی قطعاً غلط ہوگی۔ اگر ایسا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ مرکزی کمیٹی کا جلسہ کر کے استصواب کر لیا جائے۔

انگورہ فنڈ ایک خاص مقصد کے لیے موہوب مال ہے اور وہ بغیر رائے عامہ کے استصواب کے شرعاً و قانوناً کسی دوسرے کام میں خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ اگر یہ

(بقیہ گزشتہ) ان کے پاس آرے کا ایک بہت بڑا ذخیرہ رہ گیا تھا، وہی انگورہ فنڈ کے بدلے میں مجلسِ خلافت کے حوالے کر دیا۔ اس کارخانہ نیز لکڑی کی فروخت سے سترہ لاکھ روپے وصول ہوئے۔ اس میں سے کچھ مبلغ یہ مجلسِ خلافت نے قرض لے کر خرچ کر دیا تھا۔ مولانا شوکت علی مرحوم کی خواہش تھی کہ باقی روپے سے بمبئی میں ایک مکان خریدا جائے جو مجلسِ خلافت کے لیے مستقل دفتر کا کام دے۔ مولانا ابوالکلام کی رائے تھی کہ یہ روپیہ ایک خاص مقصد کے لیے جمع ہوا تھا اور اس کی حیثیت موہوب مال کی ہے لہٰذا یہ مال رائے عامہ کے استصواب کے بغیر شرعاً اور قانوناً کسی دوسرے کام میں صرف نہ ہونا چاہیے۔ بہرحال مولانا شوکت علی مرحوم نے مجلس کی منظوری سے مکان خرید لیا جو اب تک دفترِ خلافت کے نام سے موجود ہے۔

فیصلہ کر لیا جائے کہ اسے خلافت کمیٹی کے کاموں کے لیے خرچ کرنا چاہیے تو پھر اس کا تصرف قابل اعتراض نہ ہوگا۔ غالباً ۵ اکو یہ چیز جلسے میں آئیگی۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ مرکزی کمیٹی کے تمام ممبر اس میں شریک ہوں اور معاملہ پر غور و فکر کر کے ایک آخری فیصلہ کر دیں۔ آخر یہ منحوس سوال[16] کا معاملہ اس طرح کب تک معلق پڑا رہیگا۔
میں چاہتا ہوں کہ آپ اور مرکزی کمیٹی کے تمام ممبران پنجاب اس موقع پر ضرور شریک ہوں۔ اس مسئلہ کے علاوہ کانسٹی ٹیوشن کا معاملہ ہے اور وہ بھی بنگال اور پنجاب کے لیے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔
یاد رکھیے کہ اس معاملے کے متعلق سر دست اخبار میں ایک لفظ نہیں لکھنا چاہیے ایسا کرنا سخت غلطی ہوگی۔ جب تک کوئی تجویز بہ حیثیت تجویز کے پیش نہیں ہوتی ہے یا محض ذاتی طور پر بعض اشخاص کے ذہن میں ہے، کسی طرح جائز نہیں کہ ہر ایک میں اس پر ردّ و کد کی جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مجوّزہ جلسہ میں شریک ہونا چاہیے، اُمید ہے کہ آپ اخبار میں اس کا کوئی تذکرہ نہ کرینگے۔

والسّلام

ابوالکلام

(۱۵)

۳۔ اسٹور روڈ، بالی گنج، کلکتہ

۲۱ اگست ۱۹۲۸ء

عزیزی

ایک معاملہ کے لیے تھوڑی سی زحمت دینی چاہتا ہوں منشی محمد دین صاحب

خوشنویس نے دلی میں کہا تھا کہ وہ لاہور جا رہے ہیں اور متن کی کتابت کے لیے کاپیاں لاہور بھیج دی جائیں۔ میں انھیں دو خط لاہور کے پتے سے لکھ چکا ہوں، لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ آپ براہِ عنایت دریافت کر کے لکھیے کہ وہ لاہور میں ہیں یا نہیں؟ ان کا پتہ اندرون لوہاری دروازہ، گلی سرکی بندان، دفتر خوشنویسان ہے۔[1]

"انقلاب" عرصے سے آپ نے بھیجنا بند کر دیا ہے، اس لیے نظر سے نہیں گزرتا لیکن امید ہے سب و شتم میں آپ کی جانب سے کوئی کوتاہی نہ ہوتی ہو گی معلوم نہیں، مقدار کا اب کیا حال ہے۔ روزانہ، یا ہفتہ وار، یا بحساب فی ماہ؟[2]

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست
بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند!

ابوالکلام

---

[1] منشی محمد دین مرحوم مشہور خوشنویس تھے اور مولانا ان سے "ترجمان القرآن" جلد اوّل کا متن لکھوانا چاہتے تھے۔

[2] یہ نہرو رپورٹ کا دور تھا، جس کے سلسلے میں "انقلاب" کو کانگریس اور اس کے کارفرماؤں کی روش سے اختلاف پیدا ہوا اور حالات کے تقاضے کی بنا پر اختلاف نے خاصی شدت اختیار کر لی۔ فرائض عامہ کی بجا آوری میں انسان اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق دیانت داری سے کام کرنا چاہے، تو بعض اوقات نہایت محبوب و عزیز تعلقات کی پوری نگہداشت نہیں ہو سکتی مجھے یہ ایک زندگی میں اسی موقع پر نہیں بلکہ بارہا اس قسم کی آزمائشوں سے سابقہ پڑا۔

(۱۶)

۳ اسٹور روڈ کلکتہ

۲۵ ۶/۳۲

عزیزی،

بیماری کی وجہ سے جواب نہ دے سکا، لیکن کتاب بھجوادی تھی۔ مجھے خیال نہیں، جو نسخہ مولوی شفاعت اللہ نے آپ کو بھیجا تھا، اس پر میں نے کچھ لکھا تھا یا نہیں! لیکن اگر نہیں لکھا تھا، تو غالباً اس لیے کہ میں نہیں سمجھا تھا، آپ اب اس کے خواہشمند ہونگے۔ جو شخص آٹھ سال سے سلمانان ہند کے حقوق ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کرتا رہا ہو، جس نے تحفظ حقوق کے موقع پر ایمان فروشی کی ہو اور جو گاندھی کے چیلوں اور استینوں میں داخل ہو، اس کی تحریر آپ کے لیے کیوں کر موجب برکت و افتخار ہو سکتی ہے؟ لیکن اب چونکہ آپ نے خواہش ظاہر کی ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں، مجھے تامّل ہو۔ میں نے ایک دوسرے نسخے پر مطلوبہ تحریر لکھ کر بھجوادی ہے۔[۱]

۱۔ اختلاف کے دور میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی بڑی حد تک منقطع رہا۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر میں لندن گیا۔ واپس آیا تو بمبئی میں جہاز پر مولانا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا جس جہاز میں گاندھی جی ولایت سے آرہے تھے محض اتفاق سے اسی جہاز پر میں پورٹ سعید سے سوار ہوا۔ مولانا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبروں کے ساتھ گاندھی جی سے بات چیت کے لیے جہاز پر پہنچے ہوئے تھے۔ لاہور پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولانا کی طرف سے "ترجمان القرآن" کی دو جلدیں آئی تھیں۔ ایک میرے لیے اور دوسری سالک صاحب کے لیے۔ میری جلد پر نہ مولانا کی طرف سے کوئی تحریر تھی اور نہ ان کے دستخط تھے۔ میں نے آتے ہی ان کی خدمت میں عریضہ بھیجا ہے کہ مجھے ترجمان کا جو نسخہ مرحمت فرمایا، وہ تو میں ہر دکان سے خرید سکتا تھا۔ میرے نسخے پر کچھ تحریر فرما کر بھیجتے تو اسے میں واقعی ایک گراں قدر

زمینِ عشق بہ کونینِ صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن [۱۸]

عزیزمن! محض باتوں سے تو کچھ بنتا نہیں۔ اصل چیز عمل ہے۔ آج مسلمانوں کی زندگی و سعادت کے لیے کوئی کام اس درجہ اہم اور ضروری نہیں ہے، جس قدر یہ کام کہ قرآن کی تعلیم اپنی حقیقی شکل و نوعیت میں نمایاں ہو اور مسلمانوں میں اس کی عالمگیر اشاعت عمل میں آئے لیکن آپ نے ترجمان القرآن کے لیے کیا کیا؟ کیا آپ کا فرض نہیں تھا کہ ملک کو کام کی اہمیت و ضرورت کے مطابق توجہ دلاتے! یہ میں اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ آپ کو اس کی اب ترغیب دوں اور آپ اس کے لیے مضامین لکھیں۔ یقیناً آپ اس سے بیخبر نہیں ہو سکتے کہ میں اپنی مصنفات کی اشاعت کے لیے اس کا محتاج نہیں ہوں۔ ملک میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو میرے قلم سے نکلی ہوئی چیزیں پڑھنا چاہتی ہے اور وہ ہر حال میں پڑھتی ہے اور شاید اردو مطبوعات کی تاریخ میں "ترجمان القرآن" پہلی کتاب ہے جسے لوگوں نے اس قدر ذوق و عشق کے ساتھ خریدا اور پڑھا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں نے کہاں تک ادائے فرض کی کوشش کی اور اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا ہنگامہ جو بلند کیا جاتا ہے، وہ کہاں تک با معنی ہے[لے]!

ہاں، جہاں تک حسنِ کتابت کا تعلق ہے آپ کو سالک صاحب کا توفق تسلیم ہی کر

(بقیہ گزشتہ) عطیہ سمجھتا۔ مولانا نے ازراہِ نوازش دوسرا نسخہ اپنی تحریر اور دستخط سے مزین فرما کر بھیج دیا۔

لے بلاشبہ مولانا کی تحریرات ہماری یا کسی دوسرے فرد یا گروہ کی تحسین یا سفارش کی محتاج نہیں، بلکہ ہمارے جیسے ہزاروں افراد ان کی سفارش کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے تھے

لینا چاہیے، البتہ آپ کی تسکینِ خاطر کے لیے یہ بات کفایت کرتی ہے کہ موجودہ زمانے میں بدخط ہونا نہ صرف موجبِ قدح نہیں بلکہ موجبِ بزرگی ہے۔ سروالٹر اسکاٹ کو معذرت کرنی پڑی تھی کہ وہ بدخط نہیں ہے۔

والسلام علیکم
ابوالکلام

(۱۷)

کلکتہ
۱۷۔جنوری ۱۹۳۵ء

عزیزی
خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ گزشتہ جولائی میں یہ شکایت محسوس ہوئی تھی، لیکن دو چار دن کے معالجے سے دُور ہو گئی۔ اب پھر عید کے بعد عود کر آئی اور پہلے سے شدید تر۔ بہرحال اب اللہ کا فضل ہے۔ تھوڑی سی خلش جو باقی رہ گئی ہے، اُمید ہے دو چار دن میں دُور ہو جائیگی۔[۲]

والسّلام
ابوالکلام

---

[۱] سالک صاحب کا خط اتنا عمدہ ہے کہ ان کی تحریر حسنِ کتابت کا ایک نادر مرقّع ہوتی ہے۔ اور میں ان کے مقابلے میں بدخط ہوں۔ مولانا نے سالک صاحب کے خط کی ستائش فرمائی اور لطیفے کے طور پر میری بدخطی کے لیے تعریف کا دوسرا پہلو پیدا کر دیا۔

[۲] مولانا کو عرق النساء کی شکایت پیدا ہوئی یہ خبر شائع ہوئی تو میں نے ایک عریضہ بھیجا کہ بیماری کی تفصیل

(۱۸)

۱۵ فروری ۱۹۳۸ء

عزیزی

خط پہنچا۔ اس اخلاص و محبت کے لیے اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ مجھے پہلے پہل یہ شکایت گزشتہ جولائی میں محسوس ہوئی۔ ایک دن صبح اٹھا تو بائیں ران میں درد تھا۔ پہلے خیال ہوا ویسے ہی درد ہو گیا ہے، لیکن جب دوسرے دن بڑھ گیا تو عرق النساء کی طرف ذہن منتقل ہوا، کیونکہ اس کا درد اوپر سے نیچے کی طرف اترتا ہے اور یہی علامت (اسے) روماٹزم سے ممتاز کرتی ہے۔ بہر حال ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، تو انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی اور اس کے لیے دوا تجویز کی۔

دوا محض گولیاں تھیں لیکن اس کے استعمال سے فوراً درد میں کمی شروع ہو گئی۔ اور دو دن کے بعد بالکل رفع ہو گیا تھا۔

اس کے بعد افاقہ ہوا۔ لیکن ۱۴ جنوری کو پھر اچانک عود کر آیا۔ اس مرتبہ پہلے سے زیادہ شدید تھا اور صرف پاؤں پر زور ڈالنے سے محسوس نہیں ہوتا تھا بلکہ بیٹھنے اور لیٹنے کی صورت میں بھی، خصوصاً شب کے وقت۔ جو گولیاں پہلے کھائی تھیں وہی ڈاکٹروں نے تجویز کیں، لیکن اس مرتبہ دیر میں اثر ہوا۔ ڈاکٹر پچھلی دفعہ ہی مصر ہوئے تھے کہ مستقل علاج کے لیے وقت نکالوں۔ آج کل مسلسل فاقہ، تنقیہ اور مالش پر زور دیتے ہیں۔ اور الکٹرک باتھ کو بھی مفید بتلاتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم ایک ماہ تک روزانہ سلسلہ جاری رہے اور ہر روز کئی گھنٹے

(باقی گزشتہ) سے آگاہ فرمائیں۔ مولانا نے یہ مختصر سا جواب ارسال فرمایا۔ میں نے دوبارہ لکھا تو پوری تفصیلات بیان فرمائیں۔ ان کے لیے اگلا مکتوب ملاحظہ فرمائیے۔

خرچ کیے جائیں۔ میرے لیے اس طرح کا علاج کم از مرض نہیں، بلکہ اس سے بھی اشد۔

اس مرتبہ پھر مُصر ہیں اور مجبوراً آمادہ ہوگیا ہوں کہ مرض کے شدائد کی طرح علاج کے شدائد کا بھی متحمل ہو جاؤں۔ میرے لیے دواؤں کی تلخی، تلخی نہیں ہے، آپریشن کی سختی، سختی نہیں ہے۔ وقت کا مسلسل خرچ کرنا ناقابلِ برداشت ہے، لیکن کیا کیا جائے۔

گر نہ ستانی بہ ستم می رسد [19]

میں طبّی علاج سے بیخبر نہیں ہوں۔ طب پڑھی ہے اور پڑھائی بھی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ وہاں بھی مہینوں کا سوال ہے اور ہر معاملہ تنقیہ سے شروع ہو جاتا ہے [1]۔ بہرحال اگر اس بارے میں وہ حکیم صاحب، جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، کوئی مشورہ دے سکیں تو شکرگزار ہونگا [2]۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

خون کا امتحان کیا گیا اور معلوم ہوا کہ یورک ایسڈ کا چنداں اندیشہ نہیں، لیکن اطبّاء تو زیادہ تر خون کی رقّت و غلظت کی طرف جاتے ہیں۔ اسے اہمیّت نہیں دیتے۔ بہرحال ممکن ہے یہ بات رائے قائم کرنے میں کچھ مدد دے۔

---

[1] یہ اس لیے فرمایا کہ میں نے عرض کیا تھا، ایک بلند پایہ طبیب میرے عزیز دوست ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تفصیلات معلوم ہوں تو آپ کا علاج کریں۔

[2] یہ شفاء الملک حکیم فقیر محمد صاحب چشتی نظامی تھے۔ انھوں نے بڑی محبت اور توجّہ سے علاج کیا۔ جیسا کہ اگلے خطوط سے واضح ہوگا۔

(۱۹)

۲۲ جولائی ۱۹۳۵ء

عزیزی،

میں نے لکھا تھا، جونہی بارش کا موسم شروع ہوگا، حکیم صاحب کی دوا استعمال کرنا شروع کرونگا اور نتیجہ سے مطلع کرونگا۔ اب میں نے دوا ختم کرلی ہے۔ یہ موسم بنگال میں بہت مرطوب ہوتا ہے۔ اندیشہ تھا کہ شاید یہ مرض عود کرے، لیکن الحمدللہ کہ اس وقت تک کوئی شکایت محسوس نہیں ہوئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ دوا کی تاثیر و عدم تاثیر کا کیونکر فیصلہ کیا جائے! شکایت مسلسل و جاری نہ تھی کہ مرض کی حالت میں استعمال کی گئی ہو۔ جب استعمال کی گئی تو شکایت نہ تھی، اور اب بھی نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آگے چل کر عود کرتی ہے یا نہیں۔ اگر حکیم صاحب کہیں تو خون کا امتحان پھر کرایا جاسکتا ہے۔ اس سے پتہ لگ سکتا ہے کہ قبل از استعمال حالت بدستور باقی ہے یا اس میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔ آپ نے میرے پچھلے خط کا جواب نہیں دیا۔ غالباً اس لیے کہ آپ لاہور میں نہیں تھے۔ اُمید ہے آنکھوں کی تکلیف اب دُور ہوچکی ہوگی۔ اور بخیر و عافیت ہونگے [1]

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ،

ابوالکلام

---

[1] مجھے ۱۹۳۴ء میں آشوبِ چشم کا عارضہ ہوا تھا جس نے مدتِ مدید تک مجھے پریشان رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں کم و بیش چھ مہینے میں نے پہاڑ پر بسر کیے۔

(۲۰)

۳۰ جولائی ۱۹۲۵ء

عزیزی،

خط پہنچا، مرض کی تفصیلات پڑھ کر نہایت قلق ہوا۔ میرا خیال تھا کہ آشوب کی معمولی شکایت ہے۔ آج کل آنکھوں کا بہترین ڈاکٹر کلکتہ میں ہے۔ اگر آپ اکتوبر میں یہاں چند دنوں کے لیے آجاتے اور اُسے دکھاتے، تو عجب نہیں کہ علاج کا بہتر سامان ہو جاتا۔ بہر حال خدا کرے جو علاج سر دست جاری ہے، پوری طرح کامیاب ثابت ہو اور تمام شکایتیں دُور ہو جائیں۔

"ترجمان القرآن" کی دوسری جلد "مدینہ پریس" میں چھپ رہی ہے۔ کتابت کے لیے یہاں کاتب بُلا لیا ہے۔ پینتالیس کاپیاں جا چکی ہیں اور تیس پتھر چھپ چکے ہیں۔ متن اور ترجمہ چونکہ ایک ہی آدمی لکھ رہا ہے اور نوٹس کی وجہ سے ہر صفحہ میں تین قلم ہو گئے ہیں، اس لیے رفتار سست ہے۔ تاہم اُمید ہے، اکتوبر میں نکل جائے۔ یہ جلد چھ سو صفحوں پر ختم ہو رہی ہے اور بارہ پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تیسری میں بقیہ دس پارے ہونگے۔ چونکہ کتابت و طباعت کا سلسلہ جاری رہیگا، اس لیے اُمید ہے آیندہ فروری تک تیسری جلد بھی نکل جائے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابو الکلام

اگر آپ وہاں علاج میں مشغول نہ ہوتے تو میں کہتا، اسی وقت کلکتہ آجائیں۔ آجکل یہاں میڈیکل کالج میں دو شخص ہیں اور دونوں سب سے بہتر ماہر امراض چشم تسلیم

کیے جاتے ہیں۔[1]

(۲۱)

۲۵ اکتوبر ۱۹۳۵ء

عزیزی،

دوا کے لیے آپ کا اور حکیم صاحب کا شکر گزار ہوں۔ اب موسم بدلا ہے پتہ چلیگا کہ شکایت کا کیا حال ہے۔ بارش میں ایک مرتبہ خلش ہوئی تھی، لیکن علاج سے دُور ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کامل عطا فرمائے "ترجمان القرآن" جلد دوم میں اعراف سے مومنون تک کا حصّہ آ گیا ہے اور اب صرف فہرست اور دیباچے کی کتابت باقی ہے۔ اس جلد میں تشریحات کی مقدار بہت بڑھا دی ہے حتّٰی کہ یہ پوری کی پوری تفسیر کا کام دیگی مثلاً توبہ کے بتّیس صفحے، یونس کے آخر میں دس صفحے، ہود کے آخر میں نو صفحے، یوسف کے آخر میں بیس صفحے، نحل کے آخر میں آٹھ صفحے مزید مباحث تفسیر کے ہیں۔ اسی طرح اسریٰ، کہف، طٰہٰ، انبیا، حج کے آخر میں تفصیلات بڑھادی گئی ہیں۔ کہف کا آخری حصّہ غالباً چالیس صفحے تک پہنچ گیا ہے۔ کیونکہ اصحاب کہف، ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کے مباحث بغیر اطناب کے حل نہیں ہو سکتے تھے، انبیاء کا آخری نوٹ بھی بارہ تیرہ صفحوں سے کم نہ ہوگا اور چونکہ یہ فٹ نوٹ خفی قلم میں لکھے گئے ہیں اور ہر صفحے میں چھتیس سطریں ہیں اس لیے انھیں متوسّط کتابت میں

---

[1] میں پہاڑ پر تھا اور وہاں تین ماہر ڈاکٹروں کے مشورے سے علاج ہو رہا تھا اسی لیے فرمایا کہ علاج شروع نہ ہوتا تو کہتا کہ اسی وقت کلکتے آ جاؤ۔

کا سہ گنا حصّہ سمجھنا چاہیے۔

جو جہات پہلی جلد میں رہ گئے تھے، یعنی بخیالِ اختصار انھیں چھوڑ دیا گیا تھا، وہ بھی ان سورتوں کے ضمن میں آگئے ہیں۔

تیسری جلد کی کتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہیگا اور اُمید ہے کہ آیندہ آٹھ مہینوں میں یہ کام ختم ہو جائیگا۔

چونکہ کثرت سے لوگ دریافت کر رہے ہیں، اس لیے میں آج ایک مختصر اطلاع دے رہا ہوں کہ اخبارات میں بھیج دی جائے۔ چند دنوں کے بعد ایک مفصّل اعلان بھی شائع کر دیا جائیگا۔

کتاب آیندہ ماہ میں نکل جائیگی۔ شاید جلد سازی کچھ وقت اور لے لے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

میری صحت کے لیے آپ نے جس محبّت و اخلاص سے پرسش کی ہے، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ جناب حکیم صاحب کو بھی میرا پیامِ شکریہ پہنچا دیجیے۔

(۲۲)

۵ دسمبر ۳۵ ۱۹ء

عزیزی

خط پہنچا، حکیم صاحب کا اور آپ کا شکر گزار ہوں۔ جو دوائیں آپ نے بھیجی تھیں، میں نے استعمال کر لی تھیں کیونکہ یہ محبّت کا تحفہ تھا اور "جوہرِ منقّی" نافع ہو یا نہ ہو، لیکن جوہرِ محبّت کے نفع میں کوئی شبہہ نہیں۔

این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند![20]

ادھر ایک مرتبہ خلش محسوس ہوئی تھی، لیکن میں نے بڑھنے نہ دی۔ ایک گولی جو ڈاکٹروں نے تجویز کی ہے اور فوری تاثیر رکھتی ہے، استعمال کرلی۔ اب جاڑے میں عود کا اندیشہ تھا لیکن اس وقت تک شکایت محسوس نہیں ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ "جوہر منقیٰ" اور "معجون عشبہ" نے ضرور کچھ نہ کچھ اثر کیا ہے[1]۔ مرض کی نوعیت ایسی ہے کہ جب تک کافی عرصہ کے لیے حالت نہ دیکھ لی جائے، تاثیر و عدم تاثیر کا قطعی فیصلہ نہیں ہوسکتا۔

آپ کے اس خط سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی شکایت اصلاً آنکھوں کی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے جس کے اثرات کا اشتداد آنکھوں میں ہوتا ہے لیکن ڈاکٹر اور اطبّار کونسا مرض تجویز کرتے ہیں؟ اصل سوال صحت تشخیص ہے۔ کیا آپ مطمئن ہیں کہ تشخیص کا مرحلہ طے ہوگیا؟ اکثر حالات میں غلطی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

"ترجمان القرآن" کا معاملہ صاحب مطبع کے ہاتھ میں ہے۔ سورۂ مومنون پر جلد ختم کردی گئی — اب تیسری جلد کے لیے سورۂ نور کی کتابت ہو رہی ہے۔ وہاں صرف دیباچے اور فہرست کا مرحلہ باقی تھا۔ اگر بہت دیر ہوئی، جب بھی اس ماہ کے آخر تک نکل جانا چاہیے۔ میں نے انھیں لکھ دیا ہے کہ تکمیل کے بعد کچھ نسخے بذریعۂ پارسل بھیج دیں تاکہ مال گاڑی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ جونہی پارسل آیا، آپ کے لیے ایک نسخہ فوراً بھیج دیا جائیگا۔

آپ اس کام میں جو دلچسپی لے رہے ہیں، اس سے زیادہ اور کونسی بات ہو

---

[1] حکیم صاحب مرحوم جو دوائیں بھجواتے رہے تھے ان میں سے جوہر منقیٰ اور معجون عشبہ خاص طور پر قابلِ ذکر تھیں۔ یہ دورانِ علاج میں مسلسل استعمال ہوتی رہیں۔

سکتی ہے، جس کے لیے آپ کو لکھوں! اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

جناب حکیم صاحب کو پیام سلام و تشکر پہنچا دیں، نیز سالک صاحب کو۔

ابوالکلام

(۲۳)

۲ جنوری ۱۹۳۶ء

عزیزی،

جس تحریر کا آپ نے حوالہ دیا ہے، وہ ذہن میں ہے، مگر تفصیلات معلوم نہیں۔ اگر میں نے دربار آگرہ کا ذکر کیا ہے[۱] تو محض قیاس ہی کی بنا پر ہوگا۔ اب آپ نے اس باب میں کاوش کی ہے اور تاریخوں کا تطابق ڈھونڈا ہے، تو یقیناً آپ کو رائے قائم کرنے کا بہتر موقع حاصل ہے۔ تاریخیں دیکھیے اور ان کی مناسبت سے قصیدے کا موقع متعین کیجیے۔

قصیدے میں غالباً اخبار لدھیانہ کا حوالہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے دربار دہلی میں نہ ہوگا، ورنہ اس کی اطلاع اخبار کے ذریعے کیوں ملتی! غدر کے بعد چھوٹے بڑے متعدد دربار ہوئے۔ بہت ممکن ہے کوئی صوبے کا مقامی دربار ہوا ہو۔

---

[۱] نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم کے پاس غالب کے اردو دیوان کا ایک نسخہ تھا جس میں کچھ غیر مطبوعہ غزلیں بھی سادہ اوراق پر درج تھیں اور دو قصیدے بھی۔ مولانا نے ان غیر مطبوعہ اشعار کی نقل حاصل کر لی تھی اور یہ اشعار بالاقساط "الہلال"

طالب مرحوم کے نسخے سے جس قدر کلام ملا ہے، وہ "الہلال" میں بہ دفعات شائع ہو چکا ہے۔ دو قصیدے تھے، دو غزلیں تھیں، ایک:

آپ نے "مسنی الضر" کہا ہے کہ نہیں؟
یہ بھی اے حضرتِ ایوب! گلا ہے کہ نہیں؟

اور دوسری، ع

تو اس کو کہتے ہیں اہل سخن "سخن تکیہ"[۱]

یہ دونوں غزلیں "الہلال" میں نکل چکی ہیں۔ شاید غدر کے بارے میں ایک اردو

(حاشیہ بقیہ) کی مختلف اشاعتوں میں شائع ہوئے۔ ایک قصیدہ ۱۷ جون ۱۹۱۴ء کی اشاعت میں چھپا تھا اور اس پر مولانا نے ایک مفصل مقالہ لکھا تھا۔ اس میں فرمایا تھا کہ قصیدہ ۱۸۶۰ء کے دربار آگرہ میں چھپا۔
میں نے تحقیق کی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ قصیدہ ۱۸۶۵ء میں ڈونالڈ میکلوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب کے لیے لکھا تھا۔ ۱۳ جنوری ۱۸۶۵ء کو دہلی میں ایک دربار ریل کے افتتاح کے لیے منعقد ہوا تھا، تو اس میں مرزا غالب بھی شریک ہوئے۔ لیکن انھیں نہ سابقہ قاعدے کے مطابق نشست ملی اور نہ خلعت ملا۔ پھر دربار کی رُوداد اخبارِ لدھیانہ میں شائع ہوئی تو اس میں میرزا کا نام بھی صحیح نہ لکھا تھا۔ ان حالات سے متاثر ہو کر میرزا نے یہ قصیدہ مع شکایت لفٹننٹ گورنر کو بھیجا۔ اپنی تحقیق کے متعلق میں نے مولانا کو اطلاع دی، تو اس کے جواب میں یہ تحریر آئی۔ بعد کے مکتوب میں بھی اس معاملے کا ذکر ملیگا۔

[۱] سخن تکیہ والی غزل ۲۲ جولائی کے "الہلال" میں شائع ہوئی تھی۔ "مسنی الضر" والی غزل کی نقل مولانا کے پاس تھی لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی کہ "الہلال"

قطعہ بھی تھا۔[۱]

صاحب "سرورش سخن" غالب کے شاگرد تھے۔ اُن کا نواسہ ہونا میرے علم میں نہیں ہے، لیکن ان کے تفصیلی حالات مرزا محمد عسکری[۲۲] جھوائی ٹولہ لکھنؤ سے مل جائینگے۔ اُن سے خط و کتابت کیجیے اور میرا حوالہ دیجیے۔

آپ نے خوب کیا ہے کہ تحریرات سے حالات کا استنباط کیا۔ یہ سوانح نگاری کی سب سے بہتر اور مستند قسم ہے۔[۲]

مولانا حالی کی سب سے بہتر کتاب "حیات سعدی" ہے اور سب سے کمتر "یادگار غالب"۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ مولانا ابراہیم صاحب[۲۲(الف)] نے کوئی کتاب لکھی ہے اور "ترجمان القرآن" کے کسی مقام پر اعتراضات کیے ہیں، عرصہ ہوا امرتسر کے ایک صاحب نے جو شال فروش ہیں اور ہر سال یہاں آتے ہیں۔ یہ ذکر کیا تھا کہ مولانا ابراہیم شاکی ہیں۔ انھوں نے "ترجمان القرآن" کے بارے میں کوئی خط لکھا تھا، مگر جواب نہیں ملا۔ چونکہ مجھے اُن کا کوئی خط نہیں ملا تھا، اس لیے متعجب ہوا اور خط لکھ کر دریافت

(حاشیہ بقیہ) ضبطیِ ضمانت کی وجہ سے بند ہو گیا۔ مولانا کا احساس یہی تھا کہ غزل شائع ہو چکی ہے نیز اس کی ردیف میں مولانا کو اشتباہ ہوا، اصل مطلع یوں تھا:

آپ نے مسّنی الضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی

[۱] اس سے مراد سید فخرالدین حسین سخن دہلوی ہیں۔ میں نے مولانا کے ارشاد کے مطابق میرزا محمد عسکری مرحوم کو خط لکھا تھا۔ مطلوبہ حالات تو معلوم نہ ہو سکے، لیکن مرحوم کے ساتھ خاصی دیر تک خط و کتابت جاری رہی۔

[۲] یہ میری کتاب "غالب" کی طرف اشارہ ہے۔

کیا کہ کب خط لکھا تھا اور معاملہ کیا ہے؟ مولانا ممدوح نے جواب میں اس خط
کی نسبت تو کچھ نہیں لکھا لیکن مبہم طور پر کسی تحریر کی طرف اشارہ کیا جس کا پروف
انھیں ملنے والا تھا اور جونہی ملیگا، وہ مجھے بھیج دینگے، نیز اپنی علالت کا عذر کیا
اس کے بعد نہ تو ان کا کوئی خط آیا اور نہ وہ پروف ملا۔ میرے ذہن سے بھی بات
اتر گئی۔ اب آپ نے لکھا تو خیال ہوتا ہے، شاید اُن کا اشارہ اس کتاب کی طرف
ہوگا۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد دو بار مولانا ممدوح کلکتہ آئے، مجھ سے
ملاقات بھی ہوئی اور انھوں نے اس معاملے کا کوئی ذکر نہیں کیا، نہ کتاب ہی
کے بارے میں کچھ کہا[۱]۔

---

[۱] مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی مرحوم و مغفور جس زمانے میں تفسیر سورۂ فاتحہ مرتب
فرما رہے تھے میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ مولانا آزاد کی تفسیر فاتحہ مشمولہ "ترجمان القرآن"
جلد اوّل پر بعض شبہات کیے جاتے ہیں ان کا بھی ازالہ فرما دیں۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب نے
اس سلسلے میں نہ جانے کس اثر کے ماتحت مناظرانہ رنگ اختیار کر لیا اور اپنی تفسیر میں تحریر
فرمایا کہ بعض امور کی توضیح کے لیے مولانا آزاد کو خط بھیجا، مگر اس کا جواب نہ ملا۔
میں نے مولانا سے اس باب میں استفسار کیا تو یہ جواب وصول ہوا۔ بحث کو مکمل کرنے کے
لیے یہاں عرض کر دینا چاہتا ہوں، میں نے مولانا محمد ابراہیم صاحب کو مولانا کا خط
دکھا کر پوچھا کہ آپ کلکتہ میں مولانا سے ملے، تو سب کچھ پوچھ کیوں نہ لیا۔ انھوں نے فرمایا
کہ بیشک مولانا کے ساتھ ملاقات کا فیصلہ ہو چکا تھا، لیکن رات کے وقت میرے پاؤں میں
تکلیف ہو گئی اور نقل و حرکت خالی از تعب نہ رہی۔ نیز ایک رفیق سے مولانا کے ساتھ گفتگو
کا ذکر آیا، تو انھوں نے کہا زحمت اٹھا کر جاؤ گے، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلیگا۔ میں اس رائے

بہرحال اگر آپ مجھے لکھیں، کیا شکوک ہیں تو میں انھیں رفع کرنے کی کوشش کرونگا۔
آپ لکھتے ہیں کہ عرصے سے آپ کو وہ شکوک درپیش ہیں۔ کیا اس صورت میں
یہ بہتر نہ تھا کہ مجھے لکھ دیتے، کتاب کو نکلے ہوئے پانچ برس ہو گئے۔[۱]
حکیم صاحب کو میرا تشکر و امتنان پہنچا دیجیے جس صورتِ حالات کا انتظار تھا
وہ رمضان شروع ہوتے ہی آ گئی، یعنی درد کا دورہ ہوا اور تمام پچھلے دوروں
سے سخت تر۔ تقریباً دس بارہ دن تک خلش رہی۔ اب افاقہ ہے مگر دوا استعمال
کر رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا جو ہر منقہ وغیرہ زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکے۔ ممکن
ہے زیادہ عرصے تک استعمال کرنے کی ضرورت ہو، بہرحال اب اس کی فکر
نہ کیجیے، اپنے علاج کی فکر کیجیے۔ اگر ہومیو پیتھک کا کوئی بہتر ڈاکٹر موجود ہے تو
ضرور اس کا علاج کیجیے۔ خود میرے علم میں بعض حیرت انگیز علاج آ چکے ہیں۔
مثلاً پکے ہوئے جگر کا بغیر عملِ جرّاحی درست ہو جانا۔ اس طریقِ علاج میں

(حاشیہ بقیہ) سے بہت متاثر ہوا اور رہ گیا۔ یہ تمام حالات میں نے ایک مرتبہ مولانا محمد
ابراہیم صاحب میر کے بیان کے مطابق "انقلاب" میں بھی شائع کر دیے تھے۔
واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر مولانا کی خدمت میں خط بھیجتے اور
جواب نہ آنے کا ذکر اپنی تفسیر میں فرما چکے تھے اور یہ حصّہ چھپ چکا تھا کہ انھیں کلکتہ
جانے کا اتّفاق ہوا۔ وہاں ملاقات کے لیے مولانا سے کہہ دینے کے باوجود بوجوہِ مذکورہ
مل نہ سکے اور ان امور کا ذکر کتاب میں نہ آ سکا اس لیے کہ وہ پہلے چھپ چکی تھی۔ اس
سلسلے میں بعض تفصیلات اگلے مکاتیب میں ملینگی۔

[۱] ان کا ذکر اگلے مکتوب کے حاشیے میں آئیگا

اصل کار دوا اور مرض کا تطابق ہے۔ اگر مطابقت ٹھیک ہو جائے، تو چند خوراکیں ہی کافی ہو جاتی ہیں۔
نیز احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ دوا کے استعمال سے دو گھنٹے پہلے اور دو گھنٹے بعد حقہ، سگریٹ کا استعمال قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ تیز بو دوا کا اثر کمزور کر دیتی ہے۔
کیا یہ شبہہ لاحق ہوا ہے کہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں ایاک نعبد و ایاک نستعین کا ٹکڑہ مستقلاً کیوں نہیں لیا گیا؟ لاہور سے ایک صاحب نے یہ بات لکھی تھی۔

ابوالکلام

(۲۴)

۱۵ جنوری ۱۹۳۶ء

عزیزی،

السلام علیکم

خط پہنچا۔ میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ آپ کا اشتباہ سخت تعجب کا موجب ہوا۔ اگر "ترجمان القرآن" کے مطالعے کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں اور اسلام کا نظام عبادت ہنگامی ہے، تو پھر میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا[1]

[1] شبہات مولانا نے خود درج کر دیے یعنی سورۂ فاتحہ کے خلاصۂ مطالب سے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں اور اسلام کا نظام عبادت ہنگامی ہے۔ مولانا کی اس تحریر کے بعد اپنے فہم کی نارسائی اور اپنے علم کی بے مائیگی پر حد درجہ ندامت ہوئی۔

مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان ساری باتوں میں سے ایک بات بھی میں نے اس کے صفحات پر نہیں لکھی تھی؛ جو مجھے لکھی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں!

آپ نے تفسیر سورۂ فاتحہ کے خاتمے کا حوالہ دیا ہے، میں نے اس وقت از سرِ نو اس پر نظر ڈالی، لیکن کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جو اس اشتباہ کا موجب ہو سکے۔ غالباً اس کا یہ جملہ موجب تردد ہوا ہے کہ اصل دین توحید ہے لیکن اگر یہ جملہ موجب تردد ہو سکتا ہے تو یقیناً قرآن کی بشمار آیتیں بھی ہو سکتی ہیں، کیونکہ ان سب میں یہی بات کہی گئی ہے۔ ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ الخ [23]

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون [24]

وقالوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھوداً او نصاریٰ تلک امانیھم، قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صدقین۔ [25]

بلیٰ من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ [26]

ولقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومہ فقال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ الخ [27]

کیا ہم ان آیات سے اور ان کی ہم معنی آیات سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ یقیناً نہیں کر سکتے، کیونکہ اسی قرآن نے بشمار مقامات پر خود بتلا دیا ہے کہ ایمان باللہ کی تفصیل کیا ہے اور نہ صرف ایمان "بالرسل" بلکہ "ایمان بالکتب و بالملائکہ" و "بالیوم الآخر" اس میں داخل ہے اور اس لیے جب کبھی "ایمان" اور "عمل" کہا جائیگا تو ایمان سے مقصود یہی ایمان ہوگا، نہ کہ کوئی دوسرا ایمان "اور عمل" سے مقصود یہی اعمال ہونگے، جنہیں اس نے عمل صالح قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ "عدم تفریق بین الرسل" بھی اس میں داخل ہے اور کوئی "ایمان بالرسل" جو "تفریق بین الرسل" کے ساتھ ہو، قرآن کے نزدیک ایمان نہیں۔ وہ کہتا ہے، اس زنجیر کی ایک کڑی کا انکار سب کا انکار ہے۔

پھر اگر قرآن کی ان آیات کا مطلب مقرّر و معلوم ہے تو یہ جملہ کہ "اصل دین توحید ہے" یا "اصل دین ایمان اور عمل" ہے، کیوں موجب تردّد ہو؟ بہ حیثیت مسلم ہونے کے ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اصل دین توحید ہے! یہ تو بہرحال کہنا ہی پڑیگا۔ اس تیرہ سو برس کے اندر اصل دین کے باب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آپ نے یہ بات نظر انداز کردی کہ خاتمے کے مجمل خلاصے کا مطلب پوری کتاب کی تفصیلات پیش نظر رکھ کر قرار دیا جاتا ہے۔ خاتمے کی دفعات اس لیے ترتیب نہیں دی گئی ہیں کہ تمام عقائد و اعمال کی فہرست پیش کر دی جائے۔ بلکہ کوئی خاص مقصد پیش نظر ہے اور اس مقصد پر زور دیتے ہوئے دکھلایا گیا ہے کہ دعوت قرآنی کا کیا حال ہے! وہ مقصد یہ ہے کہ اگر دینی صداقت کی کوئی عالمگیر حقیقت ہو سکتی ہے تو وہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کی ہے اور کسی طالب حق کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس دعوت سے روگردانی کر کے دینی صداقت کا مقام حاصل کر سکے۔

غالباً یہ اشتباہ اس لیے ہوا کہ کتب توحید و عقائد پیش نظر نہیں۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، جو میں نے لکھی ہے۔ تیرہ سو برس سے تمام مسلمانوں کا متفقہ اعتقاد یہی ہے کہ اصلِ دین توحید ہے اور تمام انبیاء اسی کی دعوت و تلقین کے لیے مبعوث ہوئے۔

اچھا فرض کر لیجیے کہ یہ جملہ بجائے خود موجب تردّد ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص یہ جملہ پڑھیگا، معاً وہ تفسیر فاتحہ کے وہ تمام مقامات بھی پڑھیگا جہاں پوری تفصیل کے ساتھ دکھلایا گیا ہے کہ قرآن کے نزدیک نہ صرف انبیاء پر ایمان نہ لانا کفر ہے، بلکہ کسی ایک رسول سے انکار بھی کفر ہے۔ مان لیجیے یہ مقامات بھی اس کے فہم و ازالہ کے لیے کافی نہ ہوں، لیکن آخر اسی کتاب میں بقرہ کے بھی نوٹس ہیں، عمران، نساء، مائدہ

انعام کے بھی نوٹس ہیں اور ان میں بشمار آیات ایمان بالرسل اور ایمان بالکتب وغیرہما کے بارے میں موجود ہیں، نیز ان کی تشریحات ہیں۔ آخر یہ سب کچھ بغیر کسی معنی ومفہوم کے ہے۔

باقی رہا نظام حکومت کا مسئلہ، تو یہ پہلے سے بھی زیادہ حیرانی کا موجب ہے! کاش آپ کسی قدر تفصیل سے لکھتے کہ کونسی بات موجب اشتباہ ہوئی ہے؟ کیا یہ بات کہ قرآن اصل دین سے شرع ومنہاج کو الگ کرتا ہے اور کہتا ہے جو کچھ اختلاف ہوا شرع میں ہوا، نہ کہ اصل دین میں؛ لیکن یہ تو خود قرآن کی تصریح ہے اور ہم مسلمانوں کا سیز دہ صد سالہ عقیدہ، یقیناً ہمارا اعتقاد یہ نہیں کہ حضرت موسیٰ کی شریعت باطل تھی یا حضرت مسیح کے احکام باطل تھے، البتہ قرآن کی یہ تصریح گزشتہ کی نسبت ہے جس کا اختلاف اہل کتاب بطور حجت کے لاتے تھے، نہ کہ آیندہ کی نسبت، آیندہ کے لیے اس کا اعلان معلوم ہے کہ نعمت تمام ہوچکی اور یہ اتمام نہ صرف اصل دین میں ہے بلکہ شرع ومنہاج میں بھی اور اتمام کے بعد مزید تبدل ممکن نہیں اکمال کے بعد مزید تکمیل کی گنجائش نہیں۔

یہ ہمارے ذمے ہے کہ ہم ہر طالب حق پر واضح کریں کہ جس طرح اصل دین کی دعوت کامل ہوچکی اور وہ تمام پچھلی دعوتوں کا جامع ومشترک خلاصہ ہے ٹھیک اسی طرح شرع ومنہاج کا معاملہ بھی کامل ہوچکا ہے۔ اور وہ پچھلے شرائع کے مقاصد وعناصر پر جامع وحاوی ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس بحث کا محل تفسیر سورۂ فاتحہ یا سورۂ بقرہ نہیں، سورۂ احزاب ہے۔ یقیناً ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ تفسیر سورۂ فاتحہ میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا بیان نہیں، اس لیے مصنف کے نزدیک روزہ فرض نہیں۔ مصنف نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر ایک خاص اسلوب

پڑھنی چاہی ہے، عقائد وفقہ کی کتاب لکھنے کا دعویٰ نہیں کیا ہے نیز یہ فرض کر لیا ہے کہ وہ پورے قرآن کی تفسیر لکھ رہا ہے اور سورۂ فاتحہ کے بعد ۱۱۳ سورتیں اور بھی مع اپنے مقاصد و مطالب کے آنے والی ہیں۔
اگر حالات مساعد ہوں تو آپ ایک مرتبہ اور سورۂ فاتحہ پر نظر ڈالیے، پھر مجھے لکھیے کیا فی الحقیقت اس شبہہ کی گنجائش ہے!
آپ نے مولانا ابراہیم کا بیان نقل کیا ہے کہ "میں نے خط بھیجا اور جواب کے لیے ٹکٹ بھی رکھ دیا" یہ بات اور زیادہ میرے لیے موجب تعجب ہوئی۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جب کوئی آدمی جواب کے لیے ٹکٹ بھیج دیتا ہے تو میری مصیبت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ میرا جواب بھیجنا اس لیے بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کا ٹکٹ واپس کر دوں۔ مجھے اس سے سخت چڑ ہے کہ جواب کے لیے ٹکٹ آئے۔ اگر مولوی صاحب ممدوح کا خط مجھے ملا ہوتا اور اس میں ٹکٹ ہوتا، تو کم از کم اس ٹکٹ کو واپس بھیج دینا میرے لیے اس درجہ ضروری تھا کہ کسی طرح تساہل نہیں کر سکتا تھا۔ ٹکٹ لے کر رکھ لینا نہ صرف جواب نہ دینا ہے، بلکہ مالی خیانت بھی ہے۔ میں حتی الوسع اس کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مولوی صاحب کا یہ بیان ہے، اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ سمجھ لوں انھوں نے خط لکھا ہوگا، مجھے ملا نہیں۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ میرے نام کے خطوط ضائع نہیں ہونے۔ تمام ہندستان میں پھر کر مجھے مل ضرور جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ایک مستثنیٰ واقعہ ہو لیکن اس کے بعد تو مولوی صاحب سے بارہا ملاقات ہوئی ایک مرتبہ ایک مجلس میں کئی گھنٹے یکجائی رہی۔ تعجب ہے کہ انھوں نے اس کا اشارہ تک نہیں کیا۔
چونکہ آپ لکھتے ہیں کسی وجہ سے انھوں نے مناظرانہ اسلوب اختیار کیا ہے اس لیے

براہِ عنایت مجھے کتاب نہ بھیجیے۔ میرا نہ دیکھنا ہی بہتر ہے۔ ۱۹۱۸ء سے میں نے جن تین باتوں کا عہد کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو جو مناظرانہ طریق پر میرے خلاف کچھ لکھیگا، نہ تو جواب دونگا، نہ اس کی شکایت سے اپنے نفس کو آلودہ ہونے دونگا۔

۲۔ صاحب "سروشِ سخن" کے لیے میں نے میرزا محمد عسکری صاحب کا حوالہ اس لیے دیا کہ مجھے یاد پڑتا ہے، خود ان کا کوئی دُور کا رشتہ صاحبِ "سروشِ سخن" سے ضرور رہا ہے۔ سخن کے ایک عزیز غالباً داماد، مولوی خلیل احمد ہیڈ ٹرانسلیٹر ہائیکورٹ کلکتہ تھے اور مرزا عسکری کی ان سے عزیزداری تھی، مولوی خلیل احمد کے پاس غالب کے متعدد خطوط بھی تھے، جو انھوں نے مجھے دکھلائے تھے۔ مگر افسوس میں نے ان کی نقل حاصل نہیں کی۔ ایک خط میں ایک غیر مطبوعہ رباعی بھی تھی، اور تمام خطوط سخن کے نام تھے۔ اب نہیں معلوم، ان کا کیا حشر ہوا۔ مولوی خلیل احمد کے ایک عزیز کی رشتہ داری نواب سید علی حسن (لکھنؤ) کے خاندان میں ہوئی ہے۔ ممکن ہے ان کے پاس ہوں[ے]۔ بہرحال مرزا محمد عسکری صاحب سے خط و کتابت اس باب میں اس لیے سُود مند ہو گی کہ وہ غالباً سخنؔ سے قرابت رکھتے ہیں، اس لیے نہیں کہ کسی کتاب کے مصنّف ہیں۔ وہ عرصے تک کلکتہ میں رہے ہیں۔ اس لیے ان امور کی مجھے اطلاع ہے۔

۳۔ طالب مرحوم کے نسخہ سے غالباً میں نے تین غیر مطبوعہ غزلیں نقل کی تھیں۔

ے نواب سیّد علی حسن سے مُراد صفی الدّولہ حسام الملک نواب سیّد علی حسن خان ابن امیر الملک والا جاہ نواب سیّد صدیق حسن خان ہیں میں نے نواب صاحب سے بھی خط و کتابت کی تھی لیکن مکاتیب بنام سخن کا کوئی سُراغ نہ مل سکا۔

"سخن تکیہ" "گلا ہے کہ نہیں" اور "تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی" یہ تینوں غزلیں "الہلال" میں نکل چکی ہیں۔ میں جلدوں میں ڈھونڈونگا اور ان کی نقل بھجوا دونگا۔ غالباً کسی نے بدایوں سے غالب کا نیا ایڈیشن نکالا تھا اور اس میں "الہلال" کے حوالے سے یہ کلام نقل کر لیا تھا۔

۴۔ مجھے حکیم صاحب کی ادویہ کے استعمال میں ہرگز تامل نہیں۔ اگر اب بھی ان کا یہی فیصلہ ہے کہ "جوہرمنقّی" وغیرہ استعمال کرنا چاہیے، تو ضرور کرونگا، مگر شرط یہ ہے کہ وہ دواخانے کو حکم دے دیا کریں کہ مجوّزہ مرکّبات وی، پی، یا پارسل کے ذریعہ بھیج دی جائیں۔ اس صورت میں میں شکرگزار ہونگا اور انشراح خاطر کے ساتھ علاج کرونگا۔ ورنہ طبیعت رُک جاتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحفہ ایک مرتبہ ہونا چاہیے، نہ کہ مسلسل۔ اگر حکیم صاحب یا آپ اسے منظور نہیں کرسکے، تو پھر نہ تو میں فراغ خاطر کے ساتھ دوا استعمال کرونگا، نہ امتداد دواجراء کی حالت گوارا ہوسکیگی۔ [۱] اب کاغذ میں گنجایش نہیں۔

ابوالکلام

۱؎ حکیم فقیر محمد مرحوم کی رائے تھی کہ دوائیں جاری رہنی چاہییں اور ان سے نہ محض اس مرض کو فائدہ پہنچیگا، بلکہ عام صحت بھی اچھی رہیگی، لیکن وہ دواؤں کی قیمت لینے کے لیے تیار نہ تھے اور فرماتے تھے کہ مولانا کی خدمت ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ مولانا بلا قیمت دوائیں استعمال کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔

(۲۵)

۱۵ فروری ۱۹۳۶ء

عزیزی،

میں نے پچھلے خط میں "ترجمان القرآن" کے مطالب کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، اگر آپ کے مصالح کے خلاف نہ ہو تو اُسے شائع کر دیجیے۔ ابتدائی دو تین سطریں جن میں آپ سے مخاطبت ہے، نکال دیجیے۔ اشاعت کے لیے ان کی ضرورت نہیں۔ آگے چل کر مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی کے رسالے کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ بھی شائع کرنا غیر ضروری ہے۔ صرف اُتنا حصّہ اخبار میں دے دیجیے جس میں دو شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔

یہ بھی ظاہر کرنا ضروری نہیں کہ کن صاحب کو لکھا گیا ہے۔ عنوان کے نیچے یہ لکھ دیا جا سکتا ہے کہ ایک خط جو اس بارے میں ایک صاحب نے لکھا تھا، یہ اس کا جواب ہے۔

آج ایک صاحب نے اس کی خواہش کی، تو مجھے خیال ہوا کہ آپ کو لکھ چکا ہوں، کیوں نہ وہی شائع ہو جائے! البتہ یہ آپ کی پسند پر موقوف ہے۔ اگر آپ اپنے مصالح کے خلاف سمجھیں، تو ضروری نہیں کہ شائع ہو۔

اُمید ہے اب آپ کی طبیعت رُو بہ صحت ہوگی اور نیا معالجہ کامیاب ہوا ہوگا۔

وعلیکم السّلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

(۲۶)

۲۰ فروری ۱۹۳۶ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ میں نے محض اس خیال سے یہ بات لکھی تھی کہ شاید آپ اسے غیر ضروری تصوّر کریں۔ اگر آپ کو اس میں تامّل نہیں (اور یقیناً تامّل ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے)، تو ضرور مکتوب الیہ کا نام ظاہر کر دیجیے۔ آپ ایک مختصر تمہید لکھ کر خط کی نوعیت واضح کر سکتے ہیں[1]۔

شاید میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ حصّہ نکال دیجیے جو مولانا سیالکوٹی کی نسبت ہے۔ اس کی بنیاد بھی یہی تھی۔ مجھے ہرگز تامّل نہیں۔ اگر آپ مناسب تصوّر کریں، تو پورا خط بجنسہٖ شائع کر دیں۔

---

[1] مولانا نے اس سے پہلے مکتوب میں فرمایا تھا کہ "ترجمان" کے متعلق دو شبہات کا جواب چھاپنا خلافِ مصلحت نہ ہو تو چھاپ دیا جائے۔ میں خود اس فکر میں تھا کہ اس کی اشاعت کے لیے اجازت حاصل کروں، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ:

۱۔ پورا خط چھاپنے کی اجازت دیجیے۔

۲۔ اگر آپ فرمائیں تو میں عوام کی سہولت کے لیے آیات کا ترجمہ ساتھ لکھ دوں۔

۳۔ مولانا ابراہیم والا حصّہ بھی الگ کرنے کی ضرورت نہیں اس لیے کہ مولانا ممدوح تمام معاملات کو درست تسلیم کر چکے ہیں اور وہ اپنی تفسیر میں جو کچھ لکھ چکے تھے اس کی تلافی کی بھی یہی مناسب صورت تھی کہ بعد کے حالات پیش کر دیے جاتے۔

چنانچہ مولانا نے اجازت دے دی۔ میں نے انقلاب کے پورے صفحے پر مکتوب چھاپ دیا اور آیات کے ترجمے کے لیے تمہید میں تصریح کر دی۔

آیات عام اور معلوم ہیں۔ تاہم اگر ترجمہ ضروری ہے تو ضرور بڑھا دیجیے۔ البتہ موزوں ہوگا اگر اس کی تصریح تمہید میں کر دیں۔ کیونکہ خط نج کے طور پر آپ کو لکھا تھا۔ اس میں ترجمے کا اندراج غیر ضروری اہتمام محسوس ہوگا۔ علاوہ بریں مخاطب کے لیے ترجمہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔

افسوس ہے علاج کے بارے میں آپ اس وقت تک مطمئن نہ ہو سکے۔ میں سمجھتا ہوں اگر حکیم صاحب کے نئے نسخے سے افاقہ ہوا تو اسی پر جم جائیے اور کچھ عرصے تک ایک ہی علاج جاری رکھیے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ شفائے کامل عطا فرمائے[1]۔

غالب کی غزل کے لیے کہہ دیا ہے۔ کل نقل بھیج دی جائیگی۔ "ترجمان" جلد دوم کے لیے کیا کہوں۔ تاخیر پر تاخیر ہوتی ہی گئی۔ چار کاپیاں بجنور پہنچ کر خراب ہوگئیں اور دوبارہ لکھی گئیں۔ بعض اور موانع بھی پیش آگئے۔ بہرحال وہ سب کھٹکے اب دُور ہو گئے ہیں اور اب کتاب کے ورود کا منتظر ہوں۔ مفصل خط پھر لکھونگا۔ اس وقت ڈاک کا وقت ختم ہو رہا ہے۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

---

[1] حکیم فقیر محمد مرحوم و مغفور نے آشوب کے دورے کو روکنے کے لیے ایک نسخہ تجویز فرمایا تھا جس کا نام انھوں نے "معجون مفاصل بہ نسخہ دیگر" بتایا تھا۔ بڑی بد ذائقہ دوا تھی۔ صبح استعمال کرتا تو شام تک ذائقے پر اس کا اثر مسلط رہتا۔ اس سے خاصا فائدہ ہوا۔

(۲۷)

۲۱/۲/۳۶ء

عزیزی،

ایک خط کل بھیج چکا ہوں۔ یہ عجیب بات ہے کہ غالب کی غزل :

آپ نے "مسنی الضر" کہا ہے کہ نہیں ؟

یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے کہ نہیں؟

"الہلال" کی جلدوں میں نہیں ملی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب سعید الدین احمد خان طالب مرحوم کے نسخہ سے میں نے یہ غزل بھی نقل کی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے "الہلال میں اندراج کی نوبت ہی نہ آئی۔ مزید تصدیق اس خیال کی اس سے ہوتی ہے کہ نواب رامپور کے غسل صحت والا قصیدہ :

مرحبا سال فرخی آئیں

عید شوال و ماہ فروردیں

"البلاغ" میں نکلا ہے، "الہلال کی آخری جلد میں نہیں۔ بہت ممکن ہے، یہ غزل آیندہ اندراج کے لیے چھوڑ دی گئی ہو اور پھر اشاعت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چونکہ قدیم کاغذات ضائع ہو چکے ہیں، اس لیے مسودات کے ملنے کی بھی کوئی توقع نہیں۔

نواب احمد سعید خانؒ والا نسخہ ان کے عزیزوں کے پاس ضرور موجود ہوگا وہ نسخہ بجائے خود آپ کے لیے ایک اہم ماخذ کا کام دے سکتا ہے، کیونکہ اردو

۲۹

لہ یہاں عجلت میں سعید الدین احمد خان کو احمد سعید خان لکھ گئے۔

کا قدیم مطبوعہ نسخہ ہے اور سادہ اوراق پر کئی نظمیں خود غالب کے قلم سے لکھی ہیں۔ آپ حاجی عبدالغفار صاحب (علی جان والے) کوئی سٹرک، دہلی کے پتے پر لکھیے۔ بہت ممکن ہے وہ سراغ لگالیں۔

اتنے عرصے کے بعد آج اس مضمون اور قصیدے پر بھی نظر پڑی، جو "الہلال" میں نکلا تھا۔ اب غور کرتا ہوں تو آپ کا خیال بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر میں:

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا ازدحام

"ریل کھلنے" سے یہ مقصود نہیں ہے کہ لفٹنٹ گورنر کی روانگی کا وقت قریب آ گیا تھا یا خود غالب کی روانگی۔ بلکہ صریح یہ ہے کہ ریل کے افتتاح کا یعنی جب دربار میں لفٹنٹ گورنر کی تقریر یا سرکاری اعلان کی قرأت ہو چکی تو وہ ریل کے افتتاح پر متوجہ ہوئے اور اس موقع پر خاص خاص حکام و امراء کو آنے کا موقع دیا گیا۔ اس مطلب کا قطعی قرینہ یہ ہے کہ اس وقت تک ریل وہاں جاری نہیں ہوئی تھی کہ ریل کھلنے سے مقصود ریل پر سفر ہو۔ ۱۸۵۷ء تک ریل کا اجراء صرف ہوڑہ سے رانی گنج تک ہوا تھا۔ آرہ تک پٹڑی بچھ چکی تھی اور کانپور تک سٹرک کی درستگی کا کام ہو رہا تھا۔ غدر نے اس کی اہمیت سجھائی تو خصوصیت کے ساتھ کام بڑھایا گیا اور ۱۸۶۱ء کے آخر میں غازی آباد تک اجراء کا سامان ہو گیا۔ یقیناً ۱۳ جنوری ۱۸۶۵ء کو ریل کے افتتاح کا جلسہ ہوا۔ جمنا کے کنارے شامیانے لگے ہیں اور لفٹنٹ گورنر پنجاب نے اس کا افتتاح کیا ہے۔ اسی کی طرف قصیدہ اشارہ کر رہا ہے۔

تعجب ہے یہ صاف بات کیوں اس وقت سامنے نہیں آئی۔ یقیناً لارڈ کیننگ والا دربار یہ نہیں ہو سکتا۔ والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

علاج کے متعلق آپ کی اس درجہ آمادگی اور سرگرمی موجبِ تشکر و امتنان ہے۔
حکیم صاحب کا بھی شکر گزار ہوں، آیندہ اس بارے میں بھی لکھونگا۔[1]

ابوالکلام

(۲۸)

۲۶ فروری ۱۹۳۶ء

عزیزی،

یہ بڑی مصیبت ہے کہ کاروباری مسلمانوں میں راستبازی مفقود ہو گئی ہے خصوصاً
ان مسلمانوں میں جو مذہب کا نام زیادہ لیتے رہتے ہیں اس وقت میں نے "انقلاب"
میں ...... ایجنسی لاہور کا ایک اشتہار دیکھا کہ "تذکرے" کی قیمت للعہ ہے
حالانکہ اس کی قیمت عہ ہے۔ اسی قیمت کے حساب سے یہ لوگ "تذکرہ" منگواتے
ہیں اور اس پر کافی کمیشن لے جاتے ہیں۔ اس قیمت سے زیادہ قیمت لینے کا انھیں
حق نہیں۔

کیا آپ اس کا کوئی علاج بتلا سکتے ہیں؟ مجھے نہایت اذیت ہوتی ہے، جب
میں خیال کرتا ہوں کہ لوگ اپنے شوقِ مطالعہ میں عہ کی جگہ للعہ دینے پر مجبور
ہو رہے ہیں اور ایک شخص میری کتابوں کے نام پر لوگوں سے بے انصافی کر رہا
ہے۔ کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ "انقلاب" میں میری طرف سے یہ اعلان درج
کرا دیں کہ "تذکرہ" کی قیمت عہ ہے؛ اس سے زیادہ قیمت لینے کا کسی
تاجر کو حق نہیں۔ کیونکہ وہ کمیشن وصول کر رہا ہے۔ اگر اس قیمت پر "تذکرہ"

---

[1] میں نے حکیم فقیر محمد چشتی کی دوائیں استعمال کرنے کے لیے بار بار التجائیں کی تھیں، ان پر یہ ارشاد ہوا۔

لاہور اور پنجاب میں نہ ملے تو براہ راست دفتر سے منگوا لیا جائے[۱]

والسّلام علیکم
ابوالکلام

(۲۹)

۶ مارچ ۱۹۳۶ء

عزیزی، السّلام علیکم

حکیم صاحب کے استفسارات کا جواب حسب ذیل ہے:
ہضم کی حالت اچھّی ہے۔ کوئی خاص شکایت نہیں۔ البتّہ سالہا سال سے ہلکی غذا کا التزام ہے۔ مرغن اور ثقیل کھانے قطعاً نہیں کھاتا۔ اگر کھاؤں، تو ضرور ثقالت محسوس ہوتی ہے[۲]۔

---

[۱] میں نے ایجنسی کا نام حذف کر دیا۔ لیکن جس حد تک مجھے یاد ہے صورت غالباً یہ تھی کہ زیادہ قیمت والے نسخے کی جلدیں بہت قیمتی تھیں۔

[۲] میں نے مولانا کو ہمیشہ بہت کم اور ہلکی غذا کھاتے دیکھا۔ چائے بڑے شوق سے پیتے تھے اور چائے کے ساتھ ہلکی نمکین چیزیں کھانی پسند تھیں۔ آخری دور میں غذا بہت گھٹ گئی تھی۔ میں جب کبھی دلی جاتا تھا، تو عموماً دوپہر کا کھانا میرے ساتھ تناول فرماتے تھے۔ ایک آدھ چپاتی اور تھوڑا سا خشکہ، خشکے پر سالن کے بجائے زیادہ تر دال ڈال لیتے تھے۔ بونٹ پلاؤ (سبز کچّے چنے اور چاول) بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ اوائل موسم ہی میں فرمائش شروع ہو جاتی: بھئی بونٹ نہیں آئے؟ تلاش کرو اور پکاؤ۔ میٹھا بھی ہلکا پسند تھا۔ مثلاً پڈنگ یا فروٹ سلاد۔ رات کا کھانا اکثر کمرے ہی میں منگوا لیتے اور میرے علم کے مطابق اسے بہ لحاظ مقدار کھانا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

نیند میں کوئی خاص فتور نہیں۔ سالہا سال سے عادی ہوں کہ دس بجے لیٹ جاتا ہوں اور تین بجے صبح اٹھ جاتا ہوں۔ اگر درد کی تکلیف نہ ہو تو اتنی نیند ضرور آجاتی ہے۔[1]

طبیعت میں یبوست کا کچھ اثر ضرور ہے (اگرچہ دل و دماغ میں نہیں) درد داہنے پائوں کی ران کے زیریں حصے میں شروع ہوا، البتہ اب آخری دورہ کے بعد ایک نئی تکلیف شروع ہوگئی ہے، یعنی ران کی جڑ میں کچھ کھنچاؤ سا رہتا ہے۔ اگر چار زانو ہوکر بیٹھوں، یا بیٹھ کر پائوں اوپر نیچے ہلایا جائے تو ران کی جڑ میں درد محسوس ہوتا ہے، اس طرح کا جیسا کھنچاؤ کا درد ہو۔ یہ حالت پہلے نہ تھی، اب ہوئی ہے۔

درد سب سے پہلے جولائی ۴۴ء میں ہوا اور تقریباً تین دن تک رہا۔ ڈاکٹر والی نے ایک گولی تجویز کی تھی۔ بہت سریع الاثر ثابت ہوئی۔ دوسرے دن ہی سے افاقہ شروع ہوگیا تھا۔

پھر اسی سال جاڑوں میں دوبارہ محسوس ہوا۔ اب کے زیادہ عرصے تک رہا یعنی چار پانچ دن تک۔ جن گولیوں نے پہلے اثر کیا تھا، انھوں نے اب دیر میں اثر کیا۔

ڈاکٹروں کی تجویز تھی کہ برقی غسل اور مالش مفید ہوگی۔ چنانچہ ایک ماہ تک یہ علاج جاری رہا۔ چونکہ درد اس سے پہلے ہی جا چکا تھا، اس لیے اس علاج کی تاثیر کا کچھ فیصلہ نہ ہوسکا۔ عام صحت پر اس کا اثر ضرور اچھا پڑا۔

---

[1] مولانا جلد سونے اور بہت تڑکے اُٹھنے کے عادی تھے اا اُٹھتے ہی چائے ضرور پیتے دیر سے بھی سوتے تو سحر خیزی پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

پچھلے جاڑے کے بعد گرمیوں اور بارش کا موسم نکل گیا اور کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ ایک دو بار کچھ خفیف سی کھٹک محسوس ہوئی تھی، اس لیے احتیاطاً گولیاں استعمال کر لی تھیں۔

انھیں ایام میں آپ کی دوا استعمال کی گئی تھی۔

اب اس جاڑے میں پھر درد ہوا اور درجہ میں زیادہ سخت یعنی محل اور نوعیت وہی تھی، لیکن تکلیف زیادہ تھی۔ ایک دو راتیں بہت سخت گزریں۔ بالآخر انھیں گولیوں سے افاقہ ہوا۔ اس مرتبہ تین درجن گولیاں کھائیں، حالانکہ پچھلی دفعہ بارہ یا چوبیس ہی کافی ہوئی تھیں۔ خون کا بار بار امتحان کیا گیا۔ یورک ایسڈ کی مقدار زیادہ نہیں بتلاتے۔ البومن معتدل درجہ میں ہے۔

ڈاکٹروں سے مشورہ کر کے میں نے غذا ایسی اختیار کر لی ہے، جو مادۂ مرض کی تولید سے مانع ہو، یعنی گوشت جو پہلے بھی کم کھاتا تھا، بالکل ترک کر دیا ہے۔ روٹی نصف گیہوں، نصف جو۔ انڈا اور بڑی مچھلی بھی متروک، مسور کی دال بھی چھوڑ دی ہے۔ اس بارے میں حکیم صاحب کی کیا رائے ہے؟ اس کی تائید کرتے ہیں یا نہیں؟

ابوالکلام

(۳۰)

۸ مارچ ۱۹۳۶ء

عزیزی،

اپنی حالت کی نسبت خط لکھ چکا ہوں۔ لیکن اب دیکھتا ہوں تو میرا ایک احساس صحیح نہ تھا، یعنی میں نے لکھا ہے، اب دہنے پاؤں کی ران کی جڑ میں درد کی کھٹک ہے، حالانکہ جڑ میں نہیں، بلکہ وسطِ ران کے بالائی حصے میں۔ چونکہ درد اس وقت

محسوس ہوتا ہے، جب چار زانو بیٹھا جائے یا پاؤں کو بیٹھے ہوئے اوپر نیچے کیا جائے، اس لیے ابتدا میں صحیح طور پر دماغ کام نہ کر سکا کہ کہاں کھٹک ہے۔ براہِ عنایت حکیم صاحب کو مطلع کر دیں، تاکہ تمام حالات پیشِ نظر رہیں۔

آپ نے "ترجمان القرآن" کی رفتارِ طباعت کی نسبت لکھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں خود بھی عاجز آچکا ہوں۔ پہلی مصیبت یہ ہے کہ کتابت کی رفتار بہت سست رہتی ہے کیونکہ ایک ہی کاتب متن، ترجمہ اور نوٹس لکھتا ہے۔ ساتھ ہی اس کا لحاظ بھی رکھنا ہے کہ جس قدر ترجمہ نیچے آئے اتنی ہی آیات اوپر آئیں۔ قدرتی طور پر اسے ٹھہر ٹھہر کر اور حساب کر کے لکھنا پڑتا ہے۔ پہلے اندازہ چار صفحے روزانہ کا کیا تھا۔ لیکن عملاً بہ مشکل تین یا ڈھائی صفحے لکھے جا سکے۔ بہرحال اسے میں نے گوارا کر لیا، کیونکہ بہ ظاہر ناگزیر معلوم ہوا، لیکن کم از کم چھپائی کی رفتار سست نہ ہو۔

کیا آپ لاہور میں اس کا انتظام کر سکتے ہیں کہ کاپیاں جاتی رہیں اور چھپتی رہیں؟ اگر ایسا ہو سکے تو ممکن ہے کہ تیسری جلد کسی قدر جلد نکل آئے۔ کاپیاں میں دیکھ کر اور تصحیح کر کے بھیجونگا۔ البتہ پروف کی صحت اور نگرانی وہاں ہونی چاہیے۔ کاپیوں کے ساتھ احتیاطاً مسودہ بھیج دیا جاتا ہے۔

اُجرتِ طباعت کی کمی بیشی کا کوئی سوال نہیں۔ پروف کی تصحیح وغیرہ کی اُجرت بھی محسوب کر لی جائیگی۔ مگر نگرانی ٹھیک ہو۔ چھپائی روشن اور جلد جلد۔ دیکھیے، دوسری جلد اس ماہ کے اندر نکلتی ہے یا ہفتہ عشرہ اور نکل جاتا ہے۔[1]

والسّلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] اس سے واضح ہے کہ ۱۹۳۶ء میں "ترجمان القرآن" کی تیسری جلد بالکل تیار تھی۔ میں نے

(۱۳۱)

۱۳ مارچ ۱۹۳۶ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ یہ مسہل والا مقدمہ ہے میرے لیے بہت ہی مشکل، لیکن اگر حکیم صاحب اسے ناگزیر ہی تصور کرتے ہوں، تو بہ حکم مُردہ بدستِ زندہ، بہرحال تعمیل کروں گا۔ لیکن جس وقت سے ہوش سنبھالا، آج تک اس طبی ابتلاء سے گریزاں ہی رہا۔ مشکل یہ ہے کہ ادھر کچھ دنوں تک شاید سفر کا سلسلہ جاری رہے۔ دہلی سے بار بار تار آ رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے تقاضا نہ ٹال سکوں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ علاج کا سلسلہ سفر کے بعد شروع کیا جائے، یعنی آیندہ ماہ۔

کتابوں کی نسبت آپ نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح ہے۔ یقیناً ان کی طباعت و اشاعت کا بہتر انتظام کچھ نہیں ہوا۔ بلاشبہ مجھے فروخت کی کمی کی شکایت

(بقیہ گزشتہ) ذمہ داری کے لیے پوری آمادگی ظاہر کی تھی۔ لیکن مولانا کی مشغولیتیں ایسی تھیں کہ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی تھیں اور ان کی طبیعت کا ایک خاصّہ یہ بھی تھا کہ کتاب مطبع میں پہنچ جانے تک مسودہ جتنی مرتبہ نظر سے گزرتا تھا، اس میں ترمیمیں فرماتے رہتے تھے۔

۱۔ میں نے عرض کیا تھا کہ کتابوں کی طباعت میں غیرمعمولی تاخیر ہو رہی ہے اور ان کی فروخت کا انتظام میرے علم کے مطابق کبھی اطمینان بخش صورت اختیار نہ کر سکا۔ میری تجویز یہ تھی کہ کتاب چھپتے ہی پوری کی پوری کسی ایک تاجرِ کتب کے حوالے کر دینی چاہیے۔ اگرچہ کمیشن زیادہ دینا پڑے، اس لیے کہ اوّل یکمشت رقم مل جائیگی۔ دوسرے فروخت کی پریشانیاں ممتد نہ ہونگی اور توجہ کاملاً دوسری کتاب پر جم جائیگی۔

نہیں، لیکن اس میں میرے کسی انتظام کی خوبی کو دخل نہیں محض لوگوں کا حُسنِ ظن ہے کہ وہ ہر حال میں میرے قلم سے نکلی ہوئی چیز ذوق وشوق سے لیتے ہیں۔

آپ اس بارے میں مجھے جو کچھ مشورہ دیں، میں یقیناً اُسے ترجیح دونگا۔ مجھے یاد نہیں کہ مبارک علی صاحب نے "ترجمان القرآن" جلد اوّل کے تمام نسخے لینے چاہے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو میں ضرور اس طریقے کو ترجیح دیتا۔ بلاشبہ مجھے قیمت کی وصولی میں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ تاہم ایک آدمی سے معاملہ کرکے فارغ البال ہو جانا بہرحال قابلِ ترجیح ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انھوں نے صرف پنجاب کے لیے دو ہزار یا پندرہ سو نسخے لیے تھے۔

پہلی جلد ایک نئی چیز تھی، اس لیے خریداروں کی فراہمی میں پھر کچھ دقت لگا لیکن اب دوسری جلد کے خریدار کو تمام تر متعدد، معلوم اور معین ہیں نیز مطالب و مباحث کی وسعت کے اعتبار سے اس کی حیثیت پچھلی جلد سے بھی بلند تر ہے۔ پریس سے نکلتے ہی پھیل جائیگی۔ تاہم میں یقیناً اس صورت کو ترجیح دونگا کہ کوئی ایک شخص ہی معاملہ کرلے اور بیک دفعہ پوری رقم مل جائے۔ ۲۵ فی صدی کے حساب سے چھ ہزار نسخوں کی کمیشن تقریباً دس ہزار ہوتی ہے اگر اس دس ہزار میں سے چار پانچ ہزار کی رقم سب ایجنٹوں کو بھی دے دی جائے جب بھی

---

[۱] میری معلومات کے مطابق شیخ مبارک علی صاحب تاجرکتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور "ترجمان" جلدِ اوّل کے پورے نسخے خرید لینے پر آمادہ تھے، لیکن مولانا کی طرف سے جن لوگوں کے ہاتھ میں فروخت کا انتظام تھا انھوں نے ایسی رائے دی کہ شیخ صاحب کے ساتھ سودا نہ ہو سکا۔ اور مولانا کی تحریر سے واضح ہے کہ شیخ صاحب کی تجویز اُن تک پہنچ ہی نہ سکی، شیخ صاحب پانسو نسخے لے آئے، بعد ازاں مختلف اوقات میں حسبِ ضرورت نسخے خریدتے رہے اور صحیح انتظام نہ ہوسکنے کے باعث "ترجمان" جلدِ اوّل کے بہت سے نسخے جہاں پڑے تھے، وہیں پڑے رہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

صرف چند ماہ کے اندر پانچ ہزار کا منافع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کیا آپ کے پیش نظر کوئی شخص ہے؟

میں ایک خط میں تیسری جلد کی نسبت لکھ چکا ہوں، غالباً آپ مل چکا ہوگا۔ اگر تصحیح و طباعت کا لاہور میں اہتمام ہو سکے اور طباعت جلد ہو تو میں کاپیاں بھیجتا رہوں۔

بہرحال اس بارے میں آپ کا جو مشورہ ہو، مجھے مطلع کیجیے۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ جو کچھ کرینگے محبت و اخلاص سے کرینگے میں تیار ہوں، آپ کو اس بات میں پاور آف اٹرنی[1] دے دوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

مجھے آپ کے تمام خطوط مل گئے۔ وہ خط بھی مل گیا، جس میں آپ نے مولانا ابراہیم صاحب کی ملاقات کا حال لکھا ہے۔ غالباً اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، اس لیے میں نے اس کا حوالہ نہیں دیا۔

(۳۲)

کلکتہ

۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ جن صاحبوں نے آپ سے "ترجمان القرآن" جلد دوم کی نسبت یہ سوال کیا

---

[1] مختارنامہ یا سندِ مختاری

ہے کہ اس کی سول ایجنسی نصراللہ صاحب[1] کو دے دی گئی ہے، انھوں نے صحیح بات کہی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ۲۵ فیصد کمیشن پر انھیں ایجنسی دے دی گئی ہے۔ صرف ایک خاص مقدار اس سے مستثنیٰ ہے، جو رجسٹرڈ خریداروں کی ہے لیکن چونکہ آپ نے لکھا تھا، وہاں ایسی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں کہ نقد قیمت پر تمام نسخے لے لیں، اس لیے مجھے خیال ہوا کہ اگر کوئی ایسی تجویز ہو، تو نصراللہ صاحب کی رضامندی سے اسے اختیار کر لیا جائے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ بحالتِ موجودہ کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، تاجر قدرتی طور پر غیر معمولی کمیشن چاہیں گے لیکن دفتر کو یہ دقت پیش آئیگی کہ خریدار معیّن و مشخص ہیں، زیادہ سے زیادہ تین چار ماہ کے اندر تمام روپیہ وصول ہو جائیگا۔ صرف اتنی مدّت کے انتظار سے بچنے کے لیے وہ کسی کمیشن کو کیوں منظور کرے، جیسی کہ آپ نے...... کی لکھی ہے یعنی تقریباً پچاس فی صدی[2]۔

علاوہ بریں یہ خیال بھی آپ کا صحیح ہے کہ یہ تاجر یک وقت روپیہ کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اگر معاملہ قابلِ اطمینان ہو، تو بلا شبہ اقساط میں روپیہ وصول کیا جا سکتا ہے لیکن اس معاملے میں کمیشن کی مقدار طے نہیں ہو سکتی۔

بہرحال اگر ممکن ہو، تو صرف شیخ مبارک علی سے گفتگو کر لیجیے۔ انھوں نے پہلی جلد کی سول ایجنسی پنجاب کے لیے لی تھی اور غالباً پندرہ سو نسخے ۲۵ فیصد کمیشن پر منگوائے تھے۔

۳۱

[1] یعنی مولانا نصراللہ خان عزیز جو اس زمانے میں "مدینہ" بجنور کے ایڈیٹر تھے۔

[2] میں نے اپنی تجویز (ایک تاجر کے ہاتھ پوری کتاب یکمشت فروخت کر دینا) کی تائید میں یہاں کے ایک نہایت مشہور ہر دلعزیز مصنّف کی ایک کتاب کا حوالہ دیا تھا، جو پوری ایک تاجر نے خرید لی، البتہ کمیشن زیادہ منظور کرایا۔ کتاب کا نام میں نے دانستہ حذف کر دیا۔

اب مجھے بجنور سے معلوم ہوا ہے کہ پنجاب کے ہر شہر کے تاجر نسخے منگوا رہے ہیں، اور وہ انھیں اپنا حق رکھ کر کمیشن پر دے رہے ہیں۔ اگر صرف مبارک علی صاحب معاملت کریں، تو یقیناً قابل ترجیح ہے۔ لیکن وہ غالباً اس انتظار میں ہیں کہ جب کتاب نکل جائیگی تو پھر دیکھینگے۔ حال آنکہ پھر موقع باقی نہیں رہیگا۔ کتاب نکلتے ہی براہ راست روانہ ہونا شروع ہو جائیگی۔

اگر وہ پندرہ سو نسخے بیک دفعہ لے لیں، تو میں کوشش کرونگا کہ پنجاب کے لیے نصر اللہ صاحب بدستور انھیں کو سول ایجنسی دے دیں۔

افتتاحِ ریل کی نسبت ۱۸۶۶ء میں نے اس لیے لکھ دیا تھا کہ گزشتہ سال ہندستانی ریلوں کی تعمیر پر ایک آرٹیکل "اسٹیٹسمین" میں نکلا تھا، غالباً اس میں یہ سنہ کسی موقع پر لکھا گیا ہے۔ لیکن اب آپ کے لکھنے پر میں نے مزید تفتیش کی تو معلوم ہوا آپ کا قیاس قریب قریب درست ہے یعنی ۱۸۶۶ء نہیں بلکہ ۱۸۶۵ء میں دہلی کی ریل کا افتتاح ہوا ہے۔[۱]

میں نے آج ایک صاحب کو جو ای، آئی، آر کے دفتر سے تعلق رکھتے ہیں، کہا ہے کہ اس بارے میں مستند معلومات بہم پہنچائیں۔ انشاء اللہ دو تین دن کے بعد آپ کو قطعی طور پر لکھ سکونگا۔ یہ بات آپ پنجاب کے سرکاری دفاتر سے بھی معلوم کر سکتے

---

[۱] یہ میکلوڈ صاحب لفٹنٹ گورنر والے قصیدے کی بحث ہے، جو پہلے گزر چکی ہے، مولانا نے "الہلال" میں لکھا تھا کہ یہ قصیدہ غالباً ۱۸۶۰ء میں بمقام آگرہ پڑھا گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جنوری ۱۸۶۵ء کا ہے اور دہلی کے اس دربار سے تعلق رکھتا ہے جو ریل کے افتتاح کے سلسلے میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا نے اسے ۱۸۶۶ء کا قرار دیا ہے، پھر فرمایا، کہ تمھارا قیاس قریب قریب درست ہے۔

ہیں، یعنی دہلی میں ریل کا افتتاح کب ہوا؟

غنیمت ہے کہ آپ کو دہلی میں غالب کا ایک نسخہ مل گیا۔ بہت ممکن ہے جو نسخہ میں نے دیکھا تھا، یہ اس کی نقل ہو میرے ذہن میں غزل کا صرف مطلع محفوظ تھا اور چونکہ مطلع میں کہا ہے "تو سہی" سے کہیں زیادہ "استفہام تقریری" موزوں ہے یعنی کہا ہے کہ "نہیں" اس لیے یہ تحریف بلا قصد ہو گئی۔[۲۵] والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام

(۳۳)

۱۹/اے، بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ

۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء

عزیزی، السلام علیکم

ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اب آپ کا مفصل خط ملا۔ آپ اس معاملے میں جس قدر دلچسپی لے رہے ہیں، وہ یقیناً آپ کے اخلاص و محبت کی میرے لیے ایک نئی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اخلاص و محبت کے لیے جزائے خیر عطا فرمائے۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے، تو ضروری ہے کہ اس کے تمام پہلو آپ کے سامنے آجائیں۔ معاملے کی جو اصل صورت ہے، وہ آپ کو صاف صاف لکھ دیتا ہوں۔

لہ دہلی میں مولانا مظہر الدین[۴۲] مرحوم شیرکوٹی کی وساطت سے میں نے نواب شجاع الدین احمد خاں[۴۳] کے ہاں مرحوم کی بیگم والا نسخہ دیکھا تھا۔ یہ اسی کا ذکر ہے۔

۲۵ غالب کی غزل کی ردیف مولانا نے "ہے کہ نہیں" تحریر فرمائی تھی، صحیح ردیف "ہے تو سہی" تھی۔ میں نے اس طرف توجہ دلائی، تو آپ نے فرمایا کہ یہاں استفہام تقریری زیادہ موزوں تھا، اس لیے بلا قصد "ہے کہ نہیں" لکھا گیا۔

شیخ مبارک علی صاحب کا یہ خیال صحیح ہے کہ پہلی جلد کی فروخت میں کچھ وقت لگا۔ لیکن وہ یہ حقیقت نظر انداز کر رہے ہیں کہ دوسری جلد کی حالت اس اعتبار سے بالکل مختلف ہوگئی ہے اور قدرتی طور پر مختلف ہوئی تھی۔ پہلی جلد جب نکلی، تو بالکل ایک نئی چیز تھی۔ کتاب کی حیثیت کی نوعیت کی لوگوں کو خبر نہ تھی۔ ابتدا میں جن لوگوں نے خریدا، محض خوش اعتقادی کی بنا پر خریدا او اس لیے قدرتی طور پر ضروری تھا کہ عام مانگ کے پیدا ہونے میں کچھ وقت نکل جاتا۔ پھر بھی پریس سے نکلتے ہی دو ہزار نسخے ایک ہفتے کے اندر نکل گئے تھے۔ بقیہ نسخے پھر بتدریج نکلے لیکن اب یہ تمام ابتدائی مرحلے طے ہو چکے ہیں اور پہلی جلد کے تمام خریدار دوسری جلد کے لیے چشم براہ ہیں، حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے، تمام خریدار متعین و مشخص ہیں۔ کتاب کے نکلتے ہی پانچ ہزار خریدار آمادہ و منتظر ملینگے۔ صرف ایک ہزار نسخوں کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ انتظار کرنا پڑیگا۔ لیکن اب بہت سی درخواستیں ایسی آ رہی ہیں جو دونوں جلدیں یکجا لینا چاہتی ہیں۔

کتاب کی فروخت کا جو انتظام پیش نظر ہے، وہ یہ ہے کہ دو ہزار ایک سو نسخے یہاں کلکتہ کے مقامی خریداروں اور رجسٹر کے براہ راست خریداروں میں تقسیم ہو جائینگے۔ ان کے لیے دفتر کو کوئی کمیشن وضع نہیں کرنی ہے۔ پوری قیمت ہفتہ عشرہ میں وصول ہو جائیگی۔ باقی نسخے مختلف تاجروں کے ہاتھ جائینگے اور ان انفرادی خریداروں کے ہاتھ جنھوں نے اب بجنور درخواست بھیج دی۔ ان نسخوں پر صرف ۱۵ فیصدی کمیشن دفتر وضع کریگا، جو بجنور کی ایجنسی وصول کریگی: تاجروں کو بجنور والے ۲۰ سے ۲۵ تک کمیشن دے رہے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ بھی رقم کی بڑی مقدار دو تین ماہ کے اندر وصول کر لینگے اور مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑیگا۔

ایسی حالت میں آپ غور کیجیے کہ دفتر کے لیے یہ طریقہ صحیح ہوگا کہ تمام نسخے نصف قیمت پر فروخت کر دے؟

مجوزہ معاملہ تجارتی نقطۂ نظر سے صرف دو منزلیں رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ بجنور والی رقم میں شاید دو تین ماہ لگ جائیں! اِس میں رقم اسی وقت مل جائیگی۔ دوسری یہ کہ ہزار بارہ سو نسخے، جو ہو سکتا ہے کہ بعد کو بتدریج نکلیں، اُن کی قیمت بھی اسی وقت مل جاتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کس قدر قیمت ملتی ہے؟ نصف۔ پھر کیا اتنی سی بات کے لیے کہ دو ہزار کی قیمت تین چار ماہ پہلے مل جائے اور ایک ہزار کی چھ سات ماہ پہلے، اس قدر نقصان گوارا کر لینا چاہیے؟

پھر یہ بات بھی پیش نظر ہے کہ چھ سات ماہ کی مدّت، مَیں اس لیے فرض کر لیتا ہوں کہ مسئلہ اپنی انتہائی مشکل میں نمودار ہو جائے، ورنہ کافی وجوہ اس کے لیے موجود ہیں کہ اب دوسری جلد کے ساتھ پہلی جلد کے تمام بقیہ نسخے فوراً نکل جائینگے۔ چنانچہ مولوی نصر اللہ خان لکھ رہے ہیں کہ جس قدر نسخے مل سکیں، اُن کے لیے محفوظ رکھے جائیں۔ اسی طرح پٹنہ اور حیدر آباد سے بھی پہلی جلد کی مانگ آ چکی ہے۔

شیخ مبارک علی صاحب کا یہ خیال کہ انھیں اشتہارات پر کافی رقم خرچ کرنی پڑیگی، صحیح نہیں ہے۔ لوگوں کو صرف اس اطلاع کی ضرورت ہے کہ کتاب نکل گئی، نہ کہ اشتہاری پروپیگنڈہ کی۔ زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ روپیہ اشتہارات پر خرچ ہو جائیگا۔

یہ حالات سامنے رکھ کر آپ اس بارے میں رائے قائم کریں۔

مبارک علی صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ پہلی جلد کے دو ہزار نسخے باقی ہیں۔ صحیح تعداد میں دو تین دن کے بعد بتلاؤنگا۔ زیادہ سے زیادہ ہزار یا گیارہ سو نسخے

ہوگئے۔ کچھ نسخے درجہ اوّل کے رہ گئے ہیں، غالباً چالیس۔
اس طرح کی معاملت "ترجمان القرآن" کے لیے اس لیے دشوار ہوگئی ہے کہ تاجر قدرتی طور پر عام حالات کا لحاظ رکھتے ہیں اور ترجمان القرآن کی جو واقعی نوعیت ہوگئی ہے اس کا اندازہ کر نہیں سکتے۔ اگر انھیں بتلایا جائے تو اُسے تجارتی کا جوئی پر محمول کرینگے نتیجہ یہ ہے کہ قابلِ عمل صورت بہ مشکل نکل سکیگی۔
آپ نے ایک شخص سے وابستہ کر لینے اور نقد روپیہ لینے کی مزیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، میں نے اس پر اچھی طرح غور کیا۔ آپ جانتے ہیں میری طبیعت کی افتاد تاجرانہ جلب زر کی راہوں سے کس درجہ ناآشنا واقع ہوئی ہے میں کمی بیشی کے معاملے کو تاجرانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کا اہل نہیں۔ تاہم اس معاملے کی نوعیت اس درجہ واضح اور قطعی ہے کہ جس قدر غور کرتا ہوں نصف قیمت پر معاملت صریح اور بلاوجہ نقصان معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ بھی یہی رائے قائم کرینگے۔
علاوہ بریں لکھ چکا ہوں کہ اب مولوی نصر اللہ خان صاحب کی رضامندی ہی سے معاملہ کرسکونگا کیونکہ ان سے ایک بات کر چکا ہوں۔ بلا شبہ مجھے یقین ہے کہ وہ رضامند ہوجائینگے لیکن میرا فرض یہ ہے کہ ان کے انتفاع کا بھی پہلو پیشِ نظر رکھوں۔ اب اس کی جو صورت نکل سکتی ہے، وہ یہی ہو سکتی ہے کہ دفتر کے حصّے کی رقم میں سے کچھ نکالا جائے۔ پس بصورتِ معاملت دفتر کو یہ بوجھ بھی اٹھانا پڑیگا۔
مبارک علی صاحب کا یہ خیال بھی کہ کتاب مجلّد نہ ہو،[1] ایک مزید دشواری ہے۔ جلد کا

---

[1] میں نے اسی وقت مولانا کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ مفصّل ارشادات نے معاملے کے تمام پہلو واضح کر دیے لیکن مجھے ان توضیحات کی ضرورت اسی صورت میں پیش آسکتی تھی کہ پہلے سے آپ کا فائدہ پیشِ نظر نہ ہوتا۔ شیخ مبارک علی صاحب بھی اسی لیے سودا کر لینے پر آمادہ ہوئے تھے کہ مولانا مطبوعہ کتابوں کی طرف سے بے فکر ہو کر یکسوئی سے تیسری جلد

اس مرتبہ بہتر سامان یہاں کر لیا گیا ہے۔ اس میں کسی قدر کفایت بھی ہوگی۔ کتاب کی ضخامت چونکہ بڑھ گئی ہے اس لیے یہی رائے قرار پائی کہ قیمت ۶؎ قرار دی جائے اور جلد کے لیے بجائے ایک روپیہ کے ۱۲ ر بڑھا جائے یعنی مجلد ۶؎ کی جگہ ۶؎ ہو جلد کا یہاں جو سامان کیا گیا ہے وہ ایسا ہے کہ دفتر کو فی جلد تقریباً ۹ ر دینا پڑیگا۔ پس اس میں بھی ۳ ر فی جلد کی مزید بچت ہے۔

بہر حال یہ تو ایک فروعی معاملہ ہے، اصل معاملہ کمیشن کا ہے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں خیال کرتا ہوں کہ ایک ہاتھ سے معاملت کرنے کے فوائد کی خاطر ہمیں یہاں تک آمادہ ہو جانا چاہیے کہ ایک تہائی کمیشن منظور کر لیں اس سے زیادہ کمیشن دینا بلا وجہ کافی رقم کا نقصان گوارا کرنا ہے۔ اُمید ہے آپ بھی اس سے اتفاق کرینگے۔

ہاں پہلی جلد کے جس قدر نسخے باقی ہیں، ان کے لیے اگر آپ مصلحتاً کچھ اور بھی چھوڑ دیں تو چھوڑ دے سکتے ہیں، لیکن دوسری جلد کے لیے ایک تہائی سے زیادہ وضع نہ کیجیے۔ غالباً

(حاشیہ بقیہ) پر متوجہ ہو جائیں تجارتی نفع اصل محرک نہ تھا تاہم وہ بازار کے حالات سے پورے آگاہ تھے اور بہتر اندازہ کر سکتے تھے کہ کتاب کتنی مدت میں فروخت ہوگی اور اس کے لیے اشتہاروں پر کتنا خرچ آئیگا۔ پھر اس زمانے میں پچیس تیس ہزار کی رقم ہر تاجر ایک کتاب میں لگا دینے کے لیے تیار نہ ہو سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے کتاب غیر مجلد خریدنے کی تجویز اس لیے پیش کی تھی کہ اوّل مختلف خریداروں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق عمدہ جلد بندھوائیں، اگرچہ اس پر کتنا ہی خرچ آئے۔ دوسرے شیخ صاحب اپنے گاہکوں کی پسند کے مطابق حسبِ ضرورت جلدیں بندھوا سکتے تھے۔ تیسرے بجنور سے مجلد کتابوں کے بجائے غیر مجلّد کتابیں زیادہ محفوظ طریقے پر لاہور لائی جا سکتی تھیں۔

وہ لوگ اس میں متامل ہوں۔ اس صورت میں صرف پنجاب کے لیے معاملہ کر لیجیے، اگر ہو سکتا ہو۔

ابوالکلام

(۳۴)

۲ اپریل ۱۹۳۶ء

السّلام علیکم

عزیزی،

خط پہنچا۔ مجھے آپ کی اس رائے سے کہ ایک آدمی سے معاملہ کر لینا اولیٰ ہے، ہرگز اختلاف نہیں۔ اصولاً یہ بالکل صحیح ہے کہ اس صورت میں ہمیں رقم کی کمی گوارا کر لینی چاہیے۔ لیکن ہر معاملے کے حدود ہوتے ہیں "ترجمان القرآن" کی جو معیّن و مشخّص حالت ہے، وہ میں نے آپ کو بہ تفصیل لکھ دی تھی۔ شاید آپ نے اس پر غور نہیں کیا۔ اگر میرا پچھلا خط موجود ہو، تو اس پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ سوال یہ ہے کہ مبارک علی صاحب جتنی رقم پیش کر رہے ہیں، اگر کتاب نکلتے ہی وہ رقم بغیر کسی زحمت کے دفتر کو مل رہی ہے اور بقیہ نسخوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، تو کیا ایسی حالت میں بھی یہ معاملہ مرجح ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ آیندہ ایک نسخہ بھی کتاب کا فروخت نہ ہو اور کوئی اس کا خواہشمند نہ رہے، جب بھی صرف ان تین ہزار نسخوں سے اتنی رقم دفتر کو وصول ہو جائیگی، جتنی انھوں نے پیش کی ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ معاملہ کیا جائے، تو آخر وجہ ترجیح کیا سمجھی جائے؟ فرق زیادہ نہ ہو، کم ہو، لیکن کچھ نہ کچھ تو ہو!

بہرحال میں نے تمام پہلوؤں پر غور کر کے رائے قائم کر لی ہے۔ مبارک علی صاحب غیر مجلّد نسخے چاہتے ہیں، میں اسے منظور کر لونگا، بشرطیکہ وہ اس کا وعدہ کریں، خراب

جلد بندھوا کر فروخت نہیں کرینگے۔ اگر مجلّد فروخت کرینگے، تو اسی نمونے کی جلد لاہور
میں بندھوا کر، جیسی جلد اوّل کی دفتر نے بندھوائی تھی۔ زیادہ سے زیادہ ۷ر فی جلد
خرچ پڑیگا اور نام وغیرہ کی ڈائی دفتر، بلا معاوضہ مہیّا کردیگا۔
مجلّد نسخہ ۱۲ میں فروخت ہوگا اور غیر مجلّد ۸/۶ میں۔ دفتر نے یہی قیمت ٹھہرائی ہے
اور آخری اعلان چھپ رہا ہے۔ مجلّد کی صورت میں انھیں فی جلد ۵ر کی مزید بچت
ہوجائیگی جو دفتر کا حق ہے مگر دفتر اس سے دستبردار ہوجائیگا۔ چھ ہزار نسخوں میں
پندرہ سو روپیہ سے زیادہ جلد کا بھی انتفاع ہے۔
چھ ہزار نسخوں کی قیمت بحساب ۸/۶، ۹ ہزار ہوتی ہے۔ اس کا نصف[1] ساڑھے انیس ہزار
ہوا۔ ۵ فیصد کے مزید اضافہ کے بعد بیس ہزار چار سو چھہتّر روپے ہوئے۔ میں پندرہ سو چھہتّر
اور مانگتا ہوں۔ یعنی بائیس ہزار روپیہ میں کل نسخوں کا معاملہ ہوجائے۔ ۳۲ فیصدی
کے حساب سے چھبّیس ہزار ہوتے تھے۔ چار ہزار کی رقم اور چھوڑ دی گئی۔
پہلی جلد کے جس قدر نسخے باقی ہیں، غالباً بارہ سو ہوں، وہ بھی ۴۵ فیصدی پر لے لیں۔
نصر اللہ خان صاحب کے پاس جس قدر آرڈر ہیں، ان پر ۲۵ فیصدی کے حساب
سے انھیں کمیشن دے دیا جائے۔
اگر مبارک علی صاحب اسے منظور کریں، تو پھر میں نصر اللہ صاحب سے گفتگو کر کے معاملے
کی انجام دہی کی فکر کروں۔ اگر انھیں اس میں تامّل ہو، تو پھر اس سے قطعِ نظر کر دیجیے۔
اب کتاب نکل رہی ہے اور مزید ردّ و کد کی گنجایش نہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ حساب صحیح نہ تھا۔ پینتالیس فیصد کمیشن وضع کرنے کے بعد چھ ہزار جلدوں
کی قیمت اکیس ہزار چار سو پچاس بنتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو اس قسم کے معاملات سے
کبھی دلچسپی نہ رہی اور اس بارے میں بعض ایسے واقعات مجھے معلوم ہیں کہ انھیں بیان
کروں تو لوگ حیران ہوجائیں۔

ہاں اگر وہ پنجاب کے لیے پندرہ سو نسخے لینا چاہیں اور ۲۵ فیصدی پر، تو میں اس کا انتظام کرادوں۔

میں ۵ اپریل کو الٰہ آباد جا رہا ہوں، وہاں ۸ کی صبح تک ٹھہرونگا اور پھر لکھنؤ کا قصد کرونگا۔ لکھنؤ میں ۲۳ تک قیام رہیگا۔ قیامِ لکھنؤ کے زمانے میں مجھے کتاب کی ترسیل و تقسیم کا انتظام کردینا ہے۔ پس اس خط کا جواب الٰہ آباد کے پتے سے، یا لکھنؤ کے پتہ سے بھیجیے۔ الٰہ آباد کا پتہ "آنند بھون" ہے اور لکھنؤ کے لیے موتی نگر کانگرس کیمپ۔ اگر ۷ تک مجھے مل جانے والا ہو تو الٰہ آباد کا پتہ لکھیے ورنہ لکھنؤ کا۔

آپ نے کلکتہ آنے اور ملنے کے قصد کا ذکر کیا ہے۔ میرے مکان کا دروازہ اور دل کا دروازہ، دونوں آپ کے لیے باز ہیں۔

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

لاہور سے کلکتہ دُور ہے، لیکن لکھنؤ اتنا دور نہیں۔ شام کو سوار ہوجیے اور دوسرے دن دس بجے لکھنؤ پہنچ جائیے! اگر آپ اطلاع دے دینگے، تو میں ایسا انتظام کردونگا کہ اسٹیشن سے سیدھا میری قیام گاہ پر آجائیں۔

ابوالکلام

(۳۵)

لکھنؤ

۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء

عزیزی

خط بروقت مل گیا تھا، لیکن مجھے بالکل مہلت نہیں ملی کہ جواب لکھتا۔ یہاں کی مشغولیت کا تسلسل میرے لیے اس درجہ ناقابلِ برداشت تھا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن دماغ

نہ پاسکا۔ اب کلکتہ جا رہا ہوں۔ کلکتہ سے خط لکھونگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۳۶)

۱۹۔ اے، بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۲۱ اپریل ۱۹۳۶ء

عزیزی

لکھنؤ میں صحت بگڑی اور اس کا اثر اس وقت تک دور نہ ہوسکا۔ آج اس قابل ہوا کہ ضروری خطوط کا جواب لکھ دوں۔

۱۔ مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ میرا حساب غلط تھا اور باہمی فرق بہت خفیف رہ گیا ہے لیکن میں مُصر ہونگا کہ جو رقم لکھ چکا ہوں، اُسے گھٹایا نہ جائے۔ پانچ سو کا سوال نہیں ہے بلکہ ان ضروری خانوں کا ہے، جن کی رعایت کرکے میں نے یہ رقم متعین کرلی ہے۔ ایک چھوٹی سی رقم کی بھی کمی کسی نہ کسی خانے کو خالی چھوڑ دیگی۔ پس ضروری ہے کہ یہ اپنی جگہ قائم رہے، یعنی جلد دوم کا معاملہ بائیس ہزار میں طے شدہ تصوّر کیا جائے۔

۲۔ مبارک علی صاحب کا حافظہ غلطی کررہا ہے، اگر وہ کہتے ہیں کہ میں نے جلد اول نصف قیمت میں دینی چاہی تھی۔ جو کچھ مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ شفاعت اللہ صاحب نے خط و کتابت کی تھی اور ۳۳ فیصدی پر معاملہ ہوا تھا پھر انھوں نے کہا کہ صرف پانچسو جلدیں لی جائینگی۔ مجھے روپیہ کی ضرورت تھی اس لیے معترض نہ ہوا اور بھجوادیں۔

نصف قیمت کی بات میرے وہم وگمان میں بھی نہیں گزری تھی
بہرحال مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ آپ کا قدم درمیان ہے اور بات بات پر ردّ و کد کروں۔ پہلی جلدوں کا معاملہ میں آپ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر وہ ۱۲ فیصدی پر کسی طرح راضی نہ ہوں، تو آپ کو اختیار ہے کہ مزید کمی کر دیں۔

۳۔ جلد کے بارے میں میں نے یہ بات نوٹ کرلی ہے کہ جیسی جلد دفتر نے بندھوائی تھی، اس سے کمتر قسم کی جلد نہ ہوگی۔

۴۔ نیز جتنے نسخے نصراللہ خان صاحب کو مطلوب ہونگے، ۲۵ فیصدی پر دے دیے جائینگے۔

۵۔ آپ لکھتے ہیں کہ پہلی جلد کی قیمت تین ماہ کے بعد دی جاسکیگی لیکن میں چاہتا ہوں، کوشش کیجیے کہ بیک دفعہ تمام معاملہ طے پاجائے۔ ایک کاروباری آدمی کے لیے تین ماہ پہلے چند ہزار روپیوں کا انتظام کرلینا کچھ دشوار نہیں ہے۔

۶۔ باقی رہا روپے کی وصولی کا معاملہ، تو سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ لاہور کے کسی بنیک سے امپیریل بنیک شاخ پارک اسٹریٹ کلکتہ کے نام ڈرافٹ بنوالیں اور ڈرافٹ لے کر بجنور آجائیں۔ وہاں کتابیں انھیں مل جائینگی۔ کتابیں لے کر ڈرافٹ میرے نام سوروپیہ کا بیمہ کر کے بھیج دیں۔

مبارک علی صاحب کاروباری آدمی ہیں وہ اس میں متامل ہونگے کہ کتابیں قبضہ میں لینے سے پہلے نوشت وخواند کی بنا پر لین دین کریں۔ لیکن میں اتنا کاروباری نہیں ہوں۔ میرا معاملہ آپ سے ہے۔ کتابیں انھیں بجنور میں جب دے دی جائیں، آپ ڈرافٹ میرے نام بھیج دیں۔

۷۔ اگر مبارک علی صاحب پورے بائیس ہزار کا سودا منظور کرلیں تو اس صورت میں معاملہ طے شدہ ہے۔ آپ براہِ عنایت یہ خط دیکھتے ہی ان سے گفتگو کیجیے

اور نتیجہ سے بذریعۂ تار اطلاع دیجیے۔ تار صرف منظوری یا عدم منظوری کا ہونا چاہیے
بصورتِ منظوری میں فوراً پریس کو اطلاع دونگا اور آپ کو بھی خط بھیج دونگا۔
۸۔ بجنور کے لیے صرف انیس ہزار کا ڈرافٹ ہو۔ جلدِ اوّل کا معاملہ اس سے تقریباً
ایک ہفتہ بعد پیش آئیگا۔ اس کی جلدیں مال گاڑی کے ذریعے لاہور بھجوادی
جائینگی اور بلٹی امپیریل بینک کو دے دی جائیگی۔ مبارک علی صاحب روپیہ
دے کر بلٹی وصول کر لینگے۔
۹۔ یہ مناسب ہوگا کہ شروط کی ایک تحریر بے لی جائے تاکہ بعد کو کسی طرح کی
غلط فہمی و شکایت کا موقعہ باقی نہ رہے۔ شروط سے مقصود یہی امور ہیں جو
آپ نے خط میں لکھے ہیں، یعنی پہلی جلد کا معاملہ اور جلد دوم کا معاملہ۔
یہ قصہ ختم ہوجائے تو تیسری جلد کی طباعت کے بارے میں تفصیلات لکھوں۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

مکرّر!

بوجوہ یہ ضروری ہے کہ نتیجہ سے بذریعۂ تار مطلع کریں۔ یہ خط آپ کو جمعرات کے دن
مل جائیگا۔ میں جمعہ تک تار کا منتظر رہونگا۔ اُمید ہے، اس میں تساہل نہ ہوگا۔

(۳۷)

۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء

عزیزی

گزشتہ منگل کو لکھنؤ کے خط کا جواب بھیج چکا ہوں۔ میں نے لکھا تھا کہ آپ خط ملتے
ہی نتیجہ سے مجھے مطلع کر دیں، لیکن ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔

خط میں، میں نے لکھا تھا کہ پہلی جلد کے لیے میں ۲۵/۳ فیصدی کی جگہ ۳۰ فیصدی کی کمی منظور کرلونگا، لیکن دوسری جلد کی مجموعی رقم بائیس ہزار سے نہ گھٹائی جائے کیونکہ میرے لیے ضروری ہے کہ کم ازکم اتنی رقم بردست حاصل ہوجائے۔ اس پانچ کو کی وجہ سے شیخ مبارک صاحب کا نقصان نہیں ہوتا۔ جب ایک معاملہ ہو رہا ہے، تو یہ بات میری انھیں منظور کرلینی چاہیے۔

اب چونکہ کتاب طیار ہوگئی ہے، اس لیے اسے روکا نہیں جاسکتا۔ ضروری ہے کہ فیصلہ ہوجائے۔

خط میں آپ نے خریداروں کی فہرست کے لیے بھی لکھا ہے۔ ضروری نہ تھا کہ یہ فہرست بھی دی جاتی کیونکہ دفتر کی جانب سے اعلان کردیا جاتا، کہ تمام نسخے شیخ صاحب نے لیے ہیں، انھیں سے شائقین منگوائیں اور پھر خود بخود سب کی درخواستیں پہنچتیں۔ تاہم چونکہ معاملے میں آپ ہیں اور آپ اسے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے بلا تامل فہرست بھی دے دی جائیگی۔ یہ فہرستیں دفاتر کا قیمتی ذخیرہ ہوتی ہیں، کیونکہ ان کی موجودگی گویا دائمی خریداروں کی موجودگی ہے۔ یہ نہ صرف "ترجمان القرآن" کے لیے، بلکہ عام طور پر تمام اعلیٰ درجے کی کتابوں کے لیے مفید ثابت ہوگی[۱]۔

نصراللہ صاحب کو بھی لکھ دیا ہے۔ انھیں جس قدر نسخے لینے ہیں، وہ بجنور ہی میں لے لیے جائینگے۔

چونکہ کتاب اب طیار ہے، اس لیے ناگزیر ہے کہ بلا تاخیر یکسوئی ہوجائے۔ میں پھر آپ کو توجہ دلاتا ہوں کہ نتیجے کی اطلاع خط پر نہ چھوڑیے۔ مجھے بذریعۂ تار مطلع

---

[۱] فہرست منگوانے سے مقصود صرف یہ تھا کہ جو "اصحاب" "ترجمان" کے مستقل خریدار ہیں شیخ مبارک علی صاحب براہ راست انھیں جلد دوم کے چھپ جانے کی اطلاع دے سکیں اور جو اصحاب طلبگار ہوں، انھیں کتاب بھجوائی جاسکے۔

کردیجیے۔ اگر یہ معاملہ ہورہا ہے تو فوراً انجام پاجائے، ورنہ کتابیں خریداروں
کے نام روانہ کرنا شروع کردیں۔ یہ خط آپ کو جمعرات کے دن مل جائیگا۔ اتنے عرصے
میں ضرور آپ نے گفتگو کرلی ہوگی۔ براہ عنایت خط دیکھتے ہی مجھے تار کے ذریعے
اطلاع دیجیے۔ اُمیّد ہے، اس بات کی اہمیت ضرور محسوس کرینگے۔

یہ قصّہ ختم ہوجائے، تو میں آپ کو تیسری جلد کے لیے لکھوں۔ کتابت تو وہی صاحب
کررہے ہیں، جنھوں نے دوسری جلد کی ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں، لیکن
طباعت کا دوسرا انتظام ہوسکے تو بہتر ہوگا۔ اگر چھپائی میں بلا وجہ وقت ضائع
نہ ہو تو تیسری جلد آٹھ ماہ کے بعد ضرور نکل جاسکتی ہے۔ یعنی آیندہ جنوری
میں شائع ہوجائے۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۳۸)

۲ مئی ۱۹۳۶ء

عزیزی، السّلام علیکم

جب ۲۹ تک آپ کا جواب نہیں ملا، تو میرے لیے ضروری ہوگیا کہ معاملے میں
یکسوئی کروں کیونکہ بوجوہ مزید انتظار دشوار تھا۔ چنانچہ آپ کو تار دیا گیا آپ نے
جواب میں خط کی ترسیل کا ذکر کیا تھا منتظر تھا کہ آج مل جائیگا، لیکن نہیں ملا۔
چونکہ اب مزید وقت خط وکتابت میں صرف نہیں کیا جاسکتا اس لیے اِس وقت
جوابی تار بھیج رہا ہوں۔

آپ لکھتے ہیں شرائط منظور ہیں، بشرطیکہ مال کی ڈلوری لاہور میں ہو، حالآنکہ خود

مبارک علی صاحب کا یہ منشا آپ نے لکھا تھا کہ بجنور میں مال لے لیا جائیگا - غا
وہ چاہتے ہیں بجنور سے لاہور تک کے محصول سے بچ جائیں - یہ بات خرید و ف
کے طریقے کے صریح خلاف ہے، لیکن اب میں کہاں تک ردّ و کد کروں ؟ خصوص
معاملے میں جو آپ کے ذریعے انجام پا رہا ہے - بہرحال ان سے کہیے، گڈس ٹر
ریلوے چارج میں دے دونگا، مگر یہ ضروری ہے کہ مال بجنور ہی میں لے لیا
میں اپنا ایک معتمد آدمی بھیج رہا ہوں، وہ مال حوالے کر دیگا اور مال کی تر
میں پریس سے پوری مدد ملیگی -

دوسری اہم بات یہ ہے کہ معاملہ اس طرح انجام پا جائے کہ مزید تاخیر نہ ہو - میں
۶ مئی کو بجنور میں موجود ہوگا - ۵ کو لاہور سے مبارک علی صاحب یا ان کا آد
ہو جائے - اس طرح ۶ مئی کو معاملت انجام پا جائیگی -

اب روپیہ کے حساب پر غور کر لیجیے -

کتاب صرف چھ ہزار چھپی ہے - مجھے ایک خاص تعداد چاہیے تاکہ دوستوں
دوں، نیز بعض عزیزوں کو اور علماء مدارس کو جنھیں پہلی جلد تحفتہً دے
اور دوسری جلد کا وعدہ ہے - علاوہ بریں رجسٹری کے لیے بھی دو نسخے چا
ان کی مجموعی تعداد ایک سو ساٹھ ہوتی ہے - پس میں پانچ ہزار آٹھ سو چالیس
مبارک علی صاحب کو دے دونگا - ۲۲ ہزار جو مجموعی قیمت قرار پائی ہے اس
سے پانچسو اکہتر روپیہ چھ آنہ ان نسخوں کے لیے کم ہو جائیگا - آپ بھی حساب
میں حساب میں کچا ہوں غلطی نہ کر رہا ہوں۔ مبارک علی صاحب کو یقین کرنا
کہ یہ فروخت کے لیے نہیں ہیں محض مفت تقسیم کے لیے ہیں -

اس رقم کے وضع کرنے کے بعد جس قدر رقم ہو، وہ مجھے مل جانی چاہیے، ا
کہ مبلغ پانچ ہزار چار سو روپیہ تو وہ نقد ساتھ لے جائیں اور باقی کا ڈرا

امپیریل بینک شاخ پارک اسٹریٹ کلکتہ کے نام کا ہو۔ بجنور میں میرا جو آدمی خط پیش کرینگے اُسے وہ نقد اور ڈرافٹ دے دینگے۔

اس کے بعد جلد اوّل بھیج دی جائیگی۔

نصراللہ صاحب کو جس قدر جلدیں مطلوب ہیں، وہ ۲۵ فیصدی کمیشن پر انھیں دے دینی ہونگی۔ نیز اس کے بعد بھی انھیں حق ہوگا کہ اس کمیشن پر کتابیں خرید لیں۔

ایک بات آپ کے پیش نظر رہے بعض وجوہ ایسے ہیں کہ مجھے اب روپیہ فوراً مل جانا چاہیے یعنی ۱۰ مئی کو کلکتہ میں وصول ہو جانا چاہیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۶ مئی کو بجنور میں معاملہ انجام پا جائے، اگر کسی وجہ سے اس میں دیر ہو، تو پھر مجھے فوراً اطلاع مل جانی چاہیے تاکہ صورتِ حال سمجھ لوں۔

چند دنوں کی تاخیر میں کوئی حرج نہ تھا، لیکن میرے بعض وعدے ہیں جو ۱۰ مئی کو ختم ہو جاتے ہیں اور ضروری ہے کہ کم از کم پانچ ہزار کی رقم اس دن مجھے وصول ہو جائے۔ اگر یہ معاملہ ابھی نہیں ہوتا تو میں دوسروں سے ایک خاص مقدار کا معاملہ کر کے فوراً روپیہ وصول کر سکتا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ مجھے فوراً صورتِ حال معلوم ہو جائے۔

اُمید کہ آپ میرے معاملات کی اہمیت ملحوظ رکھینگے۔ اور نتیجہ سے بذریعۂ تار مطّلع کر دینگے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں غافل رہوں اور عین موقع پر دشواری پیش آئے۔

ابوالکلام

(۳۹)

۲۷ مئی ۱۹۳۶ء

عزیزی السّلام علیکم

معاف کیجیے گا، جواب میں تاخیر ہوئی۔ ۱۱ کو مجھے بجنور کے خطوط مل گئے تھے مگر میں نے خط اس لیے نہیں لکھا تھا کہ وہاں کے مفصّل خط کا انتظار تھا۔ اس کے بعد میں بیمار ہو گیا۔ خونی پیچش کی شکایت ہوئی اور اس نے بالکل معطّل کر دیا۔ چھ انجکشن امیٹن کے لے چکا ہوں اور مزید لے رہا ہوں۔ یہ پورا ہفتہ نکل گیا اور میں روزانہ ڈاک کو چھو بھی نہ سکا۔ آپ کا خط بھی انھیں میں پڑا تھا۔ کل میں نے خطوط دیکھے۔ آج جواب کے لیے مستعد ہوا ہوں۔

۱۔ آپ لکھتے ہیں کہ کتابوں کے فرمے الگ الگ ہیں۔ اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ کتاب سلی ہوئی نہیں ہے، تو سلائی کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ پہلی جلد بھی اسی طرح شائع ہوئی، یہ بھی اسی طرح نکلی۔ لیکن اگر مطلب یہ ہے کہ ہر نسخہ کے فرمے یکجا و مرتب بصورتِ کتاب نہیں ہیں، تو یہ نہایت تعجب انگیز بات ہے۔ مدینہ پریس کو دفتری کے کام کی پوری اجرت دی جا چکی ہے اور ان کا فرض ہے کہ کتاب مرتب شکل میں دیں۔ معاملت کرنے مبارک علی خود گئے تھے۔ میرے آدمی نے ان کا اور صاحبِ مطبع کا مقابلہ کرا دیا۔ اب یہ اُن کا کام تھا کہ اس بارے میں پوری طرح اپنا اطمینان کر لیں۔ یقیناً اس کا الزام وہ مجھ پر عائد نہیں کر سکتے۔

بہرحال اگر فی الحقیقت تمام کتابیں یا کتابوں کا کوئی حصّہ مرتب نہیں ہے اور فرمے یکجا و مرتب ہونے کی جگہ الگ الگ ہیں، تو یہ مطبع کی صریح خیانت ہے۔ آپ مبارک علی صاحب سے کہیں کہ وہ دفتری لگا کر کام پورا کریں اور اس کی جس قدر

اجرت ہو اس کا بل مولوی مجید حسن صاحب کو بھیج دیں۔ نیز ایک نقل مجھے بھیج دیں مجید حسن صاحب کا فرض ہے کہ وہ رقم ادا کریں، کیونکہ انھوں نے کتاب کی موڑائی اور فرموں کی ترتیب کی اُجرت مجھ سے پوری وصول کرلی ہے۔

۲۔ آپ لکھتے ہیں، تصویر خراب ہوگئی ہے۔ تصویر کتاب میں ایک ہی ہے، یعنی ذوالقرنین کے مجسّمے کی۔ اس کی ذمّہ داری بھی مجھ پر نہیں ہے کیونکہ صاحب مطبع سے ان کا مقابلہ کرادیا تھا اور اب وہاں سے مال بحفاظت لے جانا ان کا کام تھا۔ محصول ریل کا میں نے وعدہ کیا تھا اور وہ حوالے کر دیا گیا۔ بہرحال کبھی گوارا نہیں کرونگا کہ جس نقصان کی تلافی میرے اختیار میں ہو، اس کو کسی کاروباری اور قانونی پہلو کی بنا پر انجام نہ دوں۔ تصویر کا بلاک موجود ہے، جتنی تصویریں خراب ہوگئی ہوں اطلاع دیں، میں فوراً چھپوا کر انھیں بھیج دونگا۔ یہاں یہ کام ایک دن میں ہو سکتا ہے[۱]۔

۳۔ خریداروں کی فہرست کا مقابلہ نہیں ہوا تھا، اس لیے پڑی رہی اب آج مقابلہ کیا جا رہا ہے، کل پرسوں ضرور بھیج دی جائیگی۔

شیخ صاحب کی شکایات کا جواب ہو چکا۔ اب میں چاہتا ہوں اپنے بعض احساسات بھی واضح کردوں:

۱۔ بجنور سے جو روپیہ آیا، اس کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا لیکن اب محمد صدّیق صاحب کا خط آیا تو حالات معلوم ہوئے۔ معلوم ہوا کہ شیخ مبارک علی صاحب نے

[۱] "ترجمان" جلد دوم میں "سائرس" کے مجسّمے کی تصویر تھی۔ کتاب لاہور پہنچی تو اس میں سے کچھ تصویریں خراب ہوگئی تھیں۔ مولانا تصویریں چھپوانے پر آمادہ تھے۔ اس اثناء میں بعض علماء کے اعتراض کی وجہ سے تصویر حذف کر دی گئی اور خراب شدہ تصویروں کے بدلے میں نئی تصویریں چھپوانے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

رنگین ٹائیٹل پیج کا مطالبہ کیا اور کہا اس کا نہ ہونا شرائط کے خلاف ہے۔ اس کے بعد بحث ہوئی کہ کتنی رقم اس کی وضع کی جائے؟ انھوں نے کہا کم از کم دو رنگوں کا ٹائیٹل ہونا چاہیے چنانچہ ۵۰؍ روپے اس کے لیے وضع کیے گئے اور محمد صدیق صاحب نے مجبور ہو کر منظور کر لیے [له]

میں چاہتا ہوں آپ مبارک علی صاحب کو یہ کہ دیں کہ یہ رقم جو انھوں نے وصول کی قانوناً، شرعاً، اخلاقاً ناجائز رقم ہے۔ ان سے کوئی شرط اس بات کی نہیں ہوئی تھی کہ کتاب کی کتنی لوحیں ہونگی اور کتنے رنگوں کی ہونگی۔ نہ انھوں نے اس کا مطالبہ کیا کہ کتاب پہلے دیکھ لیں۔ دو ماہ تک خط و کتابت جاری رہی لیکن یہ سوال نہیں اٹھا۔ معاملہ جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جو کتاب میں نے چھاپی ہے، وہ جیسی کچھ ہے، فی نسخہ کے حساب سے فروخت کرونگا۔ وہ اگر تمام نسخے لے لیں تو اتنی رقم وضع کر کے دے دی جا سکتی ہے۔ پس انھیں اس معاملے کا کوئی حق نہیں تھا کہ اس میں ٹائیٹل کیوں نہیں ہے اور پھر اگر نہیں ہے تو اس کی رقم کتنے رنگوں میں چھپائی کے حساب سے ہونی چاہیے؟ میں نے قصداً ٹائیٹل نہیں چھپوایا کیونکہ قطعاً غیر ضروری تھا۔ علاوہ بریں آج کل جتنی کتابیں اعلیٰ درجہ کی چھپتی ہیں اور مجلّد ہو کر فروخت ہوتی ہیں ان میں کوئی ٹائیٹل پیج نہیں دیا جاتا۔ ٹائیٹل پیج صرف انھیں ایک شلنگ اور ڈیڑھ شلنگ کی کتابوں میں دیا جاتا ہے، جو بغیر جلد کے فروخت ہوتی ہیں۔

علاوہ بریں جب ٹائیٹل پیج کی کمی کی وجہ سے کتاب کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا

[له] یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ شیخ مبارک علی صاحب بجنور پہنچے تھے تو انھیں معلوم ہوا تھا کہ سرورق چھاپا ہی نہیں گیا۔ چنانچہ انھوں نے یہاں آکر سرورق چھپوایا "ترجمان" کی جلد اوّل میں بھی چھپا تھا۔

اور وہ اس کی قیمت گھٹا کر فروخت نہیں کرینگے، تو اس سوال کے اٹھانے کے کوئی معنی نہ تھے کیا وہ یہ حصّہ صرف کر کے ٹائیٹل پیج چھپوائینگے ؟ یا اس کی وجہ سے کتاب کی قیمت کم کر دینگے ؟ یہ تفصیل مجھ پر بہت شاق گزر رہی ہے لیکن اس لیے کہ رہا ہوں کہ واقعی اس بات کا میری طبیعت پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ سوال رقم کا نہیں ہے۔ اگر وہ اتنی رقم وضع کر دیتے اور لکھتے کہ میں چاہتا ہوں اتنے روپے اور چھوڑ دیجیے تو میں چھوڑ دیتا، لیکن ایک غلط اور ناجائز پہلو نکال کر روپیہ لینے کی کوشش بہت ہی نامناسب بات ہے اور میری طبیعت کا یہ حال ہے کہ ایسی باتوں سے بہت منغّض ہو جاتی ہے۔ بہرحال آپ ان سے کہ دیں کہ میرے نزدیک یہ رقم ناجائز ہے۔

۲۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ انھوں نے بلا وجہ مطبع کو مجبور کیا کہ کتابیں لکڑی کے صندوقوں میں بھیجی جائیں حالانکہ غیر مجلد کتابوں کے لیے صندوق قطعاً غیر ضروری ہیں۔ ہمیشہ انھیں ٹاٹ کے گٹھر بنا کر بھیجا جاتا ہے اور ایک کاغذ خراب نہیں ہوتا۔ خود اسی کتاب کی پہلی جلد کے سینکڑوں نسخے اسی طرح بھیجے گئے اور خود مبارک علی صاحب کو بھیجے گئے۔[1]

---

[1] مولانا تک صحیح اطلاعات نہ پہنچی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ مبارک علی چھ سات روز لکھنؤ میں رہے، کتاب تیار نہ تھی اور وہ روپیہ محمد صدّیق صاحب کے حوالے کر کے چلے آئے کہ جب کتاب تیار ہو جائے، صندوقوں میں بند کر کے بھیج دینا۔ صندوقوں میں اس لیے کہ بوریوں میں رگڑ سے فرموں کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ضروری تھا کہ کتابیں چھوٹے صندوقوں میں بند ہو کر آئیں لیکن خدا جانے کس وجہ سے بڑے صندوقوں میں بھیجی گئیں۔ بوجھ زیادہ تھا اور حفاظت کے لیے پتیاں نہ لگائی گئی تھیں۔ اس وجہ سے صندوق ٹوٹے اور فرمے خراب ہوئے۔ مولانا کو یہ حالات معلوم نہ تھے۔ محمد صدّیق صاحب بڑے مخلص تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ انھوں نے ریاست کپورتھلہ میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ افسوس کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں شہید کر دیے گئے۔

۳۔ ہاں آپ لکھتے ہیں کہ مجید حسن صاحب تین سو نسخے لینا چاہتے تھے۔ محمد صدیق صاحب اگر انھیں روپیہ نہ دیتے، تو معاملہ ہو جاتا۔ اگر مجید حسن بھی اس پر راضی ہو گئے تھے اور پھر محمد صدیق صاحب نے انکار کیا تو واقعی غلطی کی۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ انکار کرتے، بلکہ انھیں اس میں مساعدت کرنی تھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں ایسا نہ ہوا ہوگا۔ میں خود مجید حسن صاحب کو لکھ چکا ہوں کہ محمد صدیق صاحب انھیں ان کے بل کی رقم دے دینگے۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ وہ نقد کے طالب ہونگے اور بصورت طلب محمد صدیق صاحب کے لیے مشکل ہوگا کہ انکار کر دیں لیکن مجھے تو مجید حسن نے لکھا ہے کہ نسخے انھوں نے لے لیے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ "مدینہ" میں وہ اشتہار دے رہے ہیں۔[1]

بہر حال انھوں نے لیے ہوتے تو کیا ہو جاتا اور نہ لیے ہوتے تو کونسا نقصان ہو جائیگا۔ اگر مبارک علی صاحب اس کے خواہشمند ہیں تو میں بہت سے نسخے ۲۵٪ کمیشن پہ فوراً نکلوا دے سکتا ہوں۔ یہاں دفتر کا یہ حال ہے کہ خط پر خط آ رہے ہیں، اور انھیں جواب دینا مشکل ہو رہا ہے۔ سب کو لکھا جا رہا ہے کہ مبارک علی سے طلب کریں۔ اگر وہ خواہشمند ہیں تو مجھے لکھیے میں اندازہ کر کے انھیں لکھوا دونگا اتنے سو نسخے بھیج دیں۔ قیمت انھیں بر وقت مل جائیگی۔ کتاب کا اس کمیشن پر نکلنا نہایت سہل اور فوری ہے۔

۴۔ لیکن وہ اعلانات کہاں ہیں، جن کے مصارف اس وقت شمار کیے جا رہے تھے؟[2] مبارک علی صاحب سے کہ دیجیے کہ کتاب کے نکلنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح میرا

---

[1] مولوی مجید حسن ابتداءً میں کتابیں لینے پر آمادہ تھے۔ غالباً وہ اجرتِ طباعت کتابوں کی شکل میں لے لینا چاہتے تھے۔ روپیہ مل گیا تو انھوں نے غالباً کتابیں نہ لیں۔ شیخ مبارک علی سے کوئی سودا کرنے یا کتابیں لینے کا سوال اُس وقت پیدا ہوتا کہ طباعت مکمل ہو جاتی۔ طباعت مکمل نہ ہوئی تھی کہ شیخ صاحب چلے آئے۔

[2] شیخ مبارک علی کا اشتہار "ترجمان" جلد دوم وغیرہ کے متعلق "زمیندار" "انقلاب" اور دوسرے اخبار میں برابر شائع ہوتا رہا۔

طریقہ تھا ' ایک دو مرتبہ معمولی ' اور پھر طلبگاروں کے جوش وخروش پر اعتماد کیا ۔ دوسرا یہ کہ کاروباری طریقے پر بکثرت اعلان و اشتہار سے کام لیا جائے ۔ پہلی صورت میں کتاب کا بڑا حصہ ابھی نکل جائیگا اور کچھ حصہ وقت لیگا دوسری صورت میں تمام کتابیں تین ماہ کے اندر اندر نکل جائینگی پس بہتر یہ ہے کہ بچت کا خیال نہ کریں تمام اخبارات میں مفصل اعلان شائع کریں ۔ بعض دفاتر کو نسخوں کی ایک خاص تعداد تحفتہً بھی دے دیں تاکہ ان کی تحریرات اعلان کا کام دیں ۔ انھیں معلوم ہے کہ میں عزیزوں اور دوستوں یا غیر مستطیع شائقین کے علاوہ اور کہیں کتاب نہیں بھیجتا ۔ نہ اب بھیجونگا ، لیکن انھیں کاروباری نقطۂ خیال سے کام کرنے کا موقع ہے ۔ اس صورت میں ان کی رقم اور ان کا فائدہ فوراً حاصل ہو جائیگا ۔

۵ ۔ ضروری امر ہے کہ کم از کم پہلی مرتبہ ایک مفصل اعلان ایسا نکل جائے جس سے کتاب کی پوری نوعیت واضح ہو جائے ۔ مثلاً یہ کہ اب اس کی نوعیت تفسیر کی ہوگئی ہے اور علاوہ ترجمہ اور نوٹس کے مباحث و مقالات کا یہ حال ہے اور ان مواضع پر لکھے گئے ہیں یہ کام شیخ صاحب نہیں کر سکینگے ۔ بہتر ہوگا کہ اعلان کا مسودہ آپ لکھ دیں یا اگر وہ چاہیں تو میں لکھوا کر بھیج دوں ۔

آپنے تیسری جلد کی طباعت کے لیے لکھا تھا ۔ اس کی کتابت تو وہی صاحب کرتے رہینگے جنھوں نے دوسری جلد کی کی ہے ، مگر سوال طباعت کا ہے " مدینہ پریس " کو عا فی ہزار داب اجرت دی گئی ہے ۔ مجھے اجرت کی کمی بیشی کا چنداں خیال نہ ہوگا ۔ اگر طباعت اچھی ہو اور بڑی بات یہ ہے کہ پروفوں کی تصحیح و نگرانی کا بہتر انتظام ہو جائے ۔ بلاشبہہ آپ اس کا انتظام کر سکتے ہیں اور کتاب آٹھ ماہ میں نکل سکتی ہے ۔

لوگوں کا سخت اصرار " ام القرآن " کے لیے ہے ، یعنی تفسیر سورۂ فاتحہ مفصل ومشرح ۔ " ترجمان القرآن " جلد اوّل میں جو کچھ ہے ، وہ اصل تفسیر کا ملخص ہے ۔ اصل تفسیر اس سے

ڈیوڑھی سمجھیے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اسے یہیں کلکتہ میں چھپواؤں، لیکن اگر کتابت کا بہتر انتظام ہو سکے، تو میں ضرور آپ کے سپرد کر دونگا۔ یہ تین ماہ کے اندر نکل جا سکتی ہے۔

ابوالکلام

(۴۰)

۲۷ مئی ۳۶ء

عزیزی،

ایک خط ڈاک میں بھیج چکا ہوں، لیکن ایک ضروری بات اس میں رہ گئی۔

اخبارات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مبارک علی صاحب نے "ترجمان القرآن" جلد دوم کے مجلّد نسخہ کی قیمت للعہ رکھی ہے۔ یہ صریح معاہدے کے خلاف ہے۔ قیمت کا تعیّن وہی ہونا چاہیئے جو معاہدے میں طے ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ جلد ایک خاص درجہ کی ہوگی اور قیمت پر اضافہ زیادہ سے زیادہ بارہ آنے ہوگا۔ پس بصورت تحسین جلد قیمت مجلّد للعہ ہونی چاہیے نہ کہ للعہ[1]

کلکتہ جیسے گراں خرچ شہر میں اعلیٰ درجہ کے کپڑے کی جلد مع طباعت نام ۵۴ فیصدی میں بنوا رہا ہوں، اور اگر زیادہ کام ہوتا، کم از کم ایک ہزار، تو للعہ فیصدی میں

---

[1] جلد بہت عمدہ بنوائی گئی تھی اور اس کی لاگت کے مطابق قیمت مقرر کی گئی تھی۔ غیر مجلّد کی قیمت وہی تھی جس کا اعلان ہو چکا تھا۔ کلکتہ میں جن جلدوں کا تخمینہ مکتوب میں پیش کیا گیا، وہ شیخ صاحب والی جلد کے مقابلے میں بہت معمولی تھیں۔ ان میں سے ایک جلد، جو مولانا نے مجھے عنایت فرمائی تھی، اب تک میرے پاس موجود ہے بلکہ ترجمان جلد اوّل کا بھی پہلا ایڈیشن محفوظ ہے، جو مولانا کا عطیہ ہے اور ان کے دستخط سے مزیّن ہے۔

ہوجاتا۔ لاہور میں ۵ فی صدی مان لیجیے پھر بھی بارہ آنے میں چار آنے کی بچت ہے۔ اسے مصر تک لے جانا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔

خود ان کا فائدہ بھی اس میں ہے کہ خواہ مخواہ قیمت نہ بڑھائیں۔

لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنی شیروانی بیچ کر "ترجمان القرآن" خریدنا چاہتے ہیں۔ کیا ضروری نہیں کہ حتی الوسع اُن کا بوجھ زیادہ نہ کیا جائے۔

ان جھگڑوں نے ذہن کو اس درجہ اپنی طرف مشغول کرلیا کہ اور کوئی بات لکھ ہی نہ سکا۔ آپ کے آخری خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت پھر منحرف ہوگئی ہے۔ یہ یقیناً موسم کی شدت کا نتیجہ ہوگا۔ کیوں آپ ایسا نہیں کرتے کہ کم از کم بارش تک کے لیے شملہ چلے جائیں۔ شملہ بہت قریب ہے، اور غالباً آپ کے بھائی وہاں مستقلاً رہتے ہیں۔ آنکھ کی شکایت کے لیے پنجاب کی گرمی کسی طرح بھی قابل برداشت نہیں ہوسکتی۔

اس سال موسم کی تبدیلی بہت جلد ظہور میں آگئی ہے۔ کلکتہ میں تو پرسوں سے مون سون کی بارش شروع ہوگئی ہے۔ اب کے یہاں گرمی ہوئی ہی نہیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

پچھلے خط میں مَیں نے طباعتِ کتب کی نسبت تفصیلات لکھ دی ہیں۔ "ترجمان القرآن" جلد سوم کے علاوہ "اُم القرآن" کی طباعت بھی درپیش ہے۔ یہ معمولی کتابی سائز (یعنی رائل) پر چھپے گی اور غالباً ۳۰۰ ضخامت ہو۔ پانچ ہزار سے زیادہ چھپوانا نہیں چاہتا یہاں کلکتہ میں گرامو فون کمپنی کی وجہ سے ایک اچھا لیتھو پریس چل نکلا ہے۔ خیال تھا کہ یہ چھوٹی کتاب ہے، اُسے دے دوں۔ لیکن اگر لاہور میں اعلیٰ درجے کی کتابت کا سامان ہوجائے، تو آپ کو بھیج دے سکتا ہوں۔ بہتر سے بہتر خوشنویس ہونا چاہیے، نیز نسخ کا بھی ہو، کیونکہ کتاب میں آیات بکثرت آئی ہیں، اور دو کاتبوں سے لکھوانے

میں دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔

(۴۱)

کلکتہ

۸ جون ۳۶ ۱۹ء

عزیزی

خط پہنچا۔ "ترجمان القرآن" جلد دوم کے چار نسخے ریلوے پارسل کے ذریعے مرسل ہیں بلٹی بھیجتا ہوں، چھڑا لیجیے۔ ان میں ایک نسخہ آپ کے لیے اور ایک سالک صاحب کے لیے ہے باقی دو نسخے مولوی محی الدین قصوری اور مولوی محمد علی قصوری (مقیم بمبئی) کے لیے ہیں۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ اسے بخوشی گوارا کر لینگے۔ یہ دونوں نسخے مولوی عبدالقادر صاحب قصوری کو پہنچا دیے جائیں، اگر وہ لاہور میں موجود نہ ہوں، اور کوئی آدمی قصور جاتا ہو، تو اسے دے دیجیے یا مولوی عبداللہ صاحب قصوری کو دے دیجیے۔ وہ لاہور میں رہتے ہیں۔ غالباً احمد علی نے لاہور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔ آپ چاہیں تو ان کے یہاں پہنچا دیں۔ وہ بمبئی والا نسخہ بمبئی بھیج دینگے، قصور والا اپنے پاس رکھ لینگے۔

۲۔ اہتمام طباعت کے لیے آپ کی آمادگی کا شکر گزار ہوں۔ "ام القرآن" اور تیسری جلد دونوں کا کام شروع کر دیا جا سکتا ہے۔ کتابت کی ضرورت صرف "ام القرآن" کے لیے ہے۔

ے مقصود محمود علی صاحب قصوری بیرسٹر ایٹ لا ہیں۔ لیکن مولانا جلدی میں ان کے بھائی مولوی احمد علی کا نام لکھ گئے۔

۳۷
مد علی صاحب کا ترجمۃ القرآن میرے پاس تھا، لیکن پھر ایک انگریز دوست
ر اس پر بڑی مدت گزر چکی ہے۔ تاہم میرے ذہن پر یہ اثر باقی ہے کہ اس
متن نہایت خوش خط ہے۔ اگر وہ آپ کے مجوزہ خوشنویس نے لکھا تھا تو بلاشبہ
خوبی میں کلام نہیں۔ لیکن نستعلیق کا انداز دیکھنا ہو؟ بہرحال میں آپ کے اور
صاحب کے انتخاب پر معاملہ چھوڑ دوں گا۔ اگر آپ ان کی نستعلیق کتابت کا کوئی چھپا
نہ بھیج دیں، تو "بلیٰ ولکن لیطمئن قلبی" [۳۶] کا مقام بھی حاصل ہو جائے۔

کاپی پر لکھا ہوا نہ ہو، چھپا ہوا ہو۔
یال ہوتا ہے کہ کسی نے کہا تھا، مولوی محمد علی صاحب کا قرآن منشی قاسم
نوی نے لکھا تھا یا غالباً خود منشی قاسم ہی نے کہا تھا۔ جب وہ میرے لیے کتابت
رہے تھے۔ ہو سکتا ہے، اس میں کوئی غلطی کام کر رہی ہو۔ بہرحال شکر گزار ہوں گا،
ن نمونہ مل جائے۔

افسوس ہے، فہرست کی ترسیل میں دیر ہوئی۔ جس آدمی نے نقل کرنے کا وعدہ
ا، وہ تساہل کر رہا ہے۔ میں نے آج اوراق منگوا کر دیکھے اور کہہ دیا ہے، تکمیل
ظار نہ کرو۔ جس قدر ہوتا جائے، بھیجتے جاؤ۔ چنانچہ تیس صفحے رجسٹرڈ بھیج رہے
۔ اس کے بعد جو بھی اور ہو گئے، بھیج دیے جائیں گے۔
نہ آپ نے معاملت کے بعد اس کے لیے لکھا تھا، اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ
بت بھیج دی جائے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ علاوہ بریں جو شائق ہیں،

مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کا یہ ترجمہ قرآن مولوی عبدالقادر خوشنویس نے لکھا تھا۔
ا اور نستعلیق دونوں میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ انھیں کو "ام القرآن" کی کتابت کے
ے تجویز کیا گیا تھا۔ مولوی صاحب موصوف "زمیندار" میں بھی کتابت کرتے رہے اور
نقلاب میں بھی۔

وہ بہر حال منگوا کر ہی رہینگے۔ گزشتہ چار ہفتوں کے اندر تقریباً ستّر اسّی کارڈوں کا جواب دیا جا چکا ہے کہ مبارک علی سے منگوا لیں۔ اب میں کہہ رہا ہوں کہ ایسا نہ کریں، بلکہ خطوط جمع کرلیں اور پھر مبارک علی کے نام بھیج دیں۔

اُمید ہے اب آپ کی طبیعت رُو بصحت ہوگی۔ اب کے مون سون جلد آگیا ہے اور غالباً پنجاب میں بھی بارش شروع ہوگئی ہے۔

ابوالکلام

(۴۲)

کلکتہ

۱۵ جون ۱۹۳۶ء

عزیزی! السّلام علیکم

خط پہنچا۔ نزلہ کی شدّت سے سر جکڑا ہوا ہے۔ بالکل معطّل ہو رہا ہوں، اس لیے مفصّل پھر لکھونگا۔ مختصراً جواب دے دیتا ہوں۔

مجھے آپ کے تمام خطوط مل گئے ہیں۔ بلاشبہہ آپ نے لکھا تھا کہ میں اعلان کا مسودہ بھیج دوں، لیکن سچّی بات یہ ہے کہ میں لکھ نہیں سکا۔ آدمی اپنی چیز کی نسبت کچھ نہیں لکھ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اعلان دوسرے کی طرف سے شائع ہوگا لیکن پھر بھی بات نبتی نہیں[1]۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے تاثّرات کے مطابق لکھ دیں۔ میرا مقصود یہ

---

[1] چونکہ مولانا نے خود فرمایا تھا کہ شیخ مبارک علی چاہیں تو میں مفصّل اعلان لکھ کر بھیج دوں، اس لیے انھیں زحمت دی گئی تھی، ورنہ اعلان یہیں لکھ لیا جاتا اور لکھ کر چھاپ دیا گیا ہوتا۔

۔ ایک مفصّل اعلان ایسا ضرور نکلنا چاہیے، جس سے کتاب کی نوعیت کا پوری
،ی اندازہ ہو جائے۔ مثلاً یہ کہ اس میں کیا کیا مطالب آئے ہیں؟ کن کن موضیع
بنث کی گئی ہے؟ بحیثیت مجموعی کیا نوعیت ہے؟ وغیرہ وغیرہ
جو درپیش تھا، وہ صرف بہتر ترجمہ و تفسیر کا نہیں تھا بلکہ قرآن کے علوم و معارف
ہر نو مدوّن کرنے کا تھا۔ چنانچہ ہر گوشہ میں نئی عمارتیں اُٹھانی پڑی ہیں اور ضروری
کہ یہ پہلو پیش نظر رہے۔

۲۔ کتابوں کی کمی کا معاملہ حد درجہ افسوسناک ہے لیکن انصاف کیجیے، یہ کہاں کا
یقہ ہے کہ اس بارے میں مجبور تو کچھ نہ لکھا جائے جس پر تمام تر ذمّہ داری عائد
تی ہے اور مجھ سے شکایت کی جائے؟ کتاب چھ ہزار چھپی ہے۔ چھ ہزار کا مطبع
بل دیا ہے اور چھ ہزار کی اُجرت وصول کی ہے۔ نیز چھ ہزار کا کاغذ سدّومل نے دہلی
ے بھیجا ہے۔ اب اگر ایک نسخہ بھی کم نکلتا ہے تو پریس ذمّہ دار ہے کہ اسے پورا کرے۔
تری محمد صدّیق صاحب کو میں نے لکھ دیا تھا کہ وہ مبارک علی اور محمد حسن مالک
طبع کا مقابلہ کرادیں کہ مال سمجھ بوجھ کر تحویل میں لے لیا جائے[1]۔ اسی مضمون کا خط
رک علی صاحب کے نام بھی لکھ دیا تھا۔ اب یقیناً یہ مبارک علی صاحب کا کام تھا کہ اپنا مال ٹھیک
ٹھیک گن کر لیں اور بحفاظت اس کی ترسیل کا انتظام کریں۔ انھیں چاہیے تھا کہ
پنا ایک آدمی وہاں مقرر کر دیتے۔ ہزاروں روپے کا معاملہ تھا، دو چار سو کی
ت نہ تھی۔ پھر اگر انھیں صاحب مطبع پر پورا پورا بھروسا تھا، اس لیے انھیں پر
چھوڑ دیا، تو چاہیے کہ ان سے مطالبہ کریں۔ کم سے کم میں اتنی بات کہہ سکتا ہوں کہ
مید حسن صاحب معاملہ کو ناقص چھوڑ دینے والے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔ انھیں

---

[1] مال تیار ہوتا تو لے لیا جاتا۔ جب تیار ہی نہ تھا تو کیا کیا جاتا؟

فوراً اس معاملے کی اطلاع دی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی کارستانی ہوئی ہو! لیکن جو تعداد نسخوں کی تعداد ایسی تعداد ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، اتنی ہی کی کمی کیوں ہوئی، پورے سو کی کیوں نہیں ہوئی؟ پھر آپ لکھتے ہیں کچھ ناقص نسخے بھی ہیں۔ کیا ایسا تو نہیں ہوا کہ راہ میں نسخے نکل گئے؟ صندوقوں کا ٹوٹنا آپ لکھ چکے ہیں۔ اگر ٹوٹے ہیں، تو ضرور ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک خاص تعداد نکل گئی ہو۔ مگر اس صورت میں جگہ خالی ملی ہوگی[1]۔ تصویریں یہاں کلکتہ میں چھپی تھیں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ چھ ہزار پر ایک دستہ اور بڑھا دیں۔ چنانچہ جس قدر آئیں بھیج دی گئیں۔ بعد کو مجید حسن صاحب نے لکھا کہ ڈیڑھ سو کاپیاں زائد تھیں، جو بچ رہی ہیں۔ بہرحال میں فوراً پریس کو لکھتا لیکن اس بنا پر رک گیا کہ مبارک علی صاحب نے پریس کو لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ انھیں چاہیے کہ فوراً ان سے مطالبہ کریں۔ جس قدر تاخیر کریںگے، معاملہ کمزور ہوتا جائیگا۔ ان کے مطالبے کے ساتھ میں بھی مطالبہ کروںگا۔

ابوالکلام

(۴۳)

کلکتہ

۲۲ جون ۱۹۳۸ء

عزیزی — السّلام علیکم

میں نے محمد صدّیق صاحب کو کتابوں کے بارے میں لکھا تھا۔ ان کا جواب آج مل گیا۔

---

[1] نسخے واقعی کم بھی نکلے تھے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اجزا کی ترتیب کے بعد کچھ نسخے ناقص رہ گئے تھے یعنی ان کے فرمے پورے نہ تھے۔ جس حد تک مجھے یاد ہے یہ اطلاع مدینہ پریس کو بھی بھیجی گئی تھی۔

میں نے انھیں جو تحریری ہدایتیں دی تھیں ان میں سب سے پہلی بات یہی تھی کہ شیخ مبارک علی کا مجید حسن سے مقابلہ کرا دیا جائے۔ پھر جس طرح وہ چاہیں مال لے جائیں۔ ریلوے مصارف ہماری جانب سے دے دیے جائینگے۔ یہی مضمون مجید حسن صاحب اور مبارک علی صاحب کے موسومہ خطوط میں بھی تھا۔

محمد صدیق لکھتے ہیں کہ "اسی طرح کارروائی ہوئی۔ کتابیں مبارک علی صاحب کی موجودگی میں پیک ہونا شروع ہو گئی تھیں[۱]۔ آدھی سے زیادہ ہو چکی تھیں، حوالگی کی تحریر انھوں نے لکھ دی اور وہ آپ کو بھیج دی گئی۔ اب اگر تعداد کم بتلائی جاتی ہے تو یقیناً اس میں یا تو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے یا حساب کی غلطی ہے۔ بہرحال یہ معاملہ بالکل صاف کر دیا گیا تھا کہ حوالگی کے بعد کوئی ذمّے داری ہمارے سر نہیں ہے۔ کارروائی جس قدر ہوئی پریس کے آدمیوں کے سامنے ہوئی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اپنی جانب سے کسی طرح کی کوتاہی جائز رکھتا"۔

اس کے علاوہ انھوں نے شیخ صاحب کی خشونتِ مزاج سختی کلام اور مغرورانہ طرزِ عمل کا قصّہ دہرایا ہے[۲] لیکن اس معاملے میں اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے

---

[۱] محمد صدیق صاحب کا یہ بیان تعجب انگیز تھا، اس لیے کہ کتاب پوری چھپی ہی نہ تھی تو پیک ہونی کیونکر شروع ہو جاتی۔

[۲] دنیا جانتی ہے اور شہادت دے سکتی ہے کہ شیخ مبارک علی نہ تو مزاج کے خشن اور کلام کے سخت ہیں اور نہ ان میں غرور کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ البتّہ یہ درست ہے کہ بجنور پہنچ جانے پر کتاب انھیں تیار نہ ملی تو سخت پریشان ہوئے۔ زیادہ ٹھہر نہ سکتے تھے، اس لیے کہ کاروبار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ نیز موسم شدید گرمی کا تھا اور شیخ صاحب کے لیے ایسے موسم میں باہر نکلنا سخت تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ انھوں نے خود واپس آکر مجھے بتایا کہ میں نے غصّے میں محمد صدیق صاحب سے سخت کلامی بھی کی، مگر ان کے حلم اور بردباری سے میں بہت متاثر ہوا۔

اس کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ مبارک علی صاحب اپنے ساتھ تیس نسخے لائے لیکن محمد صدیق لکھتے ہیں کہ سو نسخے اپنے ساتھ لے گئے اور ایک خاص معاملے کی وجہ سے ان نسخوں کی تعداد کا وہاں ہر شخص کو علم ہو گیا تھا یعنی اسٹیشن سے انھوں نے یہ بات کہلوائی کہ چونکہ ریلوے کرایہ دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اور سو نسخے میں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں، اس لیے ان نسخوں کا کرایہ بھی مجھے ملنا چاہیے۔ جس آدمی سے یہ بات کہی گئی تھی اس نے کہا کہ یہ بہت ہی ہلکی بات ہے، اس پر زور نہ دیجیے۔ انھوں نے کہا "نہیں ضروری بات ہے۔ یہ واضح کر دی جائے"۔ چنانچہ پورے مطبع میں اس بات کا چرچا رہا۔ پس اُن کا سو نسخے ساتھ لے جانا ایک قطعی اور معلوم بات ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر وہ اپنے ساتھ سو نسخے لائے ہیں نہ کہ تیس، تو مطلوبہ گنتی پوری ہو گئی۔ کیونکہ فرق صرف ستر چوہتر نسخوں ہی کا بتلایا گیا ہے۔

آپ نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ ناقص نسخوں میں تصویریں نہیں ہیں، لیکن اس سے کیا خاص بات نکلتی ہے؟ میں سمجھ نہ سکا۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناقص نسخے غیر مکمل فرموں کا مجموعہ ہیں۔ بڑی تعداد کی چھپائی میں کچھ نسخے ایسے زائد نکل ہی آتے ہیں۔ انھوں نے وہ بھی صندوقوں میں رکھ دیے ہوں گے۔

اگر صندوق واقعی راہ میں ٹوٹے ہیں، تو چاہیے تھا کہ فوراً اس کی اطلاع مطبع کو دی جاتی۔ نیز ریلوے کو لکھا جاتا۔

آپ نے کئی مرتبہ یہ بات بھی لکھی ہے کہ مبارک علی ۶ کو بجنور پہنچ گئے مگر محمد صدیق ۸ کو پہنچے۔ غالباً آپ کو یہ بات یاد نہیں رہی کہ میں نے کس تاریخ کے لیے لکھا تھا اور خود آپ نے مجھے کس تاریخ کی اطلاع دی تھی۔ میں نے ۶ کے لیے نہیں لکھا تھا، ۷ کے لیے لکھا تھا اور آپ نے مجھے جو اطلاع دی ہے، وہ ۷ ہی کے لیے ہے، ۶ کے لیے نہیں ہے چنانچہ

میں آپ کا "تار" اسی خط کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ یہ بھی معاملہ کے فائل میں رکھ دیا گیا تھا۔ دیکھ لیجیے اس میں ، ہے ، نہیں ہے۔ اب اگر مبارک علی صاحب خود اپنی خواہش سے ایک دن پہلے پہنچ گئے (اور غالباً شکار کھیلنے کے لیے جیسا کہ مجید حسن نے لکھا تھا) تو اس کے لیے میں مستحق ملامت نہیں ہوں۔ میں نے ، کے لیے لکھا تھا۔ کیونکہ خیال کیا تھا کہ صدیق بنارس سے روانہ ہوکر ، کو بجنور پہنچ جائینگے۔ محمد صدّیق ، کی رات کو پہنچ گئے تھے۔

آخر میں اتنی بات اور لکھ دینی چاہتا ہوں کہ مبارک علی صاحب نے حوالگی اور مقابلے کے بعد تحریر لکھ دی تھی کہ "پانچ ہزار آٹھ سو چالیس جلدیں وصول پائیں" جس پر مجید حسن اور منشی عبدالقیوم نے بھی بہ حیثیت گواہ دستخط کیے ہیں اور اسی وقت مجھے بھیج دی گئی تھی۔ تاہم میں اس معاملے کو قانونی پہلو سے نہیں دیکھ رہا۔ ہر حال میں اصل سوال اخلاقی ذمّہ داری کا ہے۔ اگر اس معاملے میں کسی طرح کی بھی اپنی اخلاقی ذمّے داری محسوس کرلوں، تو یقیناً ان کی کوئی تحریر بھی مجھے اداءِ فرض سے مانع نہ ہوگی۔ مگر افسوس ہے، میں محسوس نہیں کرتا۔

تاہم میں طیار ہوں کہ مجھے میری غلطی سے مطلّع کردیا جائے۔ آخر ۲ جلدوں کا معاملہ ہے۔ کوئی بڑی رقم بھی نہیں ہے۔ میں کبھی گوارا نہیں کرونگا کہ اس کے لیے کسی شخص کو شکایت کا موقعہ دوں۔

محمد صدّیق سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر آپ واقف ہوتے، تو آپ کو وہم و گمان بھی نہیں گزرتا کہ اس نے اپنی جانب سے کسی طرح کی کوتاہی کی ہوگی۔

"ترجمان القرآن" جلد اوّل کے لیے کیا اصول یہ ہے کہ جب کبھی وہ بھیجی جائے، تین ماہ کے وعدے پر ہی بھیجی جائیگی؟ اچھا، اگر آپ کا یہی خیال ہے تو ایسا ہی سہی۔

جلد سوم کی طباعت کے لیے جب آپ تیّار ہیں، تو پھر معاملہ طے شدہ ہی سمجھیے۔
"اُمّ القرآن" کے لیے صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ خوش نویس کا کوئی نمونہ بھیج دیتے۔ کاتبوں کے پاس ان کی کتابت کا کوئی نہ کوئی ردّی ورق تو ضرور رہتا ہے۔ اگر کوئی ایسا ورق مل جاتا، تو شکر گزار ہوتا۔ دہلی میں منشی علی محمد بھی تیّار ہیں، لیکن وہ بہت سست نویس ہیں۔

"ترجمان القرآن" کے معاملے میں سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ مقاصد و مطالب، وجوہ و دلائل، نظم و اسلوب اور نظر و استنباط کی سرتاسر از سرِ نو تدوین ہے۔ کوئی نوٹ ایسا نہیں، جو ایک نیا پردہ نہ اُٹھا رہا ہو۔ دلائلِ قرآنی کا معاملہ تو بالکل از سرِ نو مرتّب کیا گیا ہے۔ قدیم ذخیرہ میں اس کے لیے کوئی مواد موجود نہیں، بلکہ غلط طریقِ نظر نے تمام ادلّہ و جوہ کو کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ پوری کتاب پر بالاستیعاب نظر ڈالی جائے، تو تمام امور واضح ہو جائینگے۔

ابو الکلام

(۴۴)

کلکتہ

۱۵ اگست ۱۹۳۶ء

عزیزی

معاف کیجیے گا، میری طبیعت ادھر برابر خراب رہی۔ آپ کا خط رکھ دیا تھا کہ باطمینان جواب دونگا کیونکہ آپنے نزولِ مسیح وغیرہ کا معاملہ چھیڑ دیا تھا اور ضرورت تھی تفصیل کے ساتھ لکھوں۔

"ترجمان القرآن" جلد اوّل کے لیے مطمئن رہیے جس قدر جلد ممکن ہے روانہ ہوتی ہے

بلٹی شیخ صاحب کے نام براہِ راست بھیج دی جائیگی۔ مختلف وجوہ سے اختیاری نہ تھے، تاخیر ہوئی۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۴۵)

۳۰ ستمبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

تین ہفتے ہوئے "ترجمان القرآن" جلد اوّل کے مرسلہ نسخوں کی بلٹی آپ کو بھیجی گئی تھی۔ اِس وقت تک آپ نے اُس خط کا جواب نہیں دیا۔ خدا کرے مانع بخیر ہو۔ یہ خط رجسٹرڈ بھیجتا ہوں۔ براہِ عنایت جواب سے مطّلع کیجیے[۱]۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۴۶)

کلکتہ

۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء

عزیزی! السلام علیکم

تعجب ہے کہ آپ کو بلٹی نہیں ملی۔ بلٹی رجسٹرڈ خود میں نے بھجوائی تھی اور پوسٹ آفس

---

[۱] بلٹی ملی ہی نہ تھی۔ خدا جانے کیا وجہ ہوئی۔

کی رسید موجود ہے۔ آپ کے دفتر میں یقیناً کوئی بے عنوانی ہو رہی ہے۔ اگر ممکن ہو، تو تحقیقات کیجیے۔ خط رجسٹرڈ تھا۔ اگر مکتوب الیہ کو نہیں ملا تھا تو واپس آنا تھا۔ واپس بھی نہیں آیا۔

کتاب کے کل پندرہ بنڈل ہیں۔ چودہ میں سو سو نسخے ہیں، ایک میں ۴۵۔ کُل چودہ سو پینتالیس نسخے ہوئے۔

آپ نے لکھا تھا کہ تین ماہ کی تاریخ ڈال کر ہنڈی بھجوائی جائے، لیکن میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سب سے بہتر ہنڈی خود آپ ہیں۔ شیخ صاحب سے کہیے کہ وہ اپنی سہولت دیکھتے ہوئے تین ماہ کے اندر جب موقع دیکھیں، مجھے ڈرافٹ بنوا کر روپیہ بھیج دیں۔ کتاب ۱۰ ستمبر کو بھیجی گئی تھی اور میری ضروریات کا تقاضا ہے کہ پہلی دسمبر تک مجھے روپیہ مل جائے۔

"غالب" کے لیے شکریہ[۱]۔ ابھی وصول نہیں ہوئی ہے۔ انشاءاللہ اس بارے میں آپ کو لکھوں گا۔

نزولِ مسیح کے بارے میں میری جس تحریر کی نسبت آپ نے سوال کیا تھا، اس کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ نزولِ مسیح کے معاملہ کو کوئی مسلمان شرائطِ ایمان و نجات میں سے نہیں سمجھتا۔ پس جو لوگ سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے بعد بھی کسی دوسرے انسان پر ایمان لانا شرطِ اسلام و نجات ہے، وہ اس سے احتجاج نہیں کر سکتے۔ اور یہ جو میں نے لکھا تھا کہ اِس معاملہ کا تعلق آثار و علائم قیامت سے ہے، تو یہ کوئی نئی تحقیق نہ تھی، بلکہ جمہور کے عقیدہ کا اظہار تھا۔ چونکہ نزولِ مسیح کی بعض روایات اس طرح شروع ہوتی ہیں کہ لا تقوم الساعۃ حتّٰی ینزل المسیح وحتّٰی یکون کذا وکذا

---

[۱] یہ میری کتاب "غالب" کا ذکر ہے، جس کے چھپتے ہی ایک نسخہ مولانا کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔

اس لیے عام طور پر لوگوں نے اس معاملہ کو بھی اسی طرح اشراطِ ساعۃ میں سے سمجھا ہے، جس طرح دوسرے معاملات متذکرۂ روایات کو اور اس لیے محدثین اسے اشراطِ ساعۃ کے ہی باب میں لاتے ہیں اور اس حیثیت سے اس پر بحث کرتے ہیں۔ نیز جن علماء نے خصوصیت کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا ہے، انھوں نے بھی ان کے لیے اشراط و آثارِ قیامت ہی کا نام و عنوان اختیار کیا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ پیشین گوئیوں کی حیثیت سے بھی ان کی نوعیت کیا ہے؟ اور تحقیق کا فیصلہ کیا ہونا چاہیے؟ تو یہ بالکل دوسرا سوال ہے اور بلاشبہہ روایات اس بارے میں قطعی اور فیصلہ کن نہیں۔ نیز اس میں بھی شک نہیں کہ اسلام سے پہلے مسیحی اعتقاد اس بارے میں موجود تھا اور مسیحیت کے صدرِ اوّل ہی میں اس کی بنیاد پڑ چکی تھی[1]۔ ترجمان القرآن جلد سوم کا انتظار کیجیے، اس میں بہ ضمن تفسیر سورۂ زخرف اس پر مفصل بحث ملیگی[2]۔

ابوالکلام

(۴۷)

کلکتہ

۱۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء

عزیزی،

کتاب پہنچ گئی۔ میں کھانے کے بعد دوپہر کو لیٹتا ہوں، تو کوئی نہ کوئی چیز دیکھتے

---

[1] میری گزارش یہی تھی کہ نزولِ مسیح کا عقیدہ پہلے سے عیسائیوں میں موجود تھا۔

[2] غالباً مولانا نے یہ بحث سورۂ زخرف کی آیت انہ لعلم الساعۃ الخ کے ضمن میں فرمائی تھی۔

کے لیے رکھ لیتا ہوں یا شب کو سونے سے پہلے کچھ دیر پڑھتا رہتا ہوں۔ انشاء اللہ کل سے رکھونگا اور پھر آپ کو لکھونگا۔ لیکن اس وقت دیباچے کے ایک مقام پر نظر پڑی، تو ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہو گیا۔ براہِ عنایت بلا توقف مجھے جواب سے مطلع کیجیے۔
آپ نے "خان بہادر مولوی سید رجب علی ارسطو جاہ" کے ایک عزیز کا ذکر کیا ہے، جن سے مولوی صاحب ممدوح کے حالات آپ کو ملے ہیں؛ نیز غالب کا ایک خط میں یہ بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ مولوی سید رجب علی وہی صاحب ہیں، جو سر ہنری لارنس کے پاس تھے، الحاق سے کچھ پہلے اور الحاق کے بعد اور جنھیں سر ہنری بہت عزیز رکھتے تھے؛ نیز جن کا ذکر میجر ہاڈسن نے جا بجا اپنے خطوط میں بہ سلسلۂ محاصرۂ دہلی، ۱۸۵۷ء کیا ہے؟ جب غدر ہوا تو دہلی کے لیے ایک خاص انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا تھا اور (یہ) میجر ہاڈسن کے ماتحت تھا۔ میجر ہاڈسن نے اس کے لیے مولوی رجب علی کی خدمات حاصل کیں۔ وہ اپنے خطوط میں انھیں "ہنری لارنس کا فیورٹ مولوی" لکھتا ہے۔ یہ بھی تصریح ملتی ہے کہ وہ یک چشم تھے۔ سوال یہ ہے کہ انہی مولوی صاحب سے مقصود "خان بہادر ارسطو جاہ" ہیں یا دو مختلف اشخاص ہیں؟
اگر ایک ہی شخصیت ہو تو پھر مجھے ان کے تمام حالات مطلوب ہیں، جس قدر بھی معلوم ہو سکیں۔
غالب کے علاوہ اس عہد کے بعض اور اشخاص کے بھی خطوط ان کے نام ملتے ہیں، مثلاً مولوی سید امیر علی کے قیاس کہتا ہے کہ دونوں شخصیتیں ایک ہی ہونگی۔ لیکن میں چاہتا ہوں، معاملہ صاف ہو جائے۔
بصورتِ اتحادِ شخصیت، جس قدر حالات ان کے کسی عزیز نے بھیجے ہوں، مجھے نقل کرا کے بھیج دیجیے۔ بصورتِ تعددِ شخصیت، ضرورت نہیں [1]

"ترجمان القرآن" جلد اوّل کی نسبت لکھ چکا ہوں۔ شیخ صاحب سے گفتگو کر کے مجھے مطلع کیجیے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

ہاں "غالب" کا خط اچھا ہے۔ اصلاحِ سنگ اور طباعت زیادہ دقّتِ نظر کے ساتھ ہو تو زیادہ اُبھر سکتا ہے۔ آپ براہِ عنایت اتنی بات اور دریافت کر لیجیے کہ وہ نسخ بھی لکھ لیتے ہیں یا نہیں[۱]

(۴۸)

کلکتہ

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

عزیزی،

خط پہنچا، جس تسامح کا آپ نے ذکر کیا ہے، اخبار میں اس کا اعلان غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح کی کوئی نہ کوئی بات قیاسی امور میں پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ طبع ثانی میں تصحیح کر دیجیے گا[۲]

۱۔ (حاشیہ صفحہ سابق) میں نے عرض کیا تھا کہ سید رجب علی ارسطو جاہ وہی ہیں، جو لارنس کے پاس پنجاب میں رہے اور ہاڈسن کے ماتحت دہلی میں انگریزوں کے لیے خفیہ خفیہ معلومات بہم پہنچاتے رہے۔ اور ان کے حالات بھی نقل کرا کے بھیج دیے تھے۔

[۱] میری کتاب "غالب" مولوی عبدالقادر خوشنویس نے لکھی تھی، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مولانا سے عرض کیا گیا تھا کہ یہ مولوی صاحب کے خطِ نستعلیق کا نمونہ ہے۔

[۲] یہ "غالب" میں ایک تسامح کا ذکر تھا لیکن اب یاد نہیں کہ کیا تھا۔

پہلی دسمبر کو واقعی مجھے روپیہ کی ضرورت ہوگی لیکن اس سے زیادہ میں اس بارے میں نہیں لکھونگا۔ جہاں تک ان امور کا تعلق ہے، میں آپ کو دخیلِ علق تصور کر چکا ہوں۔ تعجب ہے کہ نزولِ مسیح کے بارے میں آپ کی خلش باقی ہے۔ میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی تھی، البتہ وجوہ و دلائل کے لیے کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ بغیر تفصیل کے ان کا استقصار ممکن نہیں۔ بلاشبہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ عقیدہ اپنی نوعیت میں ہر اعتبار سے ایک مسیحی عقیدہ ہے اور اسلامی شکل ولباس میں نمودار ہوا ہے۔ لیکن کیونکر نمودار ہوا، یہ بحث طلب ہے۔ اگر آپ کسی وجہ سے اسے بہت ہی اہم سمجھتے ہیں، تو کوشش کرونگا کہ وقت نکال لوں اور بہ تفصیل لکھوں[1]

وعلیکم السّلام

ابو الکلام

ایک خط مولوی رجب علی کی نسبت لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے آپ جواب بھیج چکے ہونگے۔

(۴۹)

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

آپ کی کتاب پڑھ کر نہایت جی خوش ہوا۔ یہ غالبؔ کے حالاتِ زندگی پر پہلی کتاب ہے، جو مؤلفانہ نظر و کاوش سے مرتّب کی گئی ہے۔ آپنے غالب کی تحریرات کا دقّتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور پھر ان کے نتائج اس سلیقے کے ساتھ ترتیب دے دیے کہ ایک پوری سوانحعمری وجود میں آگئی۔ آپ کی یہ کوشش اس بات کا ایک نیا ثبوت ہے کہ اگر

---

[1] میری آرزو تھی کہ حقیقتِ حال جلد معلوم ہو جائے اور ''ترجمان القرآن'' جلد سوم کے چھپنے تک انتظار کرنا پڑے، لیکن مولانا کو فرصت نہ مل سکی

نظر و مطالعہ سے کام لیا جائے تو کتنے ہی بیش پا افتادہ مواد ہیں، جن سے نہایت قیمتی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ غالبؔ کے مکتوبات کا ڈھیر اسّی نوّے برس سے موجود ہے۔ اُن کی زندگی کی سرگزشت اسی ڈھیر میں بکھری ہوئی تھی۔ لوگ دیکھتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ آپ رُک گئے اور ڈھونڈ ڈھونڈھ کر سارے پرزے نکال لیے۔ اب ان سب کو جوڑ دیا ہے، تو غالبؔ کی زندگی کا پورا مرقّع نمایاں ہوگیا ہے۔

میں ان تمام لوگوں کو جو اُردو زبان کے شائق ہیں مشورہ دونگا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور منگوائیں۔[1]

کتاب میں نے دیکھ لی۔ اس بارے میں چند سطور لکھ کر بھیجتا ہوں، آپ انھیں شائع کر سکتے ہیں۔

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک مکمّل سوانحمری لکھنی چاہتے ہیں۔ اگر یہ خیال ہوا ہوتا، تو بہت سی باتیں آپ کو لکھ کر بھیج دیتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہر تیسرے چوتھے ورق کے بعد ایسے مقامات آئے۔ میرے لیے اس طرح کی معلومات کا زبانی کہہ دینا آسان ہے، لکھنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کرونگا کہ پہلی فرصت میں بعض ضروری باتیں لکھ کر بھیج دوں، تاکہ دوسرے ایڈیشن میں کام آئیں۔

مولوی رجب علی کے حالات کے لیے شکریہ۔ آپ نے بڑی زحمت اُٹھائی اور تمام حالات نقل کر کے بھیجے۔ اُن کے خاندانی حالات کی ان تفصیلات پر تو نظر نہیں پڑی تھی، لیکن اخبار اور تفسیر نظر سے گذر چکی تھی۔ تفسیر انھوں نے والد مرحوم کو بھیجی تھی معلوم ہوتا ہے غدر کے بعد مرشد آباد میں بلوائے گئے تھے۔ غالباً کلکتہ میں والد مرحوم

---

[1] یہ میری کتاب غالبؔ کے متعلق مولانا کی گرامی قدر رائے ہے، جس کی اشاعت کی اجازت دے دی تھی۔ چنانچہ یہ رائے "انقلاب" میں چھپ گئی تھی۔

سے ملے ہونگے۔
باقی امور کے لیے دوسرے خط کا انتظار کیجیے۔

ابوالکلام

(۵۰)

کلکتہ

۱۷ نومبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

آپ کو خط لکھنے کے بعد طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ گیارہ ماہ کے بعد یہ عرق النساء کا شدید دورہ تھا۔ کئی دن تک یہ حال رہا کہ بستر سے نیچے قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ معالج کی رائے ہوئی کہ (Myocrisin) نامی دوا کا انجکشن لینا چاہیے۔ چنانچہ ہر تیسرے دن لے رہا ہوں۔ اب شدّت جاتی رہی ہے، صرف خلش باقی ہے۔ اور اگر اسی حد تک رہے تو کوئی وجہ شکایت نہیں۔ مرض کی موجودگی مجھے پریشان نہیں کرتی۔ اس کی شدّت پر معترض ہوں کہ دماغی انہماک میں خلل انداز ہونے لگتی ہے۔

مولوی حبیب علی کی، گر خود نوشتہ سوانحمری موجود ہے تو ممکن ہے بعض امور پر اس سے کچھ روشنی پڑے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی صاحب وہ رسالہ پورا نقل کریں؟ جس قدر اُجرت مطلوب ہو، کاتب کو دے دی جائیگی۔ اس کے لیے آپ سفر کی زحمت کیوں گوارا کریں؟ رسالہ یقیناً ضخیم نہ ہوگا۔ جگراؤں میں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی نکل آسکتا ہے کہ اُجرت پر رسالہ نقل کر دے[1]۔

---

[1] افسوس ہے کہ اس رسالے کی نقل حاصل نہ کی جا سکی۔

"غالب" کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سی باتیں ایسی نظر آئیں کہ طبع ثانی میں بڑھا دینی چاہییں۔ میں انشاء اللہ ضرور کوشش کرونگا کہ کسی وقت پھر آپ کی کتاب اٹھاؤں اور بعض ضروری امور قلمبند کر کے بھیج دوں۔

اگر مطبع کسی شخص نے ٹھیکہ پر لے لیا تھا تو یقیناً طباعت کی تمام ذمّے داری اسی کے سر ہے اور وہ قانوناً مجبور ہے کہ ضمانت کی رقم ادا کر دے۔ لیکن آپ دیکھیں، کوئی صورت نہیں نکل رہی ہے، تو پھر چارۂ کار اس کے سوا کچھ نہیں کہ مشینوں کو بالکل ایک نئے مطبع کی شکل دے دی جائے۔ یعنی نیا نام ہو، نیا پرنٹر ہو، نئی جگہ ہو اور نیا ڈیکلریشن۔ اس طرح ضمانت کی دقّت رفع ہو جا سکتی ہے[1]۔

شیخ مبارک علی صاحب کی نسبت اس لیے میں نے کچھ نہیں لکھا تھا کہ چاہتا تھا، دسمبر کی ضرورت جنوری تک ملتوی ہو جائے۔ تاکہ شیخ صاحب کو زحمت دینی نہ پڑے، لیکن ایسا انتظام نہ ہو سکا۔ بہر حال، یہی کیجیے کہ ایک ہزار کا ڈرافٹ مجھے اس وقت بھیج دیں، بقیہ رقم جنوری کے پہلے ہفتے میں۔ اگر اس میں ان کے لیے سہولت ہے، تو مجھے بھی چاہیے کہ اس کی راہ نکالوں[2]۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

---

[1] یہ انقلاب کے پریس کا معاملہ ہے جس سے ضمانت مانگی گئی تھی۔

[2] یہ "ترجمان" جلد اوّل کی قیمت کا معاملہ ہے جس کے لیے تین ماہ کی مہلت مل گئی تھی۔

(۵۱)

کلکتہ

۳ دسمبر ۱۹۳۶ء

عزیزی،

خط پہنچا، میر تقی والی حکایت مندرجہ "یادگار غالب" عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں[1]۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی، جب ملا عبدالصمد میرے مکان پر آ کر مقیم ہوا اور فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہوگا، تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہوگا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد اور مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ برس کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا، جن سے سراج الدین علی خان آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگان مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے، تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے

---

[1] سوال یہ تھا، آیا یہ درست ہے کہ مرزا غالب کے اشعار آگرہ سے میر تقی میر کے پاس پہنچے

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لگا ہو؟ حتیٰ کہ میر صاحب تک کسی نے یہ تذکرہ پہنچا دیا ہو؟

۲۔ اس طرح کے "تذکروں" میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن محض رفع غرابت کے لیے لکھتا ہوں کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کردی تھی۔ میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۹۰۰ یا ۱۹۰۱ء کی بات ہے، بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنج بہادر" نکالا کرتے تھے ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتہ میں بعض شعراء اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی: پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی۔ میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی۔ تین شعر ان مزخرفات کے اب تک ذہن نے ضائع نہیں کیے ہیں:

نشتر بدل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلیگی زبان کی

گنبد ہے گردباد، تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بیخودی کے نشیب و فراز دیکھ
"پوچھی زمین کی، تو کہی آسمان کی"

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس وقت انھیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی کہ چھتیس برس گزر چکے ہیں، اپنی وہ خوشی پوری طرح

اور میر نے کہا کہ اسے استادِ کامل مل گیا تو لاجواب شاعر بن جائیگا ورنہ مہمل بکیگا۔ حالانکہ میر کی وفات کے وقت غالب کی عمر صرف تیرہ برس کی تھی۔ مولانا نے اپنے ابتدائی حالات اسی سلسلے میں بیان فرمائے اور نہایت قیمتی مواد بہم پہنچائے، جو کسی دوسرے ذریعہ سے نہ مل سکتے تھے۔

محسوس کر رہا ہوں، جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی، جب "ارمغانِ فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

۳۔ اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخی[1] رام پوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انھیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں، میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مجھے پکڑ کے ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے، جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے، ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں۔ وہ غزل کے لیے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا، امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلائی، یاد نہ ہو، شاد نہ ہو۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو، لیکن خدا کی قسم، عقل باور نہیں کرتی۔" اس وقت سوچتا ہوں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے

---

[1] ان کے متعلق بعض نہایت دلچسپ باتیں مولانا نے میری کتاب "غالب" پر لکھی تھیں۔ جو دوسرے حصے میں شائع ہو رہی ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ مکتوب میں بیان کی ہوئی کہانی اور میری کتاب میں تحریر شدہ کہانی کو دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو خفیف سا اختلاف ملیگا۔ لیکن اسے اجمال و تفصیل کے سوا کچھ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جیسے کل کی بات ہو۔

۴۔ پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ "مخزن" نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں چند تحریریں بھیجیں[1]۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر "خدنگِ نظر" نکالتے تھے۔ اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انھیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصّہ بھی شامل کر دیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمّے لے لی۔ اسی زمانے میں مولوی احمد حسن مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں۔ ایک رسالہ خود نکالنا چاہیے۔ چنانچہ "لسان الصّدق" جاری کیا۔ یہ تمام معاملات ۱۹۰۳ اور ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، تاکہ جو کتابیں

---

[1] خدنگِ نظر، مغانِ فرخ، احسن الاخبار، تحفۂ احمدیہ وغیرہ میں نے نہیں دیکھے البتہ "لسان الصّدق" کے کچھ پرچے میرے پاس ہیں۔ مولانا کی خدمت میں بارہا عرض کیا کہ یہ فائل پورا کرا دیجیے۔ ایک دفعہ حتمی وعدہ فرمایا مگر افسوس کہ میں ایفاء وعدہ کے لیے اصرار و ابرام کا طریقہ اختیار نہ کر سکا۔ جس حد تک مجھے یاد ہے "مخزن" کے ابتدائی دور میں مولانا کے دو مضمون نکلے تھے ایک "اخبار" پر اور دوسرا "خاقانی شروانی" پر۔ اخبار پر جو مضمون نکلا تھا اس پر میر غلام بھیک مرحوم نیرنگ نے غصّے کا اظہار کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر مرحوم سے کہا تھا کہ "مخزن" نوعمر لڑکوں کی مشقِ مضمون نگاری کے لیے نہیں جاری کیا گیا۔ چنانچہ یہ واقعہ شیخ عبدالقادر نے مولانا کو اس وقت سنایا تھا جب وہ علم و فضل اور تحریر و تقریر میں یگانگی کا رتبہ حاصل کر چکے تھے۔

پڑھی جا چکی ہیں، وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔ اس لیے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرادیا تھا۔ ان میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے، جن کی ڈاڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔
اسی زمانے میں تقریر کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۳ء میں کی، اس وقت عمر پندرہ تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

۵۔ بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر اس عمر میں مَیں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لیے، جسے قدرت نے شاعری ہی کے لیے پیدا کیا تھا، یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے!
مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حسام الدین حیدر[۱] مرزا سلیمان شکوہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر یہ خیال صحیح ہو تو ان کا آگرہ سے تعلق واضح ہو جاتا ہے مرزا سلیمان شکوہ کی جب قمر چہرہ کے معاملے میں نصیر الدین حیدر سے اَن بَن ہو گئی، تو وہ لکھنؤ سے چلے گئے تھے۔ کچھ دنوں جنرل گارڈن کے یہاں رہے، پھر آگرہ کا رُخ کیا۔ ہو سکتا ہے حسام الدین حیدر اور غالب کے ابتدائی تعلقات اسی زمانے

---

[۱] حسام الدین حیدر خان کی مستقل سکونت دہلی میں تھی اور جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں مرزا سلیمان شکوہ سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ البتہ خاندانِ لوہارو سے حسام الدین کے تعلقات بہت گہرے تھے اور اسی خاندان میں (رجب ۱۲۲۵ھ) غالب کی شادی ہوئی۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ غالب کی شادی اور میر کی وفات میں صرف تین ماہ کا فصل ہے۔

میں شروع ہو گئے ہوں۔ یہ محض قیاس ہے، وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ بعض کتابوں کے مراجعہ سے تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں۔

"ترجمان القرآن" لکھتے ہوئے میرے پیشِ نظر تورات کے تین نسخے رہے ہیں۔ عہد عتیق عربی مطبوعہ قسطنطنیہ ۱۷۶۲ء، عہد عتیق عبرانی مطبوعہ وائنا ۱۲۳۲ھ نمبروں کے لیے انگریزی نسخے سے کام لیا ہے۔ اُردو بائبل کا پہلا ایڈیشن مطبوعہ سرامپور بھی موجود ہے، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

۲۔ نمبر چونکہ درس (آیت) کے آخر میں نہیں دیے گئے، بلکہ حاشیہ میں دیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ایک کی کمی بیشی کا ہو جانا مستبعد نہیں ہوتا۔ یہ بات کہ کونسی آیت کس سطر میں ختم ہوئی ہے اور ایک سطر میں کہاں اتمام و آغاز ہوا ہے، مختلف ایڈیشنوں میں حاشیے کے نمبروں کو مختلف کر دے سکتا ہے۔ نیز اندراج کے وقت مختلف نگاہیں اتمام و آغاز کو مختلف نمبروں میں دیکھ سکتی ہیں۔ اس طرح کے حوالوں سے مقصود آیات کی تعداد کی تحقیق نہیں ہوتی، صرف استخراج کا سراغ دے دینا مقصود ہوتا ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ جو نمبر حوالے میں درج ہو، اس کے محاذ میں آیت ڈھونڈھی جائے۔ بجنسہٖ اسی نمبر کے محاذ میں، یا اس سے ایک آیت اوپر تلے، مطلوبہ مقام مل جائیگا۔

لہ یہ تمام تفصیلات اس لیے بیان فرمائیں کہ میں نے "ترجمان القرآن" کا مطالعہ کرتے وقت بائبل کے حوالوں کی چھان بین کی تھی اور عرض کیا تھا کہ بعض حوالے غلط معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا نے میری بعض گزارشات کو درست مان لیا، جو گزارشیں نادرست تھیں، ان کے متعلق ضروری تصریحات فرمادیں۔

اس بات کو بطور ایک اصل کے لوگوں نے کتابوں کے دیباچوں میں بھی لکھ دیا ہے، مثلاً بائبل کے مقدمہ میں:

البتہ آپ کا خط پڑھ کر میں نے ان مقامات کا مطالعہ کیا، نیز اصل مسودہ نکال کے دیکھا تو معلوم ہوا، بعض مقامات میں کتابت کے اغلاط ضرور رہیں، اور افسوس ہے کہ میں نے خصوصیت کے ساتھ کاپی دیکھتے ہوئے ان نمبروں کا مقابلہ نہیں کیا۔ بہرحال آپ کے پیش کردہ مقامات کو لکھتا ہوں۔ اپنے نسخہ کی تصحیح کر لیجیے اور اگر آیندہ کوئی حوالہ الجھاؤ پیدا کرے، تو اس سے مطلع کیجیے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کے لیے آپ کو جزائے خیر دے۔

۷۔ (۱) سنگی الواح کا حوالہ مندرجہ صفحہ ۳۴ شمارہ آیات کے اعتبار سے ۳۲: ۱۵ ہی ہوگا لیکن میں نے اگر ۳۲: ۱۴ لکھا ہے تو یہ بھی غلط نہیں ہے کیونکہ حاشیہ پر ۱۴: ۱۵ لکھا ہے۔ ایک کی کمی بیشی اس طرح کے حوالوں میں ہو جاتی ہے

(۲) صفحہ ۳۵ کا حوالہ ۳۱: ۳۲ غلط چھپ گیا ہے اور عجائب اغلاط میں سے ہے صحیح ۳۲: ۲ ہے اسے نکالیے۔

(۳) بشارات ظہور کے تمام حوالے ٹھیک ہیں، لیکن غالباً آپ نے سرسری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور کچھ جدید ترجمہ نے بھی الجھاؤ پیدا کر دیا ہوگا۔ غالباً آپ کے پاس بائیبل سوسائٹی کا جدید مصحح ایڈیشن ہے۔

(الف) استثناء ۱۸: ۱۷ کا آپ کے نزدیک ۱۸: ۱۸ ہونا کوئی اختلاف نہیں۔

(ب) استثنا۔ ۳۲: ۲۱ کو آپ لکھتے ہیں، نہیں ملا۔ حال آنکہ موجود ہے، یہ مقام پھر دیکھیے۔

۸۔ چونکہ یہ مقام بھی من جملہ اُن مقامات کے ہے، جن سے مسلمانوں نے عام طور پر استدلال شروع کر دیا تھا اور "قوم اُمّی" اور "نبی اُمّی" کی پیشین گوئی اس سے نکالی گئی تھی۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے مسیحی مناظروں میں فارقلیط کی طرح اس کے خلاف بھی عام میلان پیدا ہو گیا ہوگا اور بعد کے ایڈیشنوں اور نئے ترجموں میں اس کی تعبیر کچھ بدلتی گئی۔ تاہم اب بھی استشہاد کے لیے کفایت کرتی ہے۔

استثنا، ۳۲ : ۲۱ کا یہ۔ یہاں حضرت موسیٰ خدا کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں کہ وہ بنی اسرائیل سے اُن کی بدعملیوں کی وجہ سے منہ چھپا لیگا، اور ایک اَن پڑھ قوم کو ان کی جگہ سر بلند کر کے انھیں غیرت دلائیگا۔ تورات عربی مطبوعہ قسطنطنیہ مصححہ سعید قیومی میں یہ عبارت اس طرح ہے "ھم اغارونی واغضبونی بعبودا الهم الباطلة وانا اغیرهم بغیر شعب وبشعب جاهل اغضبهم" یعنی انھوں نے اپنے باطل معبودوں سے مجھے غیرت دلائی تو میں ایک دوسری قوم سے انھیں غیرت دلاؤنگا، ایک جاہل قوم سے" عربی کی قدیم تورات جو بلادِ مصر و شام میں رائج تھی، اس میں صریح "بشعب امّی" کا لفظ تھا، چنانچہ قدماء مناظرین نے ایسا ہی نقل کیا ہے، بعد کو "امّی" کی جگہ "جاہل" کا لفظ بنا دیا گیا۔ بہر حال یہ بھی صحیح ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صریح عربوں کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اس قوم کی سب سے بڑی پہچان اس کی بدویت اور جہالت تھی۔ خود قرآن نے عرب قبل از اسلام کے لیے "جاہلیۃ" کا وصف اختیار کیا ہے اور ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ[۳۸] ظاہر و معلوم ہے۔

۹۔ لیکن یہاں بعد کے ترجموں میں دو تحریفیں کی گئی ہیں۔ ایک تو "بغیر شعب" کے ترجمے میں، دوسری "شعب جاہل" کے ترجمے میں۔ پہلے کا مطلب یہ ٹھہرایا ہے کہ "جو قوم نہیں ہے" اور "جاہل" کے لیے "بے وقوفی" اور "بے عقلی" کی ترکیبیں کام میں لائے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کا نسخہ کون سا اور کس زبان کا ہے!

(ج) زبور ۵-۴۵ : ۱؛ آپ کو نہیں ملا، حالانکہ موجود ہے۔ ۱۔ کے اشارہ سے مقصود پورا نغمہ ہے۔ سب پڑھ جائیے۔ اس زبور میں حضرت داؤد ایک خاص ہستی کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ تمام یہودی اور مسیحی شارح اس باب میں متفق ہیں کہ یہ ہستی ایک موعود و منتظر ہستی تھی۔ مسیحی شارحین اسے حضرت مسیح کی طرف لے جاتے ہیں اور علماءِ یہود کہتے ہیں مسیح ہی کے متعلق ہے مگر وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا۔

۱۰۔ مگر جب اس زبور کے متذکرہ اوصاف پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو وہ صرف پیغمبر اسلام ہی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ مثلاً وہ پادشاہ ہوگا، تلوار بہ کمر ہوگا، قومیں اس کے سامنے سربسجود ہو جائینگی، تحفے اور نذرانے اس کے آگے لائے جائینگے، وغیرذالک حضرت مسیحؑ پر یہ اوصاف راست نہیں آتے اور پیغمبر اسلام کے سوا کوئی ظہور ہوا نہیں پس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ پیشین گوئی ظہورِ اسلام ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(د) متی ۲۰ : ۱ کو بھی آپ لکھتے ہیں کہ ملی نہیں حالانکہ صاف موجود ہے، پھر دیکھیے۔ اس میں مسیح نے آسمان کی بادشاہت کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ انگور کے ایک باغ کے لیے مزدوروں کی ضرورت تھی۔ باغ کے مالک نے ایک دینار روزینہ مقرر کیا اور کہا جو کام کریگا، اتنا ہی پائیگا۔ کچھ مزدور صبح آئے اور لگ گئے۔ کچھ دوپہر کو آئے اور کام کرنے لگے۔ کچھ سہ پہر کو ملے انھیں بھی لگا دیا گیا۔ شام کو جب مزدوری بٹی، تو سب نے ایک ایک دینار پایا۔ اس نے بھی جو صبح سویرے سے کام کر رہا تھا اور اس نے بھی جسے مالک نے سہ پہر کو لگایا تھا۔ پہلے کو دن بھر محنت کرنی پڑی، دوسرے کو دو تین گھنٹے۔ یہ مالکِ باغ کا فضل تھا۔

۱۱۔ مسلمان کہتے ہیں، اس مثال میں آخری اُمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی لیے

آنحضرت صلعم نے فرمایا: "مثلکم و مثل اھل الکتابین کمثل رجل استاجر اجرا فقال من یعمل لی من غدوۃ الی نصف النھار علی قیراط . . . . الخ [39]

مشہور حدیث: نحن الآخرون السابقون بید انھم اوتوا الکتاب من قبلنا واوتینا من بعدھم . . . . الخ [40]

(ھ) یوحنا کا حوالہ ۱۴ : ۱۵ آپ کے نسخے میں ۱۴ : ۱۶ ہے یہ کوئی بات نہیں۔

(و) جبل حورب کے حوالے میں بلاشبہ کتابت کی غلطی ہے۔ اصل میں ۱۷ : ۶ تھا اسے کاتب نے ۱۱ : ۶ بنا دیا۔ اسے درست کر دیجیے اور ۱۷ : ۶ نکال کر دیکھیے

(ز) یرتجو یا اریحا یا جریحو کے حوالے میں بھی طباعت کی غلطی ہے گنتی ۲۳ : ۵ چھپ گیا ہے؛ حالانکہ اصل میں ۳۳ : ۵ تھا۔ ۳ کی جگہ ۲ لکھ دیا گیا۔ آپ گنتی ۳۳ : ۵ نکالیے جریحو کا ذکر موجود ہے۔

۱۲۔ میرا عربی اور عبرانی کا نسخہ ضرور مرجح ہے لیکن آپ کو یہ بہ آسانی نہیں ملیگا۔ یورپ کے کسی پرانی کتابوں کے تاجر سے مل جائے، تو مل جائے۔

دیکھیے بیخبری میں کتنے صفحے لکھ گیا۔ یا تو خطوں کے جواب میں دو سطر لکھنا بھی دوبھر ہوتا ہے، یا یہ عالم ہے کہ دس بارہ صفحے سیاہ ہو چکے اور ابھی تک کہانی ختم نہیں ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ رمضان کی آمد نے یکایک بجھی ہوئی طبیعت میں تازگی پیدا کر دی ہے عشا کے بعد بیٹھتا ہوں تو صبح تک دماغ کے کیف و سکون میں کوئی بات خلل انداز نہیں ہوتی [1] اس وقت تین بج چکے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی سبز چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، جو ایک جاپانی دوست نے حال میں بھیجا ہے۔ آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور دل میں سوچ رہا ہوں، اگر ایسی چائے کے فنجان میسر ہوں، تو

---

[1] اس سے واضح ہو گیا کہ مولانا رمضان شریف میں عموماً رات بھر جاگتے رہتے تھے

پھر اور کونسی نعمت باقی رہ جاتی ہے، جس کی انسان خواہش کرے! میرے لیے یہی چاے سحری کی صبوحی بھی ہے اور افطار کا جام خمار شکن بھی۔ دیکھیے، یہاں بھی غالب کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا:

خجلت نگر کہ در حسنا تم نیا فلتند
جز روزۂ درست، بہ صہبا کشودہ[41]

۱۳۔ آپ خواجہ حسن نظامی کے روز نامچہ ہائے غدر کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں نے اخباروں میں ان کا نام دیکھا تھا، مگر کبھی یہ خیال نہیں گزرا کہ ان میں کوئی قابلِ اعتنا بات ہوگی۔ کیا واقعی غدر کے زمانے کی تحریریں اس میں استناد کے ساتھ جمع کی گئی ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہو تو لکھیے کون کون سے رسالے ہیں؟ بہادر شاہ کے مقدمہ کی روئداد پرانی بھی چھپی ہوئی موجود ہے اور پنجاب میں ایک نئی بھی چھپ گئی ہے۔ میرزا حیرت[42] نے "چراغ دہلی" میں اس کا خلاصہ اردو میں بھی چھاپ دیا تھا۔ اودھ کی بعض تحریروں اور روزنامچوں کا انگریزی ترجمہ اسٹیٹ پیپرز کے سیلکشن میں شائع ہو چکا ہے۔ معین الدین کا نام روزنامچہ اور منشی جیون لعل کی تحریریں بھی چھپ چکی ہیں۔ کیا خواجہ حسن نظامی کے رسالوں میں ان کے علاوہ بھی کچھ مواد ہے؟

روپیہ کے متعلق منتظر رہونگا۔ اُمید ہے، شیخ صاحب یہ رقم روانہ کر رہے ہونگے اور بقیہ جنوری کے اوائل میں وصول ہو جائیگی۔

ابو الکلام

(۵۲)

فیض پور (ساورا)

۲۴ دسمبر ۱۹۳۶ء

عزیزی

خط بر وقت مل گیا تھا لیکن رمضان کے آخری دنوں نے مہلتِ التفات نہ دی۔ اللہ کے افضالِ خاص میں سے ایک فضل یہ ہے کہ اس ماہ کی خوش وقتیوں سے کبھی محروم نہیں رہتا۔ دنیا کے لیے چار موسم ہوا کرتے ہیں۔ میرے لیے صرف دو رہ گئے ہیں۔ گیارہ مہینے خزاں کے، ایک بہار کا۔ رمضان میرے لیے "بہار و بادہ" کا پیام ہوتا ہے:

ہمہ شب شراب خوردن، ہمہ روز خواب کردن![۴۳]

اگر مہلت ملے، تو "ترجمان القرآن" جلد اوّل کا از سرِ نو مطالعہ کیجیے[۱]۔ کام کی اصل بنیادیں تو وہیں استوار ہوئی ہیں۔ اگر بقرہ اور آلِ عمران کی مہمات حل نہیں ہوتیں، تو قرآن میں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پھر تفسیر سورۂ فاتحہ کے مطالب تو اصل اصول ہیں۔ اس کی چار چار پانچ پانچ سطروں کے اندر جو بات لکھ دی گئی ہے، وہ اپنی جگہ ایک پوری کتاب ہے، البتہ اسلوبِ بیان علمی ہے، انشا پردازانہ پھیلاؤ نہیں ہے۔ نیز یہ مقدمہ بھی واضح نہیں ہوا ہے کہ معاملے

---

[۱] یہ اس لیے فرمایا کہ میں نے عرض کیا تھا "ترجمان" جلد اوّل میں بھی اسی پیمانے کے حواشی تحریر فرمائیں۔ جو جلد دوم میں اختیار کیا گیا۔ ساتھ ہی عرض کیا تھا، کہ جا بجا تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

کی پچھلی حالت کیا تھی اور جو تدوینیات اب عمل میں آئی ہیں وہ کونسی ہیں؟ لامحالہ سرسری نظر کام نہیں دیتی خصوصیت کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ بیعتِ عقبہ کے بارے میں روایاتِ سیرۃ مختلف ہیں۔ اختلافِ اجتماع کی تعداد اور اشخاص دونوں میں ہوا۔ تاہم یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ عقبہ کی بیعتیں دو ہی ہوئی تھیں۔ عقبۂ اولیٰ اور ثانیہ۔ البتہ بعض اس طرف گئے ہیں کہ باشندگانِ یثرب سے ملاقاتیں تین مرتبہ ہوئیں۔ پہلی مرتبہ کچھ لوگ متاثر ہوکر چلے گئے۔ پھر دو مرتبہ آئے اور بیعت کی۔ ابن قیمؔ نے یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ میں نے سیرۃ کے عام مسلک کو ترجیح دی ہے۔

آپ لکھتے ہیں، میں نے ایک جگہ "بہتر" لکھا ہے۔ "ترجمان القرآن" جلد دوم کا کوئی نسخہ اس وقت موجود نہیں، اس لیے دیکھ نہیں سکتا۔ لیکن میرے ذہن میں بہتّر ہی کی تعداد ہے، ستّر مرد، دو عورتیں۔ اگر واقعی بہتر چھپ گیا ہے تو یہ طباعت کی غلطی ہوگی۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ عید کی ملاقاتیں خلل انداز ہوئیں پھر کئی دن تک مہلت نہیں ملی۔ ۲۱ کو فیض پور کے لیے نکلنا پڑا، تو کاغذات ساتھ رکھ لیے۔ اب یہاں فرصت کا ایک ہی وقت یعنی قبل از طلوعِ آفتاب ہاتھ آیا، تو سب سے پہلے آپ کے ناتمام خط پر نظر پڑی۔ اس علاقے میں سردی زیادہ نہیں ہوتی۔ چونکہ کھلا میدان ہے اور چٹائی کی چھت، اس لیے صبح کیفیت سے خالی نہیں[1]۔ وہی اعلیٰ درجے کی چائے جس کے وصف "اعلیٰ درجے" کو آپ نے علامتِ اقتباس کے درمیان لکھا ہے، سامنے ہے، جام پہ جام خالی کر رہا ہوں اور آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

---

[1] مطلب یہ کہ خاصی خنکی ہوتی ہے۔ مولانا کو موسم کی خنکی بہت مرغوب تھی۔

بادہ پیش آر کہ اسباب جہاں ایں ہمہ نیست [۴۴]

سورۂ مریم میں "تحتاکِ سریّا" [۴۵] کا ترجمہ عام طور پر نہر ہی کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے دوسرا مطلب زیادہ موزوں معلوم ہوا۔ یہ شبہہ آگے چل کر "کلی واشربی" سے نئی بات شروع ہوتی ہے، اسے اس کے ساتھ نہ جوڑ لیے۔ پہلے تسکین دی کہ جس بات پر غمگین ہو رہے ہو، وہ غم کی بات نہیں۔ پھر کہا اب کھاؤ پیو، چین سے رہو کسی طرح کی پریشانی جی میں نہ لاؤ۔[۱]

آپ نے حضرت مسیح کی زندگی متذکرۂ قرآن کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ حال آنکہ کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جو موجبِ تشویش ہو۔ البتہ خط وکتابت سے یہ باتیں صاف نہیں ہو سکتیں۔ آکر ملیے، تو سب کچھ سنوں اور سب کچھ سناؤں۔

"یکلم فی المھد" [۴۶] کا یہ مطلب ٹھہرانا ضروری نہیں ہے کہ شیرخواری میں باتیں کرتے تھے۔ ہر زبان کی طرح عربی زبان کا بھی یہ محاورہ ہے کہ کمسن کو مہدنشین سے تعبیر کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک کمسن لڑکے سے ہم کیا باتیں کریں۔

آپ نے "ننھے نواب" [۴۷] کے روزنامچۂ غدر کا حال دریافت کیا ہے۔ یہ معتمد الدولہ آغا میر کے لڑکے تھے۔ جب کانپور میں انقلاب شروع ہوا، تو انھوں نے بقیدِ تاریخ حوادث قلمبند کرنا شروع کر دیے۔ غالباً اس لیے کہ حکامِ انگریزی کے کام آئیں، کیونکہ ان کے خاندان کا شمار خیر خواہانِ کمپنی میں تھا۔ بعد کو جب عظیم اللہ نے مجبور کیا کہ چھاؤنی کے محاصرہ میں حصہ لیں تو روزنامچہ کا سلسلہ رک گیا۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب ہیولاک کانپور پہنچا، تو انھوں نے اپنی بیگناہی کے ثبوت میں اپنی یہ تحریر

---

[۱] مولانا نے سریا کا ترجمہ ایک بڑی ہستی کیا تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ "کلی واشربی" کو پیش نظر رکھتے ہوئے سریا کا ترجمہ "نہر" زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پیش کی۔ چنانچہ کانپور کے سرکاری کاغذات میں یہ روزنامچہ بھی شامل کردیا گیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ اس رپورٹ میں ملتا ہے جو تحقیقاتِ کانپور کی مرتب کی گئی تھی۔ اصل اردو بھی غالباً خود ننھے نواب نے چھپوا کر شائع کیا تھا۔

شیخ مبارک علی صاحب نے ایک ہزار کا ڈرافٹ بھیج دیا تھا، جو وصول کرچکا ہوں۔ امید ہے اوائل جنوری میں بقیہ رقم بھی بھیج دینگے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوالکلام

(۵۳)

۵۳/۱۳۶ کلکتہ

۴ جنوری ۱۹۴۷ء

عزیزی

فیض پور سے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس وقت سورۂ مریم کا مطالعہ کررہا تھا، تو خیال آیا کہ آپنے "مکاناً شرقیا" کی نسبت بھی لکھا تھا۔ غالباً آپنے ناصرۂ قدیم اور ناصرۂ جدید میں فرق نہیں کیا ہے۔ ناصرہ کے نام سے جو گانو آباد ہے، یہ وہ ناصرہ نہیں ہے، جو حضرت مریم کا وطن تھا۔ اس کا محل موجودہ ناصرہ سے مشرق کی طرف ہٹا ہوا تھا۔ ۱۸۸۳ء میں جب جنرل گورڈن نے مسیح کے محلِ دفن کی تحقیقات شروع کی، تو اس کا خیال ناصرہ کی طرف بھی گیا اور بالاخر بحث و تنقید کے بعد قدیم ناصرہ کا محلِ وقوع نمایاں ہوگیا۔

معھذا "مکاناً شرقیا" کا مطلب وہ بھی ہوسکتا ہے جو عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ اس قسم کے مقامات کی تفسیر جزم و یقین کے ساتھ نہیں کی جاسکتی، قرائن و آثار

کی بنا پر کوئی بات سامنے آجاتی ہے اور اُسے اختیار کرلیا جاتا ہے[ل] -

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۵۴)

۱۲- جنوری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ اس وقت یہ خط ایک خاص ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ مولوی معین الدین ... شاہ ولی اللہ کی ایک کتاب عربی میں "دراسات اللبیب" ہے رد تقلید اور حدیث میں بہت عرصہ ہوا لاہور میں چھپی تھی۔ میرے پاس موجود تھی، لیکن اب ڈھونڈھتا ہوں تو نہیں ملتی۔ اور اس کی وجہ سے ایک نہایت ضروری مقام رُکا پڑا ہے۔ آپ براہِ عنایت بلا تاخیر کتب فروشوں سے دریافت کریں اور مل جائے تو میرے نام وی، پی پارسل کے ذریعہ بھجوا دیں۔ اگر کتب فروشوں کے پاس نہ ملے، تو پھر کوشش کیجیے کسی کا نسخہ عاریتہً مل جائے، مجھے صرف ایک

ل سورۂ مریم میں ایک مقام پر ہے کہ حضرت مریمؑ اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہو کر شرقی سمت کے مکان میں چلی گئیں (مکاناً شرقیا) دوسری جگہ ہے کہ دُور کے مکان میں چلی گئیں، (مکاناً قصیا) مولانا نے "ترجمان" میں فرمایا تھا کہ حضرت مریم ناصرہ چلی گئی تھیں، جو یروشلم کے شمال مشرق میں واقع ہے اور باشندگان یروشلم کے لیے مشرق کا حکم رکھتا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ناصرہ قدیم ہو یا جدید، نہ یروشلم کے شمال مشرق میں ہے اور نہ باشندگان یروشلم کے لیے مشرق کا حکم رکھتا ہے۔ بلکہ وہ یروشلم کے عین شمال میں ہے۔ یہ ارشاد میری اس گزارش کا جواب ہے۔

گھنٹے کے لیے مطلوب ہے، بلکہ ایک نظر کے لیے۔ اگر کسی کا ذاتی نسخہ ہو، یا کسی کتب خانے کا ہو، تو جس دن مجھے ملیگا، اسی دن واپس بھیج دونگا۔ اہلِ حدیث علماء کے پاس یہ کتاب ضرور ہوگی۔ اگر مولوی داؤد صاحب غزنوی وہاں موجود ہوں، تو ان سے یہ دریافت کیجیے۔ ان کا پتہ مجھے معلوم نہیں، ورنہ انھیں زحمت دیتا۔

والسّلام

جس قدر جلد ممکن ہو، بصورتِ حصول کتاب بھجوایئے۔ مجھے اُمید ہے کسی کتب فروش کے یہاں بچا بچایا نسخہ ضرور موجود ہوگا۔ کشمیری بازار کے تمام کتب فروشوں سے ضرور دریافت کرا لیا جائے[1]

ابوالکلام

(۵۵)

کلکتہ

۱۱ جنوری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، انتظار تھا کہ شاید "دراسات" دہلی سے آجائے۔ مگر ابھی تک وصول نہیں ہوئی۔ غالباً وہاں بھی نہیں ہوگی۔ کتاب چنداں نایاب نہیں، کیونکہ بہرحال مطبوعہ ہے۔ لیکن وقت پر ملنا شرط ہے۔

---

[1] کتاب کہیں سے نہ ملی مولانا کو برابر اطلاع بھیجتا رہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ جب اس واقعے پر چار پانچ سال گزر گئے تو "دراسات اللبیب" بے طلب میرے پاس آگئی اور صرف اس لیے رکھ لی گئی کہ مولانا کو ایک مرتبہ ضرورت پیش آئی تھی۔ ممکن ہے پھر پیش آجائے۔

آپ نے لکھا ہے کہ فروری کے بعد کلکتہ کا قصد کریںگے، ضرور کیجیے:

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو حکایت کنم از ہر بابے[۵۱]

شیخ مبارک علی صاحب کے حساب میں کوئی بات اب دریافت طلب نہیں رہی۔
ستر نسخوں والی بات کے لیے میں نے اپنا خیال آپ کو لکھ دیا تھا مگر ساتھ ہی فیصلہ آپ پر چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا اس کا منشا، یہ معلوم ہوا کہ آپ کی رائے شیخ صاحب کے مطالبے کے حق میں ہے۔ میں نے اسے منظور کر لیا۔ اب اس میں آپ کو تامل کیوں ہو؟ ان سے کہیے، جو کچھ وضع کرنا چاہتے ہیں، وضع کریں، جو کچھ بھیجنا چاہتے ہیں، بھیج دیں۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۵۶)

کلکتہ

۲۷ جنوری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

میں کبھی آپ کو اخبار کے مسائل و روش کی نسبت کچھ نہیں لکھتا، اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں، ہر شخص اپنے اخبار کی روش بہت سی مقامی اور ماحولی مصلحتوں کی بنا پر تجویز کرتا ہے اور جب تک وہ خود درخواستمند نہ ہو، کسی دوسرے کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ مگر بعض اوقات آپ فریقانہ مخالفت کے جوش میں اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ منطق و استدلال کی کوئی حد بندی باقی نہیں رہتی اور اس محبت کی وجہ سے جو آپ سے ہے، خیال ہوتا ہے کہ آپ کو ایسا تو نہیں کرنا چاہیے۔

اس وقت ڈاک آئی تو سب سے اوپر "انقلاب" تھا میں نے کھولا تو ایک نوٹ پر نظر پڑی " سرحدی کانگریسیوں کے ارادے" اس میں آپ لکھتے ہیں کسی نے ڈاکٹر خان سے پوچھا، ہندی، گورمکھی سرکلر کے لیے کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا" فوراً منسوخ کر دینگے"۔ اس سے اندازہ کر لینا چاہیے کہ سرحدی کانگریسیوں کی اسلام دشمنیوں کا کیا حال ہے؟

کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ اس معاملے کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت تصور کرتے ہیں، جو فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کے مقاصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلک معاملہ ہے اور جس سے بڑھ کر شاید ہی فتنہ پردازی کی کوئی بات موجودہ سیاسی دور میں ہوئی ہو! آپ لوگ اس بات پر تو بہت خوش ہو گئے کہ اس عقل فروش۔۔۔ ۔۔۔۔ نے وحدتِ زبان و رسم الخط کا راگ گا کر مٹھی بھر سکھوں کے گرل اسکولوں کی سرکاری اعانت بند کر دینی چاہی ہے، مگر اتنی واضح بات سامنے نہ آئی کہ اگر ٹھیک انھی دلائل کی بنا پر کل کو بہار، یوپی، مدراس، آسام اور بمبئی میں ہندو اکثریت نے ناگری رسم الخط کو سرکاری قرار دے دیا اور اردو رسم الخط والے اسکولوں کو سرکاری اعانت سے محروم کر دیا، تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟

اتنا ہی نہیں بلکہ اس فتنہ نے تو اقلیتوں کے حقوق کی ساری عمارت ہی درہم برہم کر دی۔ یہ اصل ہی باقی نہ رہی کہ ان امور کے فیصلے کا حق خود اقلیت کو ہے، نہ کہ اکثریت کو۔ بنگال کے ہندو اور مسلمان، دونوں اردو کے مخالف ہیں اور چاہتے ہیں، صوبے کی زبان ایک ہی ہو اور وہ بنگلہ ہو۔ اب پریسیڈنسی ڈویژن کی وہ لسانی اقلیت، جس کی زبان اردو ہے، کیا کریگی؟ کل کو اگر اس فتنہ پردازی کی مثال سامنے رکھ کر بنگال نے سرکلر جاری کر دیا کہ صرف انھیں اسکولوں کو

مدد دی جائیگی، جو بنگلہ زبان میں تعلیم دیں، تو اس وقت کلکتہ کے ہزاروں ہندو مسلمان کیا کرینگے، جو اپنے بچوں کو بنگلہ میں تعلیم دینا نہیں چاہتے؟

ایک لمحہ کے لیے اس غلط فہمی میں اپنے کو نہ ڈالیے کہ ہمارے نزدیک حقیقت و انصاف کیا ہے اور از روے دلائل و مصالح کیا ہونا چاہیے! ان امور میں سوال دلائل و منطق کا نہیں ہوتا۔ اگر دلائل سے جماعتی کشاکش کا فیصلہ ہو سکتا، تو دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو جاتے۔ سوال صرف یہ ہے کہ ایک صوبے کی ایک اقلیت صحیح بنیادوں پر یا غلط بنیادوں پر، اپنے بچوں کو کس رسم الخط کی تعلیم دینا چاہتی ہے، اس کو اس کا حق ہے یا نہیں؟ اور صوبے کی گورنمنٹ کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے یا نہیں؟ تیس برس سے مسلمان ہیٹ رہے تھے کہ اس کا حق اقلیت کو ہے نہ اکثریت کو اور اصل میں اس بارے میں یہ ہونی چاہیے کہ کوئی اکثریت جبراً اپنا فیصلہ دوسرے پر نافذ نہ کرے۔ متعصب ہندوؤں کو اس کے قبول کرنے میں تامّل تھا، لیکن بات اتنی صاف تھی کہ اسے علانیہ رد نہیں کر سکتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس اصل کی کاٹ کے لیے کوئی ہتھیار مل جائے لیکن ہتھیار ملتا نہیں تھا۔ اب صوبۂ سرحد نے یہ سرکلر جاری کر کے انھیں بنا بنایا ہتھیار پکڑا دیا۔ پہلے انھوں نے تھوڑا بہت شور مچایا تاکہ محبت قائم ہو جائے، پھر خاموش ہو گئے۔ اب بہار وغیرہ میں گورنمنٹیں بننے دیجیے، دیکھ لیجیے گا کہ اس ہتھیار کو کیونکر استعمال کیا جاتا ہے! اس وقت آپ لوگوں کو پتہ چلیگا کہ اس سرکلر کی حمایت میں شور مچا کر آپ لوگوں نے اردو کی کیسی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک دقت یہ پیش آگئی تھی کہ کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی ویسی عظیم اکثریت ہو جیسی ملک کے اکثر صوبوں کے لیے مثال قائم کر سکیں۔ وہ اکثریت و اقلیت کے مسئلے میں جو کچھ کر سکتے تھے، بحث و منطق تھی

عملی اقدام کی کوئی قوت نہیں رکھتے تھے۔ اب حسنِ اتفاق سے دو صوبے ایسے نکل آئے جہاں وہ بہار اور یوپی کی ہندو اکثریت کے درجہ کی مسلم اکثریت رکھتے ہیں؛ سرحد اور سندھ۔ اور اس طرح انھیں موقع مل گیا کہ یہاں اپنے طرزِ عمل کی ایسی مثالیں قائم کر دیں، جو تمام صوبوں کے مسلمانوں کے لیے عملی دلیل و حجت کا کام دے سکیں۔ لیکن صوبۂ سرحد نے سب سے پہلی مثال جو قائم کرنی چاہی، وہ یہ کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے مطالبات کا معاملہ درہم برہم کر دیا اور اردو کی مخالفت میں جو کام اُردو کے سخت سے سخت مخالف صوبے بھی نہیں کر سکتے تھے، وہ اس اسلامی صوبے نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ انجام دے دیا۔ سب سے زیادہ رنج و قلق کی بات جو سامنے آتی ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام اخبارات نے بلا استثنا اس کی حمایت کی اور پنجاب کی تمام اردو پرست انجمنوں نے تجویزیں پاس کر دیں۔ کسی نے بھی غور کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ فی الحقیقت اُردو کی حمایت ہو رہی ہے یا اس کی تباہی کا سب سے بڑا دروازہ کھولا جا رہا ہے؟

ص ۵۲

قرآن جابجا اسماء اور ان کی پرستش کا ذکر کرتا ہے: اسماءٌ سمّیتموھا انتم وآباءکم ٹھیک یہی حال مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ چند اسماء و اعلام ہیں اور جونہی کسی کی زبان سے نکل جائیں، فوراً ان کی حمایت میں کھنچنے لگنا چاہیے۔ باقی رہا حقیقت کا سوال تو یہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ اسلام، حقوق، مسجد، اُردو، گائے اور اس طرح کا کوئی لفظ زبان سے نکل جانا چاہیے، پھر ہر مسلمان کے لیے بلا کسی شرط کے ضروری ہے کہ اس کی تائید کرے۔ اگرچہ یہ تائید اسلام اور مسلمانوں کے مقاصد و مصالح کی قطعاً نفی ہی کیوں نہ ہو۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ مولانا عبداللہ گاندھی کو ۔۔۔ کر مسلمانوں نے اسلام کی وہ توہین و تذلیل کرنی چاہی (کرنی چاہی کیونکہ الحمدللہ کسی کے کیے سے اس کی تذلیل ہو نہیں جا سکتی) کہ شاید ہی اس کی کوئی مثال اس

پورے دورِ غفلت و مذلت میں بھی مل سکے۔ غریب گاندھی نے ایک ایسے مقام میں آکر، جہاں دنیا کا کوئی رشتہ بھی اظہارِ حقیقت سے مانع نہیں ہو سکتا، صورتِ حال کا اعلان کیا، تو اس پر اس کی ہنسی اڑائی گئی۔ لیکن مسلمان اخبار نویسوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جو دبی زبان ہی سے مگر مسلمانوں کو اس غیر اسلامی خفیف الحرکتی سے روکتا، جو انھوں نے ایک بہروپیے نومسلم کو خرید کر کرنا شروع کر دی تھی۔

سرحد کے اس سرکلر کا معاملہ جب پہلے پہل اخباروں میں آیا، تو میں نے خیال کیا، اس میں کوئی غلط فہمی کام کر رہی ہے، کیونکہ خود مسلمانوں کے فرقے وارانہ نقطۂ خیال سے یہ بات اس درجہ غلط اور مہلک تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا، صاحبزادہ عبدالقیوم[۵۴] اور ان کے مشیروں نے ایسا کیا ہوگا۔ لیکن جب میں نے ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا، واقعی یہی بات ہے۔ اس پر میں نے بسترِ علالت سے بارہ صفحوں کا خط لکھ کر انھیں بھیجا اور پوری تفصیل کے ساتھ واضح کر دیا کہ یہ کارروائی کس درجہ مضر ہوگی۔ چونکہ ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اس لیے خاموش ہو کر رہ گئے۔ اب معلوم ہوا ہے سرے سے اردو ہی کو اڑا دینا چاہتے ہیں اور پشتو کے مناقب و فضائل وردِ زبان ہیں۔

بہار میں سالہا سال سے کوشش کی جا رہی ہے کہ ناگری رسم الخط کے سوا اور کسی خط کا اعتراف نہ کیا جائے۔ دو بار اقدام ہو چکا ہے اور محض کانگریس کی مداخلت سے رکا ہے۔ اب صوبۂ سرحد کی اس حماقت نے از سرِ نو دروازہ کھول دیا۔ چند دنوں کے بعد دیکھ لیجیے گا، وہی زبان، وہی دلیل، وہی منطق کام میں لائی جائیگی، جس پر تمام مسلمانوں کی تائید و توثیق کی مہر لگ چکی ہے۔

اگر فی الحقیقت ڈاکٹر خان یا وہاں کی کوئی جماعت ایسا کر سکی ہے کہ اس فتنہ انگیز سرکلر کو منسوخ کر دے، تو عزیزِ من! یہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی نہیں ہوگی

بلکہ ایک نہایت ضروری خدمت ہوگی، جو سرحد کی کوئی جماعت انجام دے سکتی ہے۔
یقیناً آپ لوگوں نے اس کی حمایت یہی سمجھ کر کی ہے کہ اُردو اور مسلمانوں کے مقاصد
کی حمایت کر رہے ہیں۔ لیکن کیا معاملہ کا یہ پہلو قابلِ غور نہیں ہے کہ حمایت کا ولولہ
کس طرح ہم سے تخریب و مخالفت کا کام کرا رہا ہے! اگر مسلمانوں کی رائے عامّہ
اس سانچے میں ڈھالی جائیگی تو اس کا نتیجہ کیا نکلیگا؟ کس طرح لوگ خود اپنے
ہاتھوں سے اپنا مستقبل خطرہ میں ڈالنے لگینگے! افسوس کہ ڈال رہے ہیں، ہر گوشے
اور ہر میدان میں!

اُمید ہے خلافِ معمول، میری یہ دراز نفسی آپ پر شاق نہیں گزریگی۔ اگر آپ کی
محبت متقاضی نہ ہوتی، تو کبھی یہ قصّہ نہ چھیڑتا۔ مقصود یہ نہیں ہے کہ کسی خاص
مسلک یا گروہ کی حمایت کی جائے یا مخالفت کی جائے۔ صرف اس حقیقت پر توجہ دلانا چاہتا
ہوں کہ ہر مسئلے کو خود اس مسئلے میں دیکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ حزبی مخالفت
کی راہ میں بہتے جائیں اور جو چیز سامنے آئے، اُسے بہاتے ہوئے لے جائیں:

گر مشتِ خاکِ ما ہم بر باد رفتہ باشد[۵۸]

غالباً "دراسات اللبیب" دلی میں بھی نہیں ہے۔

شیخ مبارک علی صاحب کے حساب کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے خط مل گیا ہوگا۔

"غالب" کے لیے انشاء اللہ ضرور وقت نکالونگا۔ جس وقت مطالعہ کیا، اگر اسی وقت
لکھنا جاتا، تو پورا مواد قلم بند ہو جاتا۔ اُس وقت خیال نہیں کیا۔ بہر حال کوئی نہ
کوئی وقت نکال کر ضرور یہ کام انجام دے دونگا۔

مولوی رجب علی کی خود نوشتہ سوانحعمری کی نقل اگر دینا نہیں چاہتے تو کم از کم
ان کی ملازمت و مشغولیت کے ضروری حالات ہی ملخص کر کے دے دیں۔ یعنی جو حالات
ظاہر نہیں کرنا چاہتے، چھوڑ دیں، باقی قلمبند کرا کے دے دیں۔ اگر ممکن ہو، تو

اس کی کوشش کیجیے۔ جو صاحب قلمبند کریںگے، وہ اگر چاہیں، تو نقل و کتابت کے مصارف لے لیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۵۷)

کلکتہ

۶ فروری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ اس بات سے طبیعت کو نہایت خوشی ہوئی کہ آپ نے اُردو سرکلر کی اصل نوعیت محسوس کرلی۔ حق پسند طبائع کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔ جب اصل مقصود اُردو کی حمایت ہے نہ کہ مخالفت، تو کیوں ایسے معاملات کی تائید کی جائے، جس نے اُردو کے خلاف ایک نہایت سخت خطرے کا دروازہ کھول دیا ہے! اس سے کیا فائدہ کہ سرحد کے دو چار ہزار سکھوں، یا پندرہ بیس ہزار ہندوؤں کے اسکولوں کی اعانت روک دی گئی، جہاں گورمکھی یا ناگری رسم الخط کی تعلیم ہوتی تھی، جب کہ تمام ہندوستان کے طول و عرض میں کروڑوں مسلمانوں کے اسکولوں کی اعانت رُک جاسکتی ہے، جہاں اُردو کی تعلیم دی جا رہی ہے اور جن کا مستقبل اس پر موقوف ہے کہ مزید اعانت کا سروسامان ہو!

اگر سرحد کے سکھوں کو یہ اعانت نہ ملی، تو ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا، کیونکہ ان کے لکھنے پڑھنے کی زبان قطعاً اُردو ہے اور وہ محض اپنے مذہبی علاقے کی وجہ سے اپنی لڑکیوں کو گورمکھی سے آشنا رکھنا چاہتے ہیں۔ علاوہ بریں خوشحال ہیں۔ اگر سرکاری اعانت نہیں ملیگی جب بھی اسکول جاری رکھینگے۔ اگر بنگال، بہار، یوپی

بمبئی، سی پی، مدراس، آسام اور کٹک میں تو لاکھوں مسلمان ہیں، جن کے لکھنے پڑھنے کی زبان ہی اُردو ہے اور جن کی اقتصادی حالت اس درجہ گری ہوئی ہے کہ بغیر سرکاری اعانت کے ایک اسکول بھی نہیں چلا سکتے۔

صاحبزادہ عبدالقیوم نے لکھا تھا کہ چالیس ہزار روپیہ سالانہ اس میں خرچ ہو جاتا تھا، جواب بچ جائیگا۔ خیال کیجیے کیا اچھا سودا چکایا گیا ہے! محض اس لیے کہ چالیس ہزار روپیہ سرحد میں بچ جائے، یہ صورتِ حال گوارا کر لی گئی کہ لاکھوں روپیہ جو لاکھوں انسانوں کے لیے تمام ملک میں خرچ ہو رہا ہے یک قلم بند کر دیا جائے!۔

یہ سرکلر جاری کیا جاتا، یا نہ کیا جاتا، لیکن اُردو رسم الخط سرحد کا تعلیمی اور سرکاری رسم الخط ہے، اس حقیقت کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ پس اس سرکلر نے سرحد میں تو اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، لیکن تمام ہندوستان میں اس کے لیے عالمگیر فتنہ پیدا کر دیا۔

سخت اندیشہ ہے کہ تمام صوبے یہ ہتھیار اُردو کے خلاف کام میں لائینگے۔ صرف اُردو ہی کے معاملہ میں نہیں، بلکہ اقلیت اور اکثریت کے تمام معاملوں میں، کیونکہ اس فتنہ نے ساری بنیاد ہی اُلٹ دی ہے۔ اُس وقت اگر مسلمانوں نے احتجاج کیا تو یہ احتجاج سودمند نہ ہوگا کیونکہ سرحد کے طرزِ عمل کی عام طور پر تحسین و تائید کی جا چکی ہے۔ پس جس قدر جلد ممکن ہو، اس فتنہ کا سدِ باب کرنا چاہیے۔ میں نے کوشش کی تھی کہ بروقت انسداد ہو جائے اور ہندو سکھ ایجی ٹیشن نے اس کا بہتر موقعہ بہم پہنچا دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ صاحبزادہ عبدالقیوم پریشان حال ہو کر رہ گئے[1]

ابوالکلام

---

[1] دونوں مکتوب اتنے واضح ہیں کہ میرے لیے اصل معاملے کے متعلق بطورِ توضیح کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۵۸)

کلکتہ

۲۶ فروری ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، اس سعی و فکر کے لیے شکر گزار ہوں مگر اب دراسات کی ضرورت نہ رہی۔
امرتسر سے ایک نسخہ مل گیا تھا اور کام نکل گیا۔
بنگال کا حال وہ نہیں جو آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی راہ میں ساری دشواری ۔۔۔[1] کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے پیدا ہوئی ورنہ ایک طاقتور پارٹی بن سکتی تھی اور پوری طرح کامیاب ہو سکتی تھی۔

ابوالکلام

(۵۹)

کلکتہ

۲۴ مئی ۱۹۳۷ء

عزیزی،

میں ایک دن الٰہ آباد میں اور ٹھہر گیا تھا۔ پھر طبعیت کو کسی قدر سکون ہو گیا اور کلکتہ چلا آیا۔ اب یہاں وہ تار ملے، جو میری روانگی کے بعد الٰہ آباد پہنچے تھے۔ ان میں آپ کا[2] تار بھی نکلا۔ اس پرسش کے لیے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے۔

---

[1] ایک مشہور مسلمان لیڈر، نام میں نے حذف کر دینا مناسب سمجھا۔

[2] مولانا کی علالت کی خبر ملی تھی اور میں نے مزاج پرسی کے لیے تار دیا تھا۔

مبارک علی صاحب نے اب تک حساب نہیں بھیجا۔

میں پچھلے دنوں دہلی میں ایک ہفتہ تک ٹھہرا۔ اطراف کے اکثر احباب ملنے کے لیے آ گئے۔ اگر آپ بھی آجاتے اور کتاب ساتھ لے آتے تو شاید ایک ہی نشست میں کام انجام پا جاتا۔[1] مجھے لکھنے میں تکلیف ہوتی ہے، لیکن مخاطب موجود ہو، تو بولنے میں سارا کام ہو جاتا ہے۔ ایک صاحب کئی سال سے خط و کتابت کر رہے تھے کہ بخاری کے بعض ابواب کے تراجم کا معاملہ صاف کریں، مگر مجھے مہلتِ تحریر نہیں ملتی تھی۔ وہ دہلی آ گئے اور اسی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے لگے، جو آصف علی صاحب کے مکان کے پاس ہے اور جہاں میں جانے لگا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی صبح نے ان کا سارا کام پورا کر دیا۔

بہرحال اب آپ یوں کیجیے کہ کتاب کا ایک نسخہ سادہ اوراق کے ساتھ بنوالیں۔ یعنی ہر دو ورق کے درمیان ایک سادہ کاغذ رکھ دیا جائے۔ اس طرح کا نسخہ اگر آ گیا تو میں انشاء اللہ چند دنوں کے اندر واپس کر دونگا اور آپ کا مقصود پوری طرح حاصل ہو جائیگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

ہاں یہ آپ کے ...... [2] نے تو حد کر دی ہیں نے تیس سال کی پبلک لائف میں بیشمار دروغ بافیاں دیکھی ہیں، خصوصاً کانگریس کی مخالفت کے سلسلے میں، لیکن جھوٹ بولنے کی ایسی بیباکانہ جرأت، جیسی اس شخص نے دکھائی ہے، شاید ہی کسی نے

---

[1] یہ غالبؔ کا ذکر ہے کتاب سادہ اوراق لگوا کر مولانا کے بھیج دی تھی اور تین برس ان کے پاس رہی۔ [2] پنجاب کا ایک مشہور لیڈر، جو مدت ہوئی فوت ہو چکا ہے۔ میں نے نام دانستہ حذف کر دیا۔

دکھائی ہے، شاید ہی کسی نے دکھائی ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات ایک خاص حد تک یا ایک خاص شکل میں کی جاتی ہے اور مخالف اس کا سراغ پاکر اسے بہت بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے لگتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ ایک سراپا کذب خالص و مجت خود اپنے جی سے گڑھا جائے اور اسے پوری ڈھٹائی کے ساتھ کسی پارٹی کا ذمہ دار عہدہ دار اخبارات میں شائع کرے، ایک ایسی صورت حال ہے، جس کے بعد اخلاص شرافت میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔

میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوں۔ یہ شخص کہتا ہے کہ ورکنگ کمیٹی نے پنجاب کے مسلمانوں میں کام کرنے کے لیے ڈھائی لاکھ کی رقم منظور کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پنجاب کے لیے کسی رقم کا نکلنا ایک طرف رہا، دو سال سے ورکنگ کمیٹی کے جلسے میں پنجاب کا نام تک نہیں آیا۔ اب بتلائیے ایسی حالت میں میرے دل پر جو اثر پڑ سکتا ہے، وہ کیا ہوگا؟ کیا ایک لمحے کے لیے میں ایسے لوگوں کے لیے کوئی حسن ظن رکھ سکتا ہوں؟ پچھلی ورکنگ کمیٹی کے موقع پر صوبوں کے پارٹی لیڈر بھی بلا لیے گئے تھے۔ اور انھیں بھی شرکت کا موقعہ دیا گیا تھا۔ لاہور سے ڈاکٹر گوپی چند آئے تھے۔ انھیں بھی شرکت کا موقعہ ملتا رہا۔ اب غور کیجیے کم از کم ان تمام لوگوں کے دلوں پر کیا اثر پڑا ہوگا؟ وہ اپنے جی میں کیا کہتے ہونگے! یقیناً یہی کہتے ہونگے کہ ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولنے میں ذرا بھی عار نہیں۔

پھر جھوٹ بھی گڑھا تو کتنا بے معنی، جس پر کانگریس کا ہر آدمی ہنس رہا ہے۔ اوّل تو ڈھائی لاکھ روپیہ اور پھر وہ بھی ان صوبوں کے لیے نہیں، جہاں کانگرس کو اکثریت ملی ہے اور جہاں آیندہ بھی الیکشن پیش آسکتا ہے، بلکہ پنجاب شریف کے لیے جہاں نہ تو کانگرس کی اکثریت ہے اور نہ کوئی امکان ہے

کہ اکثریت ہو، اور پھر جیسے بنگال اور سندھ کے ساتھ گزشتہ سال میں خود کانگرس پارلیمنٹری بورڈ کے دائرۂ جدّوجہد سے یک قلم خارج کر چکا ہوں۔

اور پھر یہ رقم کن حضرات کے ذریعہ بانٹی جائیگی؟ ڈاکٹر عالم[۵] کے ذریعہ! ڈاکٹر عالم تو رو رہا ہے کہ کانگرس میں مجھے کوئی پوچھتا نہیں اور یہ ڈھائی لاکھ کی تھیلی اس کے حوالے کر رہے ہیں، پھر لطف یہ کہ "مولانا ابوالکلام پنجاب کا دورہ کرینگے"، گویا مولانا ابوالکلام کو دین و دنیا کا کوئی کام باقی نہیں رہا، بجز اس کے کہ پنجاب کا دورہ کریں اور وہ بھی اس لیے کہ وہاں کے ایمان فروشوں میں ڈھائی لاکھ کی خیرات تقسیم کر دی جائے!

اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا، جو اُس وقت تھا جب "الہلال" نکلتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب ہے کہ نہیں معلوم کسی عالم بیان میں میرے قلم سے کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے[۵]۔ لیکن اب میرا حال دوسرا ہے۔ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو، میں یقین کے ساتھ اسے پبلک میں بُرا کہنا پسند نہیں کرتا۔ ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس اپنے سامنے آجاتا ہے میں چونک اُٹھتا ہوں کہ اگر بُرا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو بُرا کیوں نہ کہوں! اس سے زیادہ بُرائی اور کس میں ہو گی؟ بہادر شاہ کا ایک سیدھا سادا شعر ہے، جس میں شعریت کی کوئی بات نہیں، لیکن میرے دل پر نقش ہو گیا ہے:

نہ تھی اپنی بُرائی پہ جب کہ نظر تو نظر میں بُرا تھا ہر ایک بشر
پڑی اپنی برائی پہ جب نظر، تو نظر میں کوئی بھی بُرا نہ رہا

---

[۵] یقیناً "الہلال" کے ابتدائی دَور میں مولانا کی طبیعت بہت جلالی تھی۔ پھر اتنی بدلی کہ اس پر حیرت ہوتی تھی۔

(۶۰)

کلکتہ

۲۹ مئی ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ آپ کا تار مجھے الہ آباد میں نہیں ملا تھا، کیونکہ روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن بعد کو مل گیا تھا۔ میں ایک خط لکھ چکا ہوں، غالباً اب پہنچ گیا ہوگا۔ میری طبیعت اب اچھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اخلاص و محبت کے لیے جزاءِ خیر دے۔ شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں[۱]۔

پچھلے خط میں، میں نے آپ کی کتاب کے لیے بھی ایک بات لکھی ہے، بنوا کر بھیج دیجیے۔ انشاء اللہ ضروری باتیں قلم بند ہو جائینگی۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۶۱)

کلکتہ

۱۷ جون ۱۹۳۷ء

عزیزی،

آپ کا خط مل گیا تھا لیکن بخار اور نزلہ کی شدت نے جواب کی مہلت نہ دی اب کل

[۱] تار کا جواب نہ ملا، تو میں نے کلکتہ خط لکھا۔ یہ اس کا جواب ہے۔ مولانا کا گرامی نامہ میرے خط لکھنے سے دوسرے یا تیسرے دن مل گیا تھا۔

سے افاقہ ہے۔
کتاب بھی پہنچ گئی۔ انشاء اللہ جلد از جلد ضروری اشارات قلم بند کر کے واپس بھیج دونگا۔
آپ نے ۔۔۔ [1] کے معاملے میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے اس خیال کی پوری پوری تصدیق ہو گئی ہے کہ آپ لوگ کانگرس کے اندرونی حالات سے کس درجہ ناواقف ہیں اور کس طرح ایک بالکل متضاد تصوّرات کی دنیا میں کام کر رہے ہیں۔
آپ لکھتے ہیں۔۔ [2] کا ذریعۂ علم معلوم نہیں۔ لیکن سب سے پہلے یہ بات مولوی ظفر علی صاحب نے کہی تھی۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ چونکہ مولوی ظفر علی صاحب نے بات سُنائی تھی، اس لیے روایت کی سند زیادہ قوی ہو گئی! اس سے بھی زیادہ ناقابلِ فہم اس واقعہ سے استدلال ہے کہ سید۔۔۔۔ نے حصولِ زر کی کوشش کی تھی۔ سید پر کیا موقوف ہے، نہیں معلوم یہ کہانی سُن کر کتنوں کے منھ میں پانی بھر آیا ہوگا۔ میں صرف لاہور کے چھ سات خط دیکھ چکا ہوں، جو اس کہانی کی اشاعت کے بعد الہ آباد بھیجے گئے ہیں۔ پھر اس سے یہ کہاں ثابت ہو گیا کہ کہانی کی کوئی اصلیت ہے! میرے دل کا اصلی داغ تو یہی ہے کہ اس طرح کی دروغ بافیوں کا لوگوں پر بالکل اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ وہ منغض نہیں ہوتے، بلکہ خوش ہوتے ہیں کہ کھانے پینے کی ایک نئی راہ نکل آئی۔
آپ نے میرے بیان کی صداقت کا تحفظ کرتے ہوئے جو وجہ تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں [3]، لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ آپ لکھتے ہیں،

[1] وہی پنجابی لیڈر جس کے بیان کا ذکر زیر بحث ہے، جس نے ذرائع معلومات بیان کیے تھے۔ [2] ایضاً [3] میں نے عرض کیا تھا کہ ممکن ہے روپے دینے والا ادارہ کانگرس ورکنگ کمیٹی سے بالکل الگ ہو اور آپ کو ان واقعات کا علم نہ ہو۔

غالباً ان معاملات کے لیے کانگرس کا کوئی علیحدہ اور پوشیدہ صیغہ ہے جس کا مجھے علم نہیں۔ عزیزِ من! کیا آپ سمجھتے ہیں، میں ایک لمحہ کے لیے کسی ایسے ادارہ میں رہنے کا ننگ گوارا کر سکتا ہوں، جس کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی میرے علم سے باہر ہو؟ صرف یہی ایک بات اس کے لیے کافی ہے کہ آپ لوگ کس درجہ ناواقفیت اور غلط اندیشی کے تصوّرات میں غور و خوض کرتے رہتے ہیں۔

آپ نے ڈاکٹر ..... کے اخبار نکالنے کا واقعہ لکھا ہے، حال آنکہ اس سے کانگرس کا کوئی تعلّق نہیں۔ اصلیت بالکل دوسری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پنڈت موتی لال نہرو[۵۸] سے درخواست کی تھی کہ روپیہ کا انتظام ہو، تو وہ ایک اخبار نکالیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پہلے لیت و لعل کا طریقہ اختیار کیا، پھر انکار کر دیا۔ اس معاملہ کا ذکر دہلی میں خود ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کیا تھا اور میں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اس سعی سے باز آئیں کیونکہ اوّل دن سے میرا یہ یقین رہا ہے کہ اس طرح کے اخبارات نکالنے سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکتا اور اصولاً یہ چیز بالکل غلط ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی جماعت کی جانب سے اخبار نکالے اور علانیہ اُسے جماعت کی طرف منسوب کرے، تو ہرگز قابلِ اعتراض نہیں، لیکن پوشیدہ اعانت لے کر نکالنا اور بصورتِ اعتراض اس سے تبرّی کرنا کسی طرح بھی اصولاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت تو خاموش رہ گئے۔ لیکن بعد کو انھوں نے پنڈت مدن موہن مالویا[۵۹] سے ذکر کیا اور مجھے ایک صاحب سے جو کچھ عرصہ بعد کلکتہ آئے تھے معلوم ہوا کہ کچھ روپیہ دیا گیا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد اخبار نکلا اور میں سمجھ گیا کہ اسی رقم سے نکلا ہوگا۔ بس نہ تو کانگرس کا اس سے کوئی تعلّق تھا، نہ کانگرس سے وابستہ شخص کا، نہ اُس کمیٹی کا جو عارضی طور پر نہرو رپورٹ کے لیے بنی تھی۔ محض ذاتی طور پر پنڈت مالویا نے کسی سے انتظام کرا کے رقم دے دی تھی۔

آپ لکھتے ہیں کہ کئی شخصوں کی نسبت آپ کو معلوم ہے کہ وہ کانگریس میں کام کرتے تھے اور انہیں تنخواہ ملتی تھی۔ لیکن اس سے کسے انکار ہے؟ جو آدمی کام کرینگے، وہ اگر محتاج ہیں، تو کیوں قابلِ اعتراض ہو؟ ساری بحث تو اس میں ہے کہ کیا مسلمانوں کی رائے خریدنے کے لیے کانگرس فنڈ سے کوئی پوشیدہ رقم خرچ کی گئی ہے؟

ایک اور بات بھی یاد رکھیے۔ کانگرس ایک بہت بڑا نظام ہے، تمام صوبوں، ضلعوں دیہاتوں میں پھیلا ہوا۔ ہزاروں آدمی ہر سال اس میں منتخب ہوتے ہیں اور لاکھوں ممبر بنتے ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر صوبے اور مقام پر کانگرس کے عہدہ دار جو کچھ کرتے رہتے ہیں، وہ ٹھیک ٹھیک کانگرس کے مرکزی نظام و اصول کے مطابق ہوتا ہے۔ میرے علم میں خود ایک دو واقعات تحریکات کے زمانے میں آئے کہ بعض مقامات میں مسلمان والنیٹر بھرتی کرنے کے لیے علیحدہ انتظامات کیے گئے تھے اور کوئی رقم علیحدہ خرچ کی جاتی تھی۔ بہ مجردِ علم میں نے انھیں سختی سے روک دیا اور ایک مقام کے لیے تحقیقات کی کمیٹی بھی بنادی۔ بہت ممکن ہے کسی مقام پر کوئی چھوٹی موٹی رقم کسی نے اس لیے خرچ کردی ہو کہ چند مسلمانوں کو ساتھ لے لیں، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کانگرس کا مرکزی نظام کوئی اس طرح کا مصرف جائز رکھتا ہے یا نہیں؟ اور اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ایسی رقم منظور کی ہے یا نہیں؟ میرا جواب ہے نہیں اور الحمدللہ، کذب و دروغ بافی میرا اشعار نہیں۔

آپ نے پنجاب کانگرس کمیٹی کا ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کئی سال سے پنجاب میں کانگرس کا کوئی حقیقی حلقہ ہے ہی نہیں۔ یہی حال بنگال کا ہے۔ چند در چند وجوہ سے آج تک دونوں کی درستگی نہیں ہوسکی، لیکن اس طرح کے نقائص ایک وسیع اور جمہوری ادارے میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ آپ لوگوں کا یہ حال ہے کہ "رہزناپ" سے

لے کر ستیہ پال اور گوپی چند تک، ہر چیز سرتاسر کانگرس ہے!
آپ لکھتے ہیں پنجاب کے کانگریسی، مسلمانوں کے انتخاب کے بارے میں غلطیاں کرتے ہیں، لیکن پنجاب میں کانگرسی مسلمان ہے کون؟ اور کانگرس کا مرکزی نظام اس کے سوا کیا کر سکتا ہے، جو کرتا رہا ہے؟ ڈاکٹر عالم ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنائے گئے تھے، بعد کو علیحدہ کر دیے گئے۔ اس سے زیادہ کانگرس کیا کر سکتی تھی؟ پھر اچانک شہید گنج سے اڑ کر وہ کانگرس میں پہنچ گئے۔ اب کانگرس کیا کرتی؟ کیا ایک اعلان نکالتی کہ وہ کانگرس کے ممبر نہیں بن سکتے؟ ہاں یہ ضروری تھا کہ اس طرح کے طرزِ عمل کی جرأت افزائی نہ کی جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور اندرونی حالات آپ کو معلوم نہیں۔

آپ لکھتے ہیں "کانگرس سے آپ کی وابستگی کی کوئی شق سمجھ میں نہیں آتی لیکن میں سمجھتا ہوں کوئی نہ کوئی بات ہوگی، جو میری سمجھ میں نہیں آتی"۔ عزیزمن! اگر آپ کو عقائد و افکار کی اُس دنیا سے، جس میں، میں تیس سال سے زندگی بسر کر رہا ہوں، اس درجہ بُعد ہو گیا ہے کہ آپ میرے کانگرس میں ہونے کی کوئی وجہ نہیں محسوس کر سکتے، تو میرے لیے ناممکن ہے کہ کوئی وجہ آپ کو بتلا سکوں۔

اے بے خبر ز لذتِ شُربِ مدام ما

مجھے معلوم نہیں آپ میرے خطوط رکھتے ہیں یا ضائع ہو جاتے ہیں۔ بہر حال یہ خط کہیں سنبھال کر رکھ دیجیے۔ میری زندگی کا بڑا حصہ گزر چکا، جو باقی ہے وہ بہت کم ہے۔ ممکن ہے کہ میں اُس وقت تک نہ رہوں، لیکن یہ سطور باقی رہ سکتی ہیں۔ ایک وقت عنقریب آئیگا اور "میری وابستگی" کی علّت آشکار کر دیگا۔[۱]

---

[۱] مولانا آج اس دنیا میں نہیں، خدا کا شکر ہے کہ یہ سطریں محفوظ رہ گئیں۔

مولوی ظفر علی صاحب کو میں نے خط اس لیے لکھا تھا کہ مجھے شبہہ ہوا، ڈاکٹر ستیہ پال[61] نے جو کچھ مجھ سے کہا ہے صحیح ہے یا غلط[1]۔ انھوں نے جب مجھ سے اس معاملہ کا ذکر کیا، تو میں نے سخت سرزنش کی کہ ان بائی الکشنوں میں دلچسپی لینے اور معرکہ آرائی کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ مولوی ظفر علی اگر چلے گئے تو کونسی قیامت ٹوٹ پڑیگی؟۔ عبدالعزیز[62] چلے گئے تو کونسی جیت ہو جائیگی؟ پہلے "علامہ"[63] گا با گئے تھے تو کونسا انقلاب رونما ہو گیا تھا؟ علاوہ بریں کسی ایک انتخاب کی کامیابی و ناکامی سے صورتِ حال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر اگر ایسا ہی تھا، خود ظفر علی خان صاحب سے کیوں نہیں کہا گیا کہ وہ کانگرس کا ٹکٹ منظور کریں! اس پر انھوں نے کہا کہ وہ انھیں یہ بات کہہ چکے ہیں لیکن وہ منظور نہیں کرتے۔ بہرحال میں نے اس معاملہ میں دلچسپی لینے سے انکار کر دیا اور وہ چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد دوسرے دن مجھے خیال ہوا کہ معلوم نہیں ان کا بیان صحیح تھا یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دولتمند امیدوار کو کھڑا کر کے ہنگامہ آرائی کرانا مقصود ہو، اور مولوی ظفر علی صاحب کو موقعہ نہ دیا گیا ہو بہتر ہے کہ میں براہِ راست اس بارے میں انھیں لکھ دوں۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب کو خط لکھا تھا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

---

[1] مولانا ظفر علی خان مرحوم مرکزی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں امیدوار بنے تھے اور میاں عبدالعزیز (جن کا انتقال جوانی ہی میں ہو گیا) مولانا کے مقابلے پر تھے۔ کانگرس میاں عبدالعزیز کی حامی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس قسم کی کشمکش پیدا کر کے کانگرس مسلمانوں میں ہر دل عزیز نہیں ہو سکتی۔

(۶۲)

برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ

۱۳ جولائی ۱۹۳۷ء

عزیزی،

کلکتہ میں ڈاک دیکھ لی تھی۔ لیکن جواب لکھنے کی مہلت نہیں ملی، کیونکہ اسی دن لکھنؤ کے لیے روانہ ہو جانا پڑا۔ آپ کی کتاب سفر میں رکھ لی تھی اور اب بھی ساتھ ہے۔ جب کبھی مہلت ملتی ہے، نظر ڈال لیتا ہوں، اور کچھ نہ کچھ لکھ بھی دیتا ہوں۔ اُمید ہے اب تکمیلِ نظر میں زیادہ تاخیر نہ ہو۔

"ترجمان القرآن" جلد سوم منشی عبدالقیوم لکھ رہے ہیں، جنھوں نے جلد دوم لکھی ہے۔ طباعت کے لیے کوئی خاص صورت سامنے نہیں آئی۔ ویسے "مدینہ پریس" ہی کا خیال تھا، الّا یہ کہ آپ کوئی دوسری صورت تجویز کریں[1]

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۶۳)

۱۹، اے بالی گنج، سرکلر روڈ، کلکتہ

۹ اگست ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ بغیر اس کے کہ مجھے علم ہو، میں نے بنّوں کانفرنس کی صدارت بھی منظور

[1] میں نے بعض صورتیں تجویز کی تھیں، لیکن مولانا کی سیاسی مصروفیتیں انھیں کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ہی نہیں دیتی تھیں۔

کر لی۔ اور اس سلسلے میں پنجاب کا دورہ بھی محقق ہو گیا۔ کیونکہ بنّوں جانے کے لیے دہلی، انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، لاہور، وزیر آباد، راولپنڈی، کیمبل پور وغیرہ سے گزرنا ناگزیر ہے، اس لیے ان مقامات سے اقامت و پذیرائی کے دعوت نامے بھی آ گئے۔ اتاریں یہ نہیں پوچھا جاتا کہ میں بنّوں جاتا بھی ہوں یا نہیں۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کس تاریخ کو وہاں سے گزروں گا؟ کہیے اس کا کیا جواب دوں؟

ہندوستان میں ذمّہ داری کا احساس ویسے بھی معدوم ہے، لیکن دو معاملے تو قطعاً مستثنیٰ سمجھ لیے گئے ہیں: الکشن اور کانفرنس۔ جب کبھی کوئی کانفرنس منعقد کرنی چاہتا ہے، تو اس کی ضرورت بالکل محسوس نہیں کرتا کہ مجوزہ شرکاء کی منظوری حاصل کر لی جائے۔ صرف یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ گرم بازاری کے لیے کن کن ناموں کا اعلان کر دینا ضروری ہے اور پھر بلا تامّل ایک مکمل فہرست شائع کر دی جاتی ہے۔ میں تو اس صورتِ حال سے اس درجہ عاجز آ گیا ہوں کہ کئی بار ارادہ کیا، اعلان کر دوں، جب کسی کانفرنس میں میری شرکت یا صدارت کا اعلان اخباروں میں نظر آئے، تو سمجھ لیا جائے قطعاً بے اصل ہے۔ جس طرح فقہا کہتے ہیں: اصل اباحت ہے، اِلّا یہ کہ حرمت ثابت ہو جائے۔ اسی طرح اس بارے میں اصل عدمِ شرکت ہے، اِلّا یہ کہ شرکت کے لیے کوئی نصِّ ظاہر و قطعی الدّلالہ ثابت ہو جائے!

مجھے اس کانفرنس کا حال کچھ معلوم نہ تھا۔ کلکتہ پہنچ کر ڈاک دیکھی تو ایک خط ملا، پھر تار آیا۔ میں نے لکھ دیا کہ بحالتِ موجودہ میری شرکت تقریباً ناممکن ہے۔ میں کسی طرح بھی اس سفر کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن بہر حال آپ کی دعوتِ محبّت کا شکر گزار ہوں۔ مجھے فرض کر لینے دیجیے کہ بنّوں جاتے ہوئے لاہور سے گزرا اور ایک دن کے لیے رُک گیا۔ آپ کو میری

"رسمی قیام" کا جو اندیشہ تھا، وہ پیش نہ آیا۔ میں "غیر رسمی" طور پر آپ کے یہاں ٹھہرا اور آپ کی مہمان نوازی سے خوش وقت ہوا۔

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی [۶۴]

خیر! اب نہیں تو پھر کبھی سہی۔ اس سودائے نقد کو اب معاملۂ قرض سمجھیے۔ آپ محبت و اخلاص کے مقروض بنتے ہیں، تو مجھے قرض وصول کرنے میں کبھی تامل نہ ہوگا۔[۱]

مجھے سفر میں زکام ہوگیا تھا۔ کئی سال سے یہ شکایت میرے لیے بڑی ہی سخت شکایت ہوگئی ہے۔ اس وقت تک مبتلا ہوں۔ سر جکڑا ہوا ہے، بالکل معطل ہو رہا ہوں:

والسلام علیکم ابوالکلام

(۶۴)

۱۹۔ اے بالی گنج سرکلر روڈ۔ کلکتہ

۲۷ اگست ۱۹۳۷ء

عزیزی،

بالآخر پشاور یا ایبٹ آباد کے لیے وقت نکالنا پڑا۔ صحت ساتھ نہیں دیتی، مگر حالات کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ میں اس سفر میں ایاباً و ذہاباً پشاور کے سوا اور کہیں رک نہیں سکتا۔ اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ لاہور ٹھہر سکوں، لیکن لاہور اسٹیشن پر ڈیڑھ گھنٹے کی مہلت نکل آئیگی۔ آپ اگر آجائیں، تو ملاقات ہو جائے۔

میں ۲۹ کو پنجاب میل سے روانہ ہونگا۔ یہ ۳۱ کی صبح کو چھ بج کر پچاس منٹ پر

---

[۱] اخباروں میں شائع ہوا تھا کہ مولانا بنوں کانفرنس کی صدارت فرمائینگے۔ میں نے عرض کیا کہ بنوں جاتے ہوئے ایک دن کے لیے لاہور ٹھہر جائیے اور یہاں کا قیام "رسمی" نہیں، بلکہ "غیر رسمی" ہو تاکہ خلوت میں باطمینان باتیں کرنے کا موقع ملے۔ کانگرس کی مشغولیتیں اس میں خلل انداز نہ ہوں۔

لاہور پہنچیگا اور پھر ساڑھے آٹھ بجے پشاور کی ٹرین روانہ ہو گی لے

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

(۶۵)

ایبٹ آباد

۵ ستمبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

آپ کا تار مل گیا تھا۔ مگر خط نہیں ملا، جواب اس لیے فوراً نہیں بھیجا کہ روانگی کا وقت غیر معیّن تھا۔ بہت ممکن ہے تین چار دن کی ابھی مزید تاخیر ہو۔ بہرحال روانگی کی اطلاع بروقت ضرور دے دونگا ے

والسلام علیکم

ابوالکلام

لے اس موقعے پر مولانا کے لمبا رٹمنٹ ہی میں بہ اطمینان باتوں کا موقع مل گیا۔ دوسرے اصحاب بھی خاصی تعداد میں آئے ہوئے تھے، لیکن مولانا نے اُن سے جلد فارغ ہوکر خاصا وقت نکال لیا۔

ے مولانا سرحد تشریف لے گئے تھے اور قیام کی جو تخمینی مدت بتا گئے تھے، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے تار بھی دیا اور عریضہ بھی بھیجا کہ سرحد سے روانگی کا وقت معلوم ہو جائے۔

(۶۶)

(تار کا ترجمہ)

"انقلاب" لاہور

کل کلکتہ میل میں لاہور سے گزر رہا ہوں[1]

ابوالکلام

(۶۷)

۱۹ اے، بالی گنج سرکلر روڈ، کلکتہ

۲۷ ستمبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

روپیہ کلکتہ سے نہیں لکھنؤ سے بھیجا گیا تھا۔ مجھے خیال ہوا اگر آپ نے چیک براہِ راست بنیک سے بھنانا چاہا، تو ممکن ہے، وہ کلکتہ کی تصدیق کے بعد روپیہ دیں اور اس طرح ایک ہفتہ کی دیر ہو جائے، چونکہ روپیہ ایک دوسرا چیک دے کر

---

[1] یہ اطلاع مولانا نے کسی کو نہ دی تھی۔ میں اور سالک صاحب لاہور سے گوجرانوالہ پہنچ گئے اور وہاں سے مولانا کے ساتھ لاہور آئے۔ یہاں مولوی محمد علی مرحوم قصوری مولوی محمود علی قصوری بھی موجود تھے۔ مولانا کو لاہور سے بذریعہ کلکتہ میل جانا تھا، وہ جا چکی تھی۔ دوسری کوئی ٹرین موجود نہ تھی، لیکن مولانا ایک رات کے لیے بھی رُکنے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لیے کہ چند ضروری کام درپیش تھے، لہٰذا ایک اور ٹرین میں ان کے لیے نشست کا بندوبست کیا گیا اور وہ کوئی تین گھنٹے کے قیام کے بعد روانہ ہو گئے۔

لکھنؤ میں لے لیا تھا اس لیے بھیج دیا گیا۔[۱]

غالب کے لیے چند دن اور توقف کیجیے۔

ٹیپو سلطان کی جس کتاب کا ذکر کیا تھا، تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ وہی کتاب ہے جس میں فرنچ قواعدِ جنگ کو فارسی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہ وکٹوریہ میموریل ہال کی چیزوں میں ہے، لیکن نگرانی کلکتہ میوزیم کی ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہو، تو غالباً نقل حاصل کی جا سکتی ہے۔

حیدر اور ٹیپو کے لیے جن انگریزی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے، غالباً وہ آپ نے جمع کر لی ہونگی۔ چارلس اسٹیورٹ کی "میموئرس آف حیدر علی اینڈ ہز سن"، کرنل بٹین کی "اے ریویو آف دی اوریجن اینڈ کنڈکٹ آف دی وار وِدھ ٹیپو" اور ان آفیسر ان دی ایسٹ انڈیا کمپنیز سروس کی "آتھینٹک میموئرز آف ٹیپو"[۴۵] دوسری اور آخری جنگ کے زمانے ہی میں لکھی گئی تھیں اور کتب خانوں میں مل سکتی ہیں۔

ایک فرنچ افسر ایم ڈی۔ ال، ٹی نے حیدر علی کے حالات ۱۷۸۱ء میں لکھے تھے اور لندن میں شائع کیے تھے۔ پرنس غلام محمد نے اس کی نقل کلکتہ میں چھپوا کر غدر سے پہلے شائع کی تھی۔[۲] حیدر علی کے لیے یہ سب سے بہتر کتاب ہے۔ ان کے علاوہ

---

[۱] مولانا کے لیے نئی ٹرین کا ٹکٹ ہم نے خرید اتھا۔ وہ ہماری طرف سے ٹکٹ قبول فرمانے پر راضی نہ تھے اور جاتے ہوئے ہیڈ ٹکٹ کے روپے کا چیک دے گئے اور بعد میں روپے بھی بھیج دیے۔ گویا دگنی رقم عطا فرمائی، میں نے گلہ مندانہ عریضہ بھیجا، تو یہ ارشاد فرمایا۔

[۲] کھیم نرائن کی "فتوحاتِ حیدری" بیشک شائع نہیں ہوئی۔ "نشانِ حیدری" ۱۸۹۰ء میں چھپ چکی تھی۔ ممکن ہے ایم، ڈی، ال، ٹی کی کتاب کا ترجمہ الگ بھی پرنس غلام محمد نے شائع کر دیا ہو۔ "کارنامۂ حیدری" میں بھی یہ شامل ہے۔ یہ کتاب دراصل فرانسیسی میں لکھی گئی تھی۔ پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں ۱۸۵۶ء میں حیدر علی کے حالات کے ساتھ ٹیپو سلطان کے حالات

اس عہد کے سرکاری ڈسپیچوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے، جو شائع ہو چکے ہیں۔ خصوصاً لارڈ کارنواس، اور ویلیسلی کے۔ والٹر ہملٹن کے ایسٹ انڈیا گزٹ کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ لفٹننٹ کرنیل مارک ولکس کی "ہسٹری آف میسور" میں بھی حیدر اور ٹیپو کی جنگوں کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

فارسی کتابوں میں صرف تین کتابیں قابلِ اعتنا ہیں، لالہ کھیم نرائن کی "فتوحاتِ حیدری"، حسین علی کرمانی کی "نشانِ حیدری" اور مولوی عبدالرحیم کی "کارنامۂ حیدری"۔ پہلی دو کتابیں شائع نہیں ہوئیں لیکن مولوی عبدالرحیم کے پیشِ نظر تھیں۔ ان کا تمام ضروری حصّہ انھوں نے اپنی کتاب میں لے لیا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نقل کر لیا ہے۔ اس میں حیدر علی کے خاندان کو عربی اور شاہی خاندان بنا دینے کے لیے جو کہانی لکھی ہے وہ یقیناً فرضی ہے، لیکن عام حالات ضرور مستند سمجھنے چاہییں۔

ٹیپو سلطان کے خاندان کے قبضے میں چند کتابیں اور بھی تھیں۔ یہ لوگ چونکہ والد مرحوم کے مرید تھے، اس لیے اکثر گھر میں آتے رہتے تھے اور بچپنے کی بات یاد ہے کہ کئی قلمی کتابوں کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن بعد کو جب مجھے خیال ہوا اور ان کتابوں اور یادداشتوں کو دیکھنا چاہا، تو انقلابِ حال نے سارا کارخانہ برہم کر دیا تھا۔ کوئی چیز بھی کسی کے قبضے میں باقی نہیں رہی تھی۔ اب پرنس غلام محمد کے خاندان میں صرف غلام حسین باقی ہیں۔ میں نے انھیں لکھا یا ہے کہ اگر کوئی کتاب باقی ہو، تو اس کا سراغ لگائیں۔

(بقیہ) شامل کر کے اسے دوبارہ چھاپا گیا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں دونوں نسخے موجود ہیں۔ میں اس زمانے میں "ٹیپو سلطان" کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا اور مولانا سے میں نے ماخذ کے متعلق استفسار کیا تھا، بلکہ تین سو صفحے لکھ بھی لیے تھے۔

ملا فیروز نے جارج نامہ میں لڑائیوں کا حال نظم کیا ہے اور وہ میرے کتب خانے میں موجود ہے، لیکن وہ تمام تر انگریزی بیانات کی نقل ہے، تاریخی حیثیت سے لائق اعتنا نہیں۔ البتہ اس سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ حیدر علی کی عظمت اور ٹیپو کی شجاعت کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ جو نظم انگریزوں کی مداحی میں لکھی جا رہی تھی، وہ بھی اس کی جھلک سے اپنے کو نہ بچا سکی۔

آپ نے "ترجمان القرآن" کے انگریزی ترجمہ کی نسبت گفتگو کی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ فاروقی صاحب نے جلد اوّل کا ایک حصّہ مرتّب کر لیا ہے۔ میں نے ابھی دیکھا نہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ٹائپ کرا کے بھیج دینگے، تاکہ کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کوئی دوسرے صاحب یہ کام کرنا چاہتے ہیں، تو میں فاروقی صاحب کا ترجمہ ان کے حوالے کر دے سکتا ہوں نیز جلد اوّل بھی نظر ثانی کر کے بھیج دے سکتا ہوں۔

جن صاحب کا آپ نے ذکر کیا تھا کہ وہ انگریزی ترجمہ کے لیے معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ چاہیں، تو "امّ القرآن" انھیں اشاعت کے لیے دے سکتا ہوں۔ یہ تفسیر فاتحہ، مندرجہ "ترجمان القرآن" سے مختلف چیز ہو گئی ہے، کیونکہ علاوہ مطالب کی تہذیب و توسیع کے متعدد مباحث بالکل نئے ہیں اور جن لوگوں کے پاس "ترجمان القرآن" ہے وہ بھی مجبور ہونگے کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ معاملے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ ایک اڈیشن کے لیے معاملہ کر لیں، ایک یہ کہ دائمی حق اشاعت لے لیں۔ میں پہلے کو ترجیح دونگا، لیکن دوسرے کے لیے بھی تیار ہو جاؤنگا۔ والسّلام علیکم

سالک صاحب بھی اس سلام میں شریک ہیں۔

ابوالکلام

(۶۸)

کلکتہ

۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء

عزیزی،

ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس وقت خیال ہوا کہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات لکھنے ہوئے وہ کتابیں بھی سامنے رکھنی چاہئیں جو بعض انگریز قیدیوں نے رہائی کے بعد لکھی تھیں۔ اس سلسلے میں تین تحریروں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جیمس برسٹو کی سرگزشت کرنیل بیلی کے ایک آفیسر کا جرنل اور جیمس سکری (Scurry) کی لائف۔

حال میں "ٹرلیبرز لائبریری" نے ان تینوں رسالوں کا ایک مجموعہ "کیپٹوز آف ٹیپو" کے نام سے شائع کر دیا ہے اور عام طور پر فروخت ہو رہا ہے۔ اگر آپ نے یہ کتاب ابھی نہ لی ہو، تو بہتر ہے کہ منگوا لیجیے۔

ان لوگوں نے قید و بند کے جو شدائد بیان کیے ہیں، انھیں احتیاط کے ساتھ قبول کرنا چاہیے خصوصاً سکری کے بیانات۔ بہرحال یہ دوسرا سوال ہے۔ بہر دست مقصود یہ ہے کہ موضوع کا خام مواد جمع کر لینا چاہیے۔

ضمناً ٹیپو سلطان کا ذکر فرنچ اور عربی کی بعض کتابوں میں بھی آ گیا ہے اور میری نظر سے گزرا ہے۔ مثلاً سفارتِ فرانس کا پیرس میں ورود اور ڈھاکہ ململ کا تحفہ جس کا میری انتوانیتؔ نے گون بنایا تھا اور بطور یادگار کے میڈم ... کو دیا

لے لوئی شانزدھم، شاہ فرانس کی ملکہ۔ ان مکاتیب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر معاملے کے اطراف پر مولانا کی نظر کس درجہ وسیع تھی اور ایسی معلومات وہ عموماً قلم برداشتہ تحریر فرما دیتے تھے۔

تھا، نیز ایک غیر معمولی قسم کا طوطا جو ٹیپو کا سفیر سلطان کے لیے قسطنطنیہ سے جا رہا تھا اور قاہرہ میں دیکھا گیا تھا۔ پہلے کا حال میڈم مذکور نے اپنی یادداشت کے دیباچے میں لکھا ہے اور دوسرے کا ذکر جبرتی کی تاریخ میں ہے۔ میڈم (Kampan) کی میموئرس کا انگریزی ترجمہ چھپ چکا ہے اور جبرتی کی "عجائب الاسفار" ابن خلکان کے حاشیہ پر ہے اور الگ بھی چھپ چکی ہے۔

پہلی سفارت کے ورود کا ذکر پرنسس لامبال کے میموئرس میں بھی ملتا ہے۔ اس تقریب سے کہ سفراء کے ورود کے دربار میں وہ شریک نہ ہو سکی کیونکہ ڈافن چیچک میں مبتلا تھا اور یہ اس کی تیمارداری میں لگی تھی۔

کتاب دیکھے کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ محض حافظے سے لکھ رہا ہوں۔ اس کے انگریزی ترجمہ کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور بازار میں عام طور پر ملتے ہیں۔

"تحفۃ المجاہدین" سید زین العابدین شوستری نے مرتب کی تھی، غالباً یہ ان سفراء ایران میں سے تھا جو کریم خان ژند نے حیدر علی کے خط کے جواب کے ساتھ بھیجے تھے، لیکن میسور میں مقیم ہو گیا۔ یہ ترکی سے بھی واقف تھا۔ بہت سی مصطلحا اس نے ترکی اختیار کی ہیں۔

فرنچ میں کئی کتابیں حیدر علی اور ٹیپو کے حالات میں لکھی گئی ہیں، جن کا انگریزی ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی ماہر سے اس بارے میں خط و کتابت کر لی جائے۔ بہتر ہو گا کہ موسیو فلیشے سے خط و کتابت کیجیے، جو نیشنل لائبریری کے مہتمم ہیں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۶۹)

کلکتہ

۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، غالباً میں نے اس مضمون میں میڈم کامپاں اور پرنسس دی لامبال کی یادداشتوں کا حوالہ دیا تھا۔ ان دونوں کا انگریزی ترجمہ شائع ہو چکا ہے اور میرے پاس موجود ہے۔ میرا نسخہ فرانس کی خودنوشتہ سوانح عمریوں اور یادداشتوں کے ایک پورے سلسلے کا جزو ہے، جو امریکہ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سات آٹھ کتابیں آ گئی ہیں۔ لیکن یہ کتابیں الگ بھی چھپی ہیں۔

لیکن ان میں حیدر علی اور ٹیپو کے بارے میں کوئی ایسا مواد نہیں مل سکتا جس کے لیے ان کا مطالعہ ضروری تصور کیا جائے۔ صرف ٹیپو کی سفارت کا ضمناً ذکر آ گیا ہے، اور وہ بھی چند سطروں میں۔ البتہ میڈم کامپاں نے اپنے دیباچے میں ہندوستانی ململ کے ایک گون کا ذکر کیا ہے، جو ٹیپو کے فرستادہ تحفہ سے میری انتوانیت (لوئس شانزدہم کی بیوی) نے بنوایا تھا اور اسے بطور یادگار کے دیا تھا۔ چونکہ ان دونوں کتابوں میں صرف اتنا ہی ذکر ہے، اس لیے اگر آپ چاہیں گے تو نقل کرا کے بھیج دونگا۔ البتہ دونوں کتابوں کے موضوع سے اگر دلچسپی ہو، تو منگوا لیجیے۔ لاہور کے کتب خانوں میں بھی ضرور مل جائینگی۔ باقی امور کے لیے دوسرے خط کا انتظار کیجیے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۷۰)

۲۷ نومبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، پچھلے خطوط بھی مل گئے تھے۔ جواب میں تاخیر ہو، تو اسے تغافل پر محمول نہ کیجیے، معذوری کا نتیجہ سمجھیے۔ ہر چند چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو، لیکن حالات مجبور کر دیتے ہیں۔

مولوی خلیل احمد مرحوم کی کتابوں کا حال اس وقت معلوم نہ ہو سکا۔ غالب کے خطوط اگر ہونگے تو انھیں میں ہونگے۔ ایک صاحب رنگون گئے ہوئے ہیں۔ واپسی کا منتظر ہوں۔ ممکن ہے انھیں کچھ حال معلوم ہو[1]۔

تنظیم زکوٰۃ بذریعۂ قانون سازی یا بہ نگرانی حکومت کا مسئلہ ابتدا میں مجھے سہل معلوم ہوا تھا، لیکن جب غور کیا تو چند دشواریاں سامنے آ گئیں اور ابھی تک طبیعت مطمئن نہیں ہوئی ہے کہ اس کا نقشہ کیا ہو۔ بہر حال دماغ اس طرف سے غافل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ عنقریب اس بارے میں کچھ لکھ سکوں[2]۔

---

[1] میں مرزا غالب کے ان خطوط کی تلاش میں تھا جو سید فخر الدین حسین سخن کے نام تھے اور جن کا ذکر پہلے آ چکا تھا۔ جب نواب سید علی حسن خان اور میرزا محمد عسکری کے ذریعہ سے کوئی سراغ نہ مل سکا تو مولانا سے عرض کیا کہ وہ خلیل احمد مرحوم کے متعلقین سے دریافت فرمائیں۔

[2] یہاں خیال تھا کہ تنظیم زکوٰۃ کے لیے حکومت کے ذریعہ سے انتظام کیا جائے اور اس بارے میں مولانا سے عرض کیا تھا کہ کوئی مناسب پروگرام تجویز فرما دیں، تاکہ اسے قانونی شکل دی جا سکے۔ اس کا ذکر آگے بھی آیا ہے۔

ہاں مولوی ظفر اقبال صاحب کلکتہ آئے۔ مجھ سے ملے اور اپنے اخلاص و محبت کا اثر دل پر چھوڑ گئے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ "ترجمان القرآن" کا ایک ایڈیشن بین السطور ترجمہ اور حواشی کے ساتھ بہ طرزِ قدیم و مالوف شائع کیا جائے[1] - میں بھی اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں، اور عام طور پر لوگوں کو اس کی طلب بھی بہت ہے۔ ان کی یہ تجویز بھی تھی کہ طباعت کا اہتمام جدید طریقہ سے کیا جائے، جس میں کتابت کا عکس محفوظ ہو جاتا ہے اور آیندہ ایڈیشنوں کے لیے نئی کتابت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انھوں نے صرف تجویز ہی پیش نہیں کی تھی، بلکہ نگرانی و اہتمام کے لیے پوری آمادگی ظاہر کی تھی۔ اگر مولوی صاحب موصوف اور آپ مشورے کے بعد ایک طریق کار ٹھہرا لیں، تو بلاشبہہ یہ ایک ضروری کام ہے، جو انجام پا جائیگا۔

کسی پچھلے خط میں آپ نے "اُمّ القرآن" کی طباعت کے باب میں میرا خیال دریافت کیا تھا۔ اس کا حال یہ ہے کہ رائل سائز پر (یعنی عام کتابی سائز پر) اگر کتابت کرائی جائے، تو کم و بیش تین سو صفحوں کی ضخامت ہو جائیگی۔ کاغذ عمدہ لگوایا جائے اور جلد بھی بندھوائی جائے، تو کم از کم قیمت تین روپیہ قرار دی جا سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ ہے۔ تعداد طباعت پانچ ہزار سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اس صورت میں پندرہ ہزار مجموعی قیمت پڑیگی۔ یا بصورت ہے ساڑھے سترہ ہزار۔ مسودہ بالکل تیار رہے میں چاہتا ہوں، اس کی کتابت و طباعت کا لاہور میں انتظام ہو جائے کیونکہ منشی عبدالقیوم تیسری جلد کی کتابت میں مشغول ہیں، لیکن میں بوجوہ اس

---

[1] مولانا ظفر اقبال صاحب ایم، اے جو اس وقت محکمۂ تعلیم میں امتحانات کے رجسٹرار تھے۔ موصوف پرچے چھپوانے کے لیے کلکتہ گئے تھے، تو وہاں مولانا سے بھی ملے تھے۔ اس معاملے کا مزید ذکر آگے آئیگا۔

صورت میں ترجیح دونگا اگر کوئی صاحب مجھ سے اس طرح کی معاملت کریں:

۱۔ تمام نسخے وہ لینگے

۲۔ کمیشن یا حصہ ان کا قرار پا جائے۔

۳۔ جب میں کتاب طباعت کے لیے دے دوں (اور وہ فوراً دے دی جائیگی) تو وہ اتنی رقم پیشگی دے دیں، جو مصارفِ طباعت کے فوری مطالبے کے لئے نیز میری بعض فوری ضروریات کے لیے کفالت کرے۔ بقیہ رقم تکمیلِ طباعت کے بعد وصول کی جائیگی۔

کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے؟ اگر ممکن ہو تو مطلع کیجیے تفصیلات آپ پر چھوڑتا ہوں، کیونکہ اس طرح کے معاملات میں میں نے آپ کو وکیلِ مطلق قرار دے دیا ہے۔

میرا اندازہ ہے کہ کتاب کو تین ماہ میں نکل جانا چاہیے۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۷۱)

۲۹ دسمبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، بحالتِ موجودہ تنظیمِ زکوٰۃ کی صحیح صورت یہی ہے کہ بغیر قانون سازی اور مداخلتِ حکومت کے کوئی جماعتی نظام استوار ہو۔ بلاشبہہ یہ راہ دُور کی راہ معلوم ہوتی ہے۔ اور قانون سازی کی راہ بظاہر اقرب ہے۔ لیکن غور کرتا ہوں تو دوسری راہ میں متعدد اصولی اور عملی اشکال حائل ہیں۔ اگر معاملہ سنجی کے بغیر

کوئی اقدام کیا گیا تو ناکامی کا اندیشہ ہے۔ بہر حال اس بارے میں آیندہ لکھونگا۔
"ام القرآن" کا معاملہ یوں سمجھائے کہ کتاب پانچ ہزار چھپیگی، قیمت ہے تصوّر کرلی جائے۔ صاحبِ معاملہ کتاب کے تمام نسخوں کے لینے کا معاملہ کریں کمیشن جو آپ تجویز کردیں، وہ قرار پا جائے۔ چونکہ صاحبِ معاملہ کو قیمت کا ایک حصّہ قبلِ طباعت دے دینا پڑیگا، اس لیے یقیناً اسے حق ہونا چاہیے کہ کمیشن میں مزید رعایت کا خواستگار ہو۔
اب کمیشن کے تعیّن کے بعد اُسے جو رقم میرے حوالہ کرنی چاہیے، میں چاہونگا کہ اس کا اتنا حصّہ قبلِ طباعت دے دیں، جو طباعت کے ناگزیر مصارف کے لیے کفایت کرے، نیز ڈھائی ہزار روپیہ مجھے وصول ہو جائے۔
طباعت کے مصارف کا اندازہ سترہ اٹھارہ سو روپیہ کا ہوتا ہے۔ رائل سائز پر چھپیگی اور ضخامت تین سو سے کچھ زائد ہو گی۔ مسودہ میں آپ کو بھیج دونگا۔ اگر خوشنویس نے تساہل نہ کیا، تو زیادہ سے زیادہ تین ماہ کے اندر کتاب نکل جا سکتی ہے۔
"غالب" کے لیے چند دن اور انتظار کیجیے۔
طبیعت اچھی نہیں ہے، درد کا پھر دورہ پڑا ہے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابو الکلام

"اُمّ القرآن" کے لیے جو صورت میرے ذہن میں آئی تھی، لکھ دی۔ اگر آپ کوئی دوسری صورت تجویز کریں، تو اس میں بھی مجھے تامّل نہ ہو گا۔

(۷۲)

کلکتہ

۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء

عزیزی، السلام علیکم

خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ میری کتابوں کی طبع و اشاعت میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں۔ حد ہو گئی کہ آپ آمادہ ہیں، ضرورت پڑے تو "اُم القرآن" کے مصارف کا خود پیشگی انصرام کر دیں مگر نہیں، اس کی بالکل ضرورت نہیں۔ میرا مقصود صرف یہ تھا کہ اگر کوئی صاحب تاجرانہ انتفاع کے خیال سے معاملت کر سکیں، تو میں بوجوہ معاملت کرونگا۔ یہ مطلب ہرگز ہرگز نہ تھا کہ شخصاً آپ اپنے اوپر کوئی بوجھ ڈالیں، حاشا وکلا۔[1]

[1] میں نے دراصل لکھا تھا کہ نہ مسودہ کسی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہیے اور نہ طباعت سے قبل کچھ رقم لے کر کوئی معاملہ کرنا مناسب ہوگا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر میں نے اس سلسلے میں رقم کی ذمہ داری اٹھا لینے پر آمادگی ظاہر کی، تو مولانا اسے کبھی قبول نہ فرمائینگے۔ لہذا اس انداز میں لکھا تھا کہ آپ مسودہ بھیج دیں، طباعت کا بھی انتظام ہو جائیگا اور آپ کی خدمت میں روپیہ بھیج دیا جائیگا لیکن کتاب تکمیل طباعت کے بعد ہی فروخت ہو گی۔ مولانا نے میری اس تحریر سے اصل حقیقت کا اندازہ فرما لیا اور انکار کر دیا۔ دراصل وہ اپنے معاملے کے لیے کسی کی بھی آمادگی خدمت قبول کر لینے پر راضی نہ ہوتے، خواہ وہ اُن کے نزدیک کتنا ہی عزیز تھا۔ ان کا طریقہ یہی تھا کہ دوسروں کو فائدہ پہنچائیں اور خود کوئی بھی خدمت منظور نہ فرماتے تھے۔ ان کی کتابوں کی باقاعدہ اشاعت میں اس وجہ سے افسوسناک تاخیر بھی ہوئی، جس میں خود ان کا بھی خاصا مالی نقصان ہوا۔ اور دنیا علم و دین کے اُن جواہر پاروں سے بقدر شوق فائدہ اُٹھا سکی، جو مولانا کے سوا کوئی فرد نہ دے سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے طرزِ عمل میں خفیف سے تغیر پر بھی راضی نہ ہوئے۔

کتاب پانچ ہزار ضرور چھپنی چاہیے۔ قیمت کا آپ نے جو اندازہ لگایا ہے یعنی ۱۲ر ٹھیک ہے۔ کمیشن کی مقدار بھی اس صورت میں ٹھیک ہے، اگر صاحب معاملہ سر دست روپیہ نکالیں۔ وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ مسودہ لے لیں اور بطور خود چھاپیں لیکن اگر کوئی ایسی صورت متوقع نہ ہو، تو پھر سر دست معاملت کرنا بے سود ہوگا۔ کتاب بطورِ خود چھاپ لی جائیگی اور جب چھپ جائیگی تو معاملے کا صحیح وقت ہوگا۔ دراصل مجھے اس معاملے کا خیال بعض خاص حالات کی بنا پر ہوا تھا، ورنہ پیشگی مطالبہ کی بنا پر معاملہ کرنا کوئی موزوں طریق کار نہیں ہے، اِلّا یہ کہ معاملہ کی بنیاد مسودے کی خرید و فروخت پر ہو۔ اب میں کسی دوسرے انتظام کی فکر کرونگا، ایسا جس سے موجودہ حالات کا تقاضا بھی پورا ہو جائے اور مصارف کا بھی۔ پھر جب کتاب نکل جائیگی تو روپیہ آ جائیگا۔

"ترجمان القرآن" کے طبع ثانی کے لیے آپ نے اور مولوی ظفر اقبال صاحب نے جو تخمینہ کیا ہے، وہ ٹھیک ہے اور اس کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔ البتہ الگ الگ پارٹ کی اشاعت کی تجویز کسی اعتبار سے بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔ کتاب بیک مرتبہ ہی نکلنی چاہیے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام جو زیادہ وقت لیگا، وہ کتابت کا ہے۔ پھر جب قلم بن گئی تو طباعت اپنے اختیار کی بات ہوگی۔ سب سے پہلے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ میں انشاء اللہ اس بارے میں بھی آپ کو اپنے طریق کار سے مطلع کرونگا۔ مولوی ظفر اقبال صاحب کی سعی و آمادگی کا بھی شکر گزار ہوں، اللہ تعالیٰ انھیں بھی جزائے خیر دے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں اطرافِ اودھ کے ایک صاحب حافظ جمال الدین کلکتہ آئے اور مقیم ہو گئے۔ پیری مریدی کا مشغلہ تھا اور غالباً سیّد صاحب بریلوی سے بیعت بھی کی تھی۔ چیت پور روڈ میں ایک مسجد انہی کی سعی سے بنی، جو حافظ جمال الدین

کی مسجد کے نام سے مشہور رہے بہت ممکن ہے کہ انھیں حافظ جمال الدین نے شوقِ تبلیغِ سنیت میں واجد علی کو یہ پیام بھیجا ہو۔ واجد علی اور ان کے مصاحبوں کی مجنونانہ حرکتیں اس باب میں مشہور ہیں۔ انھیں آخر عمر تک یہ جنون رہا تھا کہ تختِ اودھ واپس مل جائیگا۔ جادوگروں سے جادو، عاملوں سے اعمالِ تسخیر، نقش نویسوں سے تعویذ، اور فقرا و مشائخ سے توسل کا سلسلہ برابر جاری رہا کرتا تھا اور بہتوں کی روزی اسی سے چلتی تھی۔ ممکن ہے کسی نے حافظ جمال الدین مرحوم سے درخواستِ دعا کی ہو اور انھوں نے سنی ہو جانے کی فرمائش جڑ دی ہو۔

ابوالکلام

خط کے آخر میں سلام لکھنے کی جگہ نہیں رہی اس لیے اب ابتدا میں لکھ دیا ہے ورنہ صحیح محل آخر مکتوب ہی ہے۔

(۷۳)

کلکتہ

۲۳ دسمبر ۱۹۳۷ء

عزیزی،

خط پہنچا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاءِ خیر دے کہ میرے دردِ رنجوری کے لیے اس درجہ حساس دل رکھتے ہیں لیکن اس کی کہاں تک فکر کیجیے گا۔ حیران ہوں اپنے جسم کو زیادہ بیمار کہوں، یا دل کو ؎

کہ گفتہ بود کہ دردش دوا پذیر مباد![۶۷]

۱؎ غالباً میں نے پوچھا تھا کہ آیا واجد علی شاہ کو سنیت قبول کر لینے کی دعوت دی گئی تھی؟

"ام القرآن" کے لیے لکھ چکا ہوں۔ آپ کا یہ خیال درست ہے کہ طباعت واشاعت کے لیے اس طرح کی معاملات کا خیال موزوں نہیں جس تاجر کو کتاب کمیشن پر خریدنی ہے، وہ تین مہینے پہلے کیوں رقم لگائے؟ البتہ یہ صورت ہوسکتی ہے کہ کوئی منفعت خواہ مسودہ کا کاپی رائٹ کسی معیّن زمانے کے لیے یا ہمیشہ کے لیے خرید لے اور پھر خود چھاپے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا کوئی ایسی صورت ممکن ہے؟ شرمندہ ہوں کہ آپ کی کتاب "غالب" اس وقت نہ بھیج سکا۔ بھیجنے کو تو جب چاہوں بھیج دوں لیکن خیال ہے کہ ساری ضروری باتیں لکھ کر بھیجوں۔ اسی غرض سے روک رکھی ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ نواب حسام الدین حیدر اوران کے لڑکے معین الدّولہ حسین مرزا کی نسبت پوچھا تھا کہ ان کا تعلق کس خاندان سے تھا؟ ادھر ایک ضرورت سے تاریخ کی الماریاں دیکھ رہا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ ایک رسالہ جو غدر سے پہلے تاریخ پنجاب کے نام سے آگرہ میں چھپا تھا۔ نکل آیا۔ اسے دیکھا تو نواب احمد بخش خان کے خاندان کا مفصّل حال مل گیا اور خود معین الدّولہ کی زبانی اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی اسی خاندان کی دوسری شاخ تھے، یعنی احمد بخش کا خاندان عارف جان سے چلا، ان کا قاسم جان سے، اور دونوں بھائی تھے۔[۱] بلّی ماران کے پاس قاسم جان کی گلی کی وجہ تسمیہ یہی قاسم جان ہیں۔ یہ بھی صاف

---

[۱] حسام الدین حیدر خان کے بیٹے حسین مرزا کا لقب ذوالفقار الدّولہ تھا اور اسے عارف جان یا قاسم جان کے خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا کو اس باب میں اشتباہ ہوا جیسا کہ اگلے مکتوب میں انھوں نے خود تصریح فرمادی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میری کتاب پر ضروری یادداشتیں تحریر فرمانے کے لیے زیادہ فرصت نکال سکتے تھے اور یہ خیال بھی تھا کہ مجھے افادات سے محروم نہ فرمائیں۔ جتنا وقت ملتا اور جو کچھ پیش نظر آتا، تحریر فرما دیتے۔ نہ زیادہ فرصت تھی، اور نہ مراجعت کتب کی مہلت پاتے تھے۔ جس رسالے کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ "تحفۃ الاحباب" نام تاریخ پنجاب تھی۔

نظر آتا ہے کہ احمد بخش کا خاندان اور غالب کا خاندان بیک وقت سمرقند سے نکلا، بیک وقت لاہور آیا۔ بیک وقت میر منّو کے یہاں ملازم ہوا، البتہ عارف اور قاسم، علی گوہر[1] (شاہ عالم بعہدِ ولی عہدی) کے پاس بنگال چلے گئے اور نہیں کہا جا سکتا کہ غالب کے دادا بھی ساتھ گئے یا نہیں، لیکن حالات کی تمام کڑیاں دونو خاندانوں کی بالکل مشترک اور ہم عنان ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ غالباً تفرقہ سفر بنگال کے بعد ہوا۔

ذرا وقت نکلے تو آپ کی کتاب میں یہ تفصیلات بھی لکھ دوں۔

اتفاقاً ادھر "درفشِ کاویانی" پر بھی نگاہ پڑ گئی اور تیس برس کے بعد دوبارہ مطالعہ کا اتفاق ہوا۔ افسوس کہ اس کی خصوصیات پر خواجہ حالی نے کوئی توجہ نہیں کی۔ کئی جہات خصوصیت کے ساتھ ابھارنی چاہییں، خصوصاً خاتمے کے فوائد۔ یقیناً ملا عبدالصمد ایک غیر معمولی نظر و تحقیق کا آدمی تھا۔ میں چاہتا ہوں، یہ سب باتیں آپ کے لیے لکھ دوں اور آپ "غالب" کا دوسرا ایڈیشن ہر اعتبار سے مکمل و منتہم بنا سکیں۔

افسوس ہے کہ زمانہ میرے دل و دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کر سکا۔ غالب کو تو صرف ایک شاعری ہی کا رونا تھا۔ نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائینگی۔

ناروا بود بہ بازارِ جہاں جنسِ وفا
رونقے گشتم و از طالعِ دکّاں رفتم! ۶۸

بعض اوقات سوچتا ہوں، تو طبیعت پر حسرت و الم کا ایک عجیب عالم طاری ہو جاتا ہے۔ مذہب، علوم و فنون، ادب، انشا، شاعری، کوئی وادی ایسی نہیں ہے

---

[1] مولانا نے شاہ عالم ثانی کا نام جہاں کہیں لکھا، علی گوہری لکھا۔ لیکن صحیح نام عالی گوہر تھا۔

یا رہی ہُ رہا ہیں مبدِ فیاض نے مجھ نا مراد کے دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن و ہر لحظہ شوں سے دامنِ دل مالامال نہ ہوا ہو۔ بجدیکہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ ماند کر دیتی ہیں۔

مازلت انزل فی ودادک منزلا

تتحیر الالباب عند نزولہا!

سوس جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے ر و سامانِ کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ہے کہ اس عہد او رمحل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔

کما اردنا ذالک الزمان بمدح

فشغلنا بذم ھذا الزمان

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

(۷۴)

کلکتہ

فروری ۱۹۳۸ء

عزیزی،

خط ملے۔ آپ نے "اُمّ القرآن" کی طباعت کے لیے آمادگی ظاہر کی تھی، میں نے

مکتوب گرامی کا آخری حصہ جو "افسوس ہے کہ زمانہ" سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت بھی انگیز تھا جب لکھا گیا تھا اور آج تو اس کی درد انگیزی دہ چند ہو گئی ہے۔

اس کی پوری قدر و قیمت محسوس کی۔ اخلاص و محبت کے سوا اور کونسی بات اس کے لیے محرک ہو سکتی تھی، امیں شکر گزار ہوں اور یقین کیجیے میرا اظہارِ تشکر ہمیشہ شائبہ تظاہر سے پاک ہوا کرتا ہے۔

میں نے کاپی رائٹ کے انتقال کی نسبت جو کچھ لکھا تھا، اس سے مقصود یہ نہ تھا کہ صرف ایک ایڈیشن کے لیے کوئی شخص معاملہ کرے۔ ظاہر ہے کہ کاروباری نقطۂ خیال سے کوئی بھی ایسا معاملہ نہیں کریگا۔ مقصود یہ تھا کہ دس بارہ برس کے لیے یا ہمیشہ کے لیے لے لے۔ اس صورت میں ایک مسلسل انتفاع کی چیز اس کے قبضہ میں ہوگی اور وہ اپنی منفعت کے خیال سے توسیعِ اشاعت میں بھی پوری طرح ساعی ہوگا۔ مجھے یہ خیال کیوں ہوا، اسے بھی آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ اس لیے ہوا کہ فوری ضروریات کا تقاضا تھا۔ چاہتا تھا اُن سے عہدہ برآ ہو جاؤں۔ بلاشبہ مالی نقطۂ خیال سے یہ صورت مرجح نہیں ہے لیکن آپ جانتے ہیں، میں اس نقطۂ خیال سے اپنے معاملات کو دیکھتا ہی نہیں۔ میرے لیے معاملات کا مالی پہلو صرف اتنا ہوتا ہے کہ وقت کی ضرورت کا جواب مل جائے اور کسی انسان کا بارِ احسان اٹھانا نہ پڑے[1]۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے، ٹھیک ہے۔ دراصل یہ مجھ سے غلطی ہوئی کہ حسام الدین حیدر کی جگہ معین الدین حسین کی طرف ذہن منتقل ہو گیا۔ معین الدین شرف الدولہ کے پوتے تھے، نہ کہ حسام الدین۔ اگر آپ کا استفسار حسام الدین کے بارے میں تھا تو نہیں معلوم کیونکر میرے ذہن میں معین الدین کا خیال پیدا ہو گیا۔ حسام الدین غالباً مرزا سلیمان شکوہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر آپ

---

[1] یہ جو کچھ فرمایا، مولانا کی پوری زندگی اس کی تصویر تھی۔

کے پاس طبا طبائی کی تاریخ لکھنؤ موجود ہو، تو اسے دیکھیے۔ مجھے خیال پڑتا ہے کہ حسام الدین حیدر کا ذکر کہیں آیا ہے۔
غالباً یہی حسام الدین بہادر شاہ کے شیعی ہونے کے واقعہ میں اصل محرک تھے۔[۱] انہی کی ترغیب سے انھوں نے مجتہد کے نام شقہ لکھا تھا اور حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھایا تھا۔ یہ بات کہیں میں نے پڑھی ہے مگر کہاں؟ ذہن میں محفوظ نہیں۔
غالب میں انشاء اللہ اس ماہ کے اواخر میں بھیج دونگا۔ اِدھر بالکل مہلت نہیں ملی۔ صرف چند دن اور مطلوب ہیں۔
تحریر میں بھی تحیۃ اولی و مستحسن ہے جس طرح ملاقات میں۔ لیکن اس کا موزوں محل ابتدا میں ہے یا اختتام میں؟ اس بارے میں اختلاف ہوا۔ امام احمد بن حنبل اختتام کے محل کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی طریقہ مکتوبات نبویہ میں ملحوظ رہا ہے۔ میں بھی اکثر یہی طریقہ ملحوظ رکھتا ہوں۔ معہذا دوسرا طریقہ بھی معمول بہا ہے اور موجب ردّ و قدح نہیں۔[۲]

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

ابوالکلام

---

[۱] یہاں بھی مولانا کو حسام الدین حیدر اور میرزا حیدر شکوہ نبیرۂ میرزا سلیمان شکوہ میں نام کے جزوی اشتراک کی بنا پر اشتباہ ہوا۔ حیدر شکوہ اور اس کا بھائی اس زمانے میں دہلی آئے تھے، جب بہادر شاہ سخت بیمار ہو گیا تھا۔ حیدر شکوہ نے لطور خود منّت مانی اور بادشاہ کو صحت ہوئی تو لکھنؤ جا کر حضرت عباس کی درگاہ میں علم چڑھایا۔ اس سے مشہور ہوا کہ بہادر شاہ شیعہ ہو گیا ہے۔ دہلی میں اس کے خلاف رنج و ناراضی کا طوفان اُٹھا۔

[۲] میں نے سوال کیا تھا کہ آپ ہمیشہ اختتام پر سلام لکھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ اس سوال کا جواب ہے۔

(۷۵)

کلکتہ

۹ مارچ ۱۹۳۸ء

عزیزی،

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے پیتا ہوں اور بالالتزام صبح شام پیتا ہوں

مے خوردن ہر روزہ زعادات کرام است[69]

مگر طبیعت کا انحراف دیکھیے کہ ایک گھنٹے سے چائے دھری ہے اور پینے کو جی نہیں چاہتا۔ بادہ آشاموں کا شیوہ ہے کہ جب تک شراب نہیں چھٹتی، اپنے کو بیمار نہیں سمجھتے مجھے شراب میسّر نہیں، چائے پر قانع ہوں۔ یہ بھی چھٹ جاتی ہے، تو سمجھتا ہوں اب تندرستی نے جواب دے دیا۔ "یہ بھی" کے حروفِ حصر پر زور دیجیے تب صورت حال واضح ہوگی۔

بہرحال چند ضروری خطوط کا جواب دیے بغیر چارہ نہیں اور سب سے پہلے آپ سے مخاطب ہوں۔

یہ آپ "امّ القرآن" کی طباعت کے معاملہ کو اس قدر طول کیوں دے رہے ہیں؟ وہ بات جو میں نے لکھی تھی، ایک خاص وقت کی تھی۔ وقت نکل گیا اور اس کی بات بھی آئی گئی ہو چکی تھی۔ باقی رہی کتاب کی اشاعت تو وہ ضرور عمل میں آئیگی۔ آپ ہی کو بھیج دونگا۔ اس بارے میں فکر و تشویش کو دخل نہ دیجیے۔

"غالب" میں اب ضرور بھیج دونگا، مطمئن رہیے۔ رام پور نے مکاتیب کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے، اس سے بعض نئے حالات روشنی میں آئے ہیں۔ ایک دو نظمیں بھی نئی نکل آئی ہیں۔ اگر یہ مجموعہ نظر سے نہ گزرا ہو، تو منگوا لیجیے۔ کوئی صاحب

عرشی[1] ہیں، انھوں نے مرتب کیا ہے مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ ٹائپ میں چھپوایا ہے اور نسخ ٹائپ میں۔

میں نے مجبور ہو کر کانگرس ورکنگ کمیٹی کی یہ خواہش منظور کر لی تھی کہ لاہور جاؤں، مگر اب صحت اجازت نہیں دیتی۔ بمبئی کی علالت نے بہت تھکا دیا ہے۔ جواہر لال کو لکھ رہا ہوں کہ یہ قضیہ وہی جا کر نپٹائیں۔ اگر وہ نہ جا سکے، تو پھر کسی اور کو بھیجوں گا۔ دراصل میری زندگی اب صرف جاڑے کے چند مہینوں کی رہ گئی ہے۔ وہ اس تیزی سے نکل جاتے ہیں کہ آنے کی خوشی اور جانے کا ماتم ایک ساتھ کرنا پڑتا ہے۔

زمانہ جام بہ دست و جنازہ بر دوش است

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۷۶)

کلکتہ

۴ مئی ۱۹۳۸ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ میں "غالب" آپ کو آیندہ ماہ کے پہلے ہفتے میں ضرور بھیج دوں گا انشاءاللہ تعالیٰ۔ اگر اتنا مزید توقف آپ کے کام کے لیے حارج نہ ہو، تو گوارا کر لیجیے۔

---

[1] جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی۔ "مکاتیب غالب" ان کی پہلی تصنیف تھی اور اُس وقت تک شہرت کے اُس درجے کو نہ پہنچے تھے جو انھیں بعد میں حاصل ہوا۔

ادھر کئی سال سے میرا یہ حال ہو رہا ہے کہ گرمیوں میں تقریباً معطل ہو جاتا ہوں۔ اس سال تعطل اور بڑھ گیا ہے۔ بہرحال آپ کی کتاب نکالتا ہوں اور مئی کے بقیہ دنوں میں وقتاً فوقتاً اُسے دیکھتا رہونگا۔

زاہد از ما خوشۂ تاکے بچشم کم مبیں[1]
ہی نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصانکرد ہ ایم

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام

(۷۷)

کلکتہ

۱۸ جون ۱۹۳۸ء

عزیزی،

خط مل چکا ہے لیکن لکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ خط ضروری خطوط میں رکھ لیا ہے۔ ایک دو دن مزید توقف کیجیے۔ یہ سطر میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تغافل پر محمول نہ کیجیے۔

والسلام علیکم

ابو الکلام

---

[1] یہ میرزا غالب کا شعر ہے۔ مولانا نے یہ شعر میری کتاب کے ابتدائی صفحے پر بھی تحریر فرمایا تھا۔ اگر میں کہوں کہ غالب نے یہ شعر اسی محل اور موقع کے لیے لکھا تھا تو اسے مبالغہ نہ سمجھیے۔ مولانا کا ایک کمال یہ تھا کہ شعر استعمال کر کے مفہوم معنی کا ہر گوشہ آشکار فرما دیتے تھے۔ اکثر بہترین اشعار کے معانی مجھ پر مولانا کے استعمال ہی سے واضح ہوئے۔

(۷۸)

۱۹ جولائی ۱۹۳۸ء

عزیزی،

آپ کو اپنے محبت و اخلاص کی وجہ سے جس بات کا خیال ہوا ہے، یہ بارہا بعض دوستوں اور عزیزوں کے سامنے آئی اور وہ نہایت مصر بھی ہوئے لیکن میری طبیعت کی آشفتگی ساتھ نہ دے سکی۔ اس بارے میں طبیعت کی اُفتاد کا یہ حال ہے کہ اخبار والوں، ڈائرکٹری والوں کی طرف سے صرف چند سطروں کے مواد کا بھی تقاضا ہوتا ہے، تو اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔[1] اصل یہ ہے کہ اس معاملے کے لیے قدرتی راہ یہی ہے کہ موت کا انتظار کیا جائے۔ جب تک میری زندگی مجھ میں اور لوگوں کے درمیان حائل ہے، شاید وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے، یعنی میرے حالاتِ زندگی نہیں لکھ سکتے۔ صحیح وقت اس کا میرے بعد آئیگا۔ کیوں نہ اس کا انتظار کیا جائے! جانسن باسول والی بات ٹھیک ہے۔[2] لیکن ضروری نہیں کہ ہمیشہ پیش آئے۔

"غالب" کے بارے میں، میں آپ کو یقیناً انتظار کی حالت میں نہیں رکھونگا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے مہلت نہیں ملتی۔ جس وقت کو سمجھتا ہوں کہ مہلت کا ہوگا، وہی مشغولیت کا نکل آتا ہے۔ پھر بیچارگی یہ ہے کہ وہی چوبیس گھنٹے میرے حصے میں آئے ہیں،

---

[1] میں نے گزارش کی تھی کہ سوانح کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہو جائیں۔

[2] انگریزی زبان کے مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر جانسن کے سوانح باسول نے ساتھ رہ کر مرتب کیے تھے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بیشک اس طرح زیادہ سے زیادہ صحیح اور مستند سوانح مرتب ہو جاتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ میرے متعلق بھی اسی ذریعہ سے کام لیا جائے۔

جو سب کو ملے ہیں ۔ بہرحال میرا جی چاہتا تھا کہ اگر میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں، تو ضرور کردوں۔ اگر جلد کچھ بھیج سکا، تو بھیج دونگا، نہ بھیج سکا، تو آپ اپنا کام شروع کردیجیے گا۔[1]

اس مرتبہ یہاں کا برسات کا موسم میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے دیکھیے انسانی کمزوریوں کا کیا حال ہے یہی کلکتہ، یہی اس کا برسات کا موسم ہے، جو اپنے خصائص کے ساتھ برابر گزرتا آیا ہے اور اب بھی ویسا ہی ہے، جیسا ہمیشہ تھا۔ وہ نہیں بدلا۔ لیکن چونکہ میں بدل گیا ہوں، اس لیے محسوس ہوتا ہے، گویا بالکل ایک نئی طرح کا موسم چھا گیا ہے!

جی میں آیا دو چار باتیں اور کر لوں! اور کوئی بات تھی نہیں، موسم کا سہارا لینا پڑا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۷۹)

کلکتہ

یکم اگست ۱۹۳۸ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا، وہ اس بارے میں میرے واقعی احساسات تھے یہ بات نہ تھی، کہ ٹالنا چاہا ہو۔ بہرحال:

---

[1] میں نے عرض کیا تھا کہ کتاب کا نیا ایڈیشن تیار کرنا ہے، اگر آپ کے تحریر فرمائے ہوئے افادات مل جاتے، تو میں انھیں مناسب مقامات پر شامل کر دیتا۔

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است[۲]

اس بارے میں جو کچھ آپ کے پیش نظر ہے، لکھیے، میری جانب سے کمی نہ ہوگی بہر حال میں محبّت و اخلاص کے لیے شکر گزار ہوں۔

تعبیرِ حالِ ما نہ نگہ مے تواں نمود[۳]
لختے ز حالِ خویش بہ سیما، نوشتہ ایم[۱]

ہاں آپ نے جب "غالب" بھیجی تھی، تو مختلف اوقات میں بعض مقامات کی نسبت کچھ لکھا تھا بجنسہٖ بھیج دونگا۔

ابوالکلام

(۸۰)

کلکتہ

۱۶ اگست ۱۹۳۸ء

عزیزی ۲

خط پہنچا، جو سوالات پیش نظر ہوں، وہ آپ فل اسکیپ کاغذ پر اس طرح لکھنا شروع کر دیں، کہ بالمقابل، جواب کے لیے کافی جگہ باقی رہے اور وہ مجھے بھیج دیں۔ اس کے سوا عملاً کوئی صورت ممکن نہیں۔ انشاء اللہ، میں جوابات ان کے سامنے لکھ کر یا لکھوا کر ضرور آپ کے حوالے کر دونگا۔[۲]

ابوالکلام

---

[۱] نظیری کا شعر ہے، اس نے پہلے مصرع میں "تعبیر" کی جگہ "تحقیق" اور دوسرے میں "لختے" کی جگہ "حرفے" لکھا ہے۔ مولانا نے اس میں تصرف فرمایا ہے یا ممکن ہے، ان کے حافظے میں یہ شعر اسی طرح محفوظ ہو۔

[۲] یہ سوانح ہی کا مسئلہ ہے۔ میں آرزو مند تھا کہ خود پاس بیٹھ کر متعدد صحبتوں میں سب کچھ سنوں۔ اور سوالات اس انداز میں مرتب کرنا ممکن نہ تھا کہ وہ تمام احوال پر حاوی ہوتے۔ افسوس کہ فراوانی شوق اس لطف اور نوازش سے فائدہ اٹھانے پر راضی نہ ہوئی اور جو کچھ میں چاہتا تھا، اس کے لیے وقت ساتھ نہ دے سکا۔

(۸۱)

کلکتہ

۸ جنوری ۱۹۳۹ء

عزیزی!

خط پہنچا، آپ نے جو شعر لکھا ہے اس کا یہاں کیا موقع تھا؟[1] ایک حدیث قدسی ہے مَن تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعاً[2] عمر بھر میری کوشش رہی ہے کہ اس وصف کے تخلق سے محروم نہ رہوں۔ اب بھی اس پر عامل ہوں اور عامل رہونگا۔

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا[3]

والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] شعلہ اصفہانی کا ایک شعر عریضہ میں لکھا تھا:

آں بخت نہ داریم کہ ہم بزم تو باشیم ۔۔۔ ما و سر راہ تو و آہے و نگاہے

میں عموماً ایسے اشعار لکھتا رہتا تھا جو ان کی طبیعت میں شگفتگی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے تھے، تاکہ وہ رسمی باتوں کے علاوہ بھی کچھ تحریر فرمائیں۔ مثلاً ایک مرتبہ لکھا تھا:

بختے نہ کہ با یار بیامیزم من ۔۔۔ قلبے نہ کہ از عشق بپرہیزم من

دستے نہ کہ در دامنش آویزم من ۔۔۔ پائے کہ از میانہ بگریزم من

(۸۲)

کلکتہ

۵ فروری ۱۹۳۹ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ مجھے یاد نہیں، آپ کا کوئی خط آیا تھا جس کا جواب میں نے نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو متاسف ہوں، لیکن اس بارے میں میری جو حالت ہے اس سے آپ کو بےخبر نہیں ہونا چاہیے۔ بہرحال:

ہزار بار بُرو، صد ہزار بار بیا

پشاور گئے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن اس وقت نہیں کہہ سکتا کہ فوراً جا رہا ہوں یا پانچ چھ دن کے بعد انشاء اللہ روانگی سے آپ کو مطلع کروں گا۔ لاہور ٹھہرنے سے تو مجبور رہوں گا[1]، لیکن یہ بہت اچھا ہو کہ آپ پشاور آجائیں۔ وہاں کے معاملات ایسے ہیں کہ غالباً قیام چار پانچ دنوں تک ممتد ہو۔

میں غالباً دہلی ایک دن ٹھہرتا ہوا جاؤں۔ اگر دہلی ٹھہرا تو بہت ممکن ہے، جی، آئی، پی ایکسپرس سے روانہ ہوں۔ اس صورت میں لاہور سے پشاور تک کا وقت شب میں نکلیگا اور گفتگو کے لیے راہ کی معیّت چنداں سودمند نہ ہو سکیگی۔ ہاں فرنٹیر میل کی صورت میں ممکن ہے۔ بہرحال بہتر یہی ہوگا کہ جب پشاور پہنچ جاؤں تو آپ بھی وہاں آجائیں

والسلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] مولانا سیاسی مشاغل کے سلسلے میں پشاور جا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ایاب و ذہاب میں ایک دو روز لاہور ٹھہریں۔

(۸۳)

پشاور
۱۳ فروری ۱۹۳۹ء

عزیزی،
سندھ اکسپریس والی بات اب بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ معلوم نہیں یہاں سے کب اور کس طرح مہلت ملے۔ بہرحال اگر سندھ اکسپریس سے روانہ ہو سکا، تو آپ کو مطلع کرونگا، ورنہ ملاقات کا موقع اب صرف دہلی میں باقی رہ گیا ہے۔ جس دن دہلی پہنچوں، اگر آپ بھی آ سکیں، تو دن بھر کی مہلت مل سکیگی۔
والسلام علیکم

ابوالکلام

(۸۴)

الہ آباد
۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء

عزیزی،
رات کو درد کی وجہ سے نیند نہیں آتی۔ صبح کا وقت پٹیوں کے بند ھنے کھلنے اور اسفنج وغیرہ میں نکل جاتا ہے[۱]۔ دوپہر کو کسی قدر سکون ہوتا ہے۔ اُس وقت لیٹے لیٹے کچھ لکھ سکتا ہوں، لیکن رات کی بےخوابی کی وجہ سے اُس وقت نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اِس طرح وہ وقت بھی نکل جاتا ہے۔ آج نیند کا غلبہ نہیں ہے کیونکہ

---

[۱] الہ آباد کے اسٹیشن پر اتفاقیہ مولانا کا پاؤں کیلے کے ایک چھلکے پر پڑا اور وہ گر گئے جس سے گھٹنے کی ہڈی میں فرکچر ہو گیا یہ اسی حادثے کا ذکر ہے۔

شب سینک سے درد میں کمی ہوئی اور آنکھ لگ گئی۔ چاہتا ہوں کہ چند خطوط کا خود جواب لکھ دوں۔ ان میں ایک آپ کا بھی خط ہے۔
مگر کیا لکھوں؟ بجز اس کے شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔ آج کلکتہ کا قصد ہے۔ وہاں یکسوئی کے ساتھ علاج جاری رہیگا۔ ڈاکٹروں کا تو فیصلہ یہ ہے کہ چار پانچ مہینوں تک اسی طرح پڑا رہنا پڑیگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۸۵)

کلکتہ

۱۹ اپریل ۱۹۳۹ء

عزیزی،

بائیں گھٹنے میں دو جگہ فتور واقع ہوا اوپر کے جوڑ کی بڑی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی اور نیچے کے جوڑ میں جسے Tibia کہتے ہیں "فرکچر" ہو گیا۔ اب پیرس پلاسٹر پورے پاؤں پر چڑھا دیا گیا ہے اور شب و روز چت پڑا رہنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ کم از کم چھ ہفتے تک اسی طرح رہنا چاہیے۔ اس کے بعد پلاسٹر کاٹیں گے۔ اگر ہڈی جڑ گئی، تو پھر چند ہفتے اور مطلوب ہونگے کہ پاؤں کھل جائے اور کام دے سکے۔ تقریباً تین ہفتے گزر چکے ہیں بقیہ ہفتے بھی گزر جائینگے۔

کار مشکل بود ما بر خویش آساں کردہ ایم[۷۶]

اپنی مشغولیت کے بارے میں جو فیصلہ کر چکا ہوں، وہ بہر حال فیصلہ ہے۔

لتعلمن نباہ بعد حین" چونکہ خود لکھنا چاہتا تھا اس لیے منتظرِ وقت رہا اور جواب میں دیر ہوئی۔ آپ کے اخلاص و محبت کا شکرگزار ہوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۸۶)

کلکتہ

۲ جولائی ۱۹۳۹ء

عزیزی

عذرخواہ ہوں، کہ آپ کے خطوط آئے اور بر وقت جواب نہ دے سکا میں ابھی تک چلنے پھرنے سے مجبور ہوں اور اوقات یک قلم غیر منضبط۔ ۱۸ مئی کو جب پلاسٹر کٹا گیا، تو ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ایک ماہ کے اندر اس کا اثر دور ہو جائیگا مگر اب ایک ماہ سے زیادہ عرصہ مالش اور بجلی کے معالجوں پر گزر چکا ہے اور پاؤں کی حالت بدستور ہے۔ اتنا ضرور ہوا ہے نی کیپ (Knee Cap) چڑھا کر اور دو لکڑیوں کا سہارا لے کر چند قدم چل لیتا ہوں اور ضروریات کے لیے غسلخانہ چلا جاتا ہوں۔ لیکن نہ تو پوری طرح پاؤں کھلتا اور بند ہوتا ہے، نہ گھٹنے کا ورم اور درد کم ہوا ہے اور نہ یہ قوت پیدا ہوئی ہے کہ پاؤں ٹھیک طرح زمین پر

ل فیصلہ یہ تھا کہ وہ سیاست کی عملی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو کر علمی و دینی کاموں میں مصروف ہو جائینگے۔ زبانی بات چیت ہو چکی تھی۔ میں نے تصدیق مزید چاہی تو فرمایا کہ فیصلہ پختہ ہے۔ لیکن رفیقوں کے اصرار کے باعث اپنا فیصلہ ملتوی کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ صدر کانگرس منتخب ہوئے اور گرفتاریوں کا خطرہ سامنے آگیا۔ اس حالت میں علیحدگی پر راضی ہو ہی نہ سکتے تھے۔

ٹِک سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گھٹنے کے پٹھوں میں بھی کوئی حرج واقع ہوا ہے، صرف ہڈی کا معاملہ نہ تھا۔ اب میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنے قدیم معالجات کی طرف توجہ کروں۔ ایک لیپ تیار کرا رہا ہوں۔ کل سے اس کا تجربہ شروع ہوگا۔ ڈاکٹر چونکہ صرف بجلی کا طریقِ علاج کام میں لا رہے ہیں، اس لیے لیپ کا استعمال اس میں مخل نہیں ہوگا۔

میں نے آپ کی کتاب "غالب" نکلوا لی ہے اور پاس رکھوا لی ہے۔ آپ نے اتنے دنوں انتظار کیا ہے تو کم از کم چند ضروری باتیں، جن کا تعلق وقائع سے ہے، قلمبند کر دوں۔ مطمئن رہیے اب میں بہت جلد بھیج دونگا۔

آپ نے میری آیندہ مشغولیت کے فیصلے کی نسبت جو پوچھا ہے، تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، البتہ اس حادثہ کی وجہ سے کسی قدر دیر ہوگئی۔ بعض ضروری امور تھے، جنھیں طے کر کے یکسو ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ بغیر میرے اس شکل میں طے نہیں ہو سکینگے، جس شکل و نوعیت میں طے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ معذوری نہ پیش آگئی ہوتی، تو میرا اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ اپریل تک وقت لگیگا۔ اس کی وجہ سے یہ تمام زمانہ بیکار گیا۔ اب کوشش کر رہا ہوں کہ بغیر نقل و حرکت کے انھیں کسی طرح نپٹا لوں[1]۔

وعلیکم السلام

ابوالکلام

---

[1] پچھلے مکتوب کے حاشیہ میں اصل معاملے کا ذکر کر چکا ہوں۔ حادثے کی وجہ سے تاخیر ہوئی۔ اگر ۱۹۳۹ء میں علمی کام شروع ہوتے، تو سترہ اٹھارہ سال میں خدا جانے کتنا عظیم الشان ذخیرۂ تصانیف فراہم ہو جاتا۔ ممکن تھا کہ اس حالت میں "الہلال" بھی جاری ہو جاتا اور ایک یا زیادہ روزانہ اخباروں کا انتظام بھی وہ اپنے معیار کے مطابق فرما دیتے۔

(۸۷)

کلکتہ

۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء

عزیزی،

خط پہنچا، پاؤں کی موجودہ حالت میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے مغربی طریقِ علاج کی خامی یا ناکامی کی طرف منسوب کیا جائے۔ میرا تاثر محض میری جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ میں چاہتا ہوں جلد سے جلد یہ حالت ختم ہو، اس لیے طریق علاج کی طوالت سے گھبرا سا گیا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے خیال ہوا بعض قدیم مرکبات استعمال کر دوں لے

سب کہتے ہیں کہ ہڈی کا معاملہ خصوصاً گھٹنے کا بڑا وقت لیتا ہے۔ خود میرے ایک معالج کو دو سال ہوئے کار ٹکرا جانے کا حادثہ یہاں پیش آیا تھا اور ہڈی میں انشقاق ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ چھ ماہ کے بعد چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تھے اور وہ بھی لکڑی کے ساتھ۔

علاوہ بریں عمر کو بھی ان امور میں بہت دخل ہے۔ اگر یہ حادثہ مجھے بیس سال پہلے پیش آتا، تو شاید اتنا وقت نہ لیتا۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ سردست علاج کی تبدیلی غیر ضروری ہے اور اس لیے

لے میں نے عرض کیا تھا کہ میرے تجربہ کے مطابق ہڈی کے انشقاق یا جوڑوں کے ہل جانے میں مغربی طریقِ علاج کے بجائے مشرقی طریقِ علاج زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ خود میرے بچے کی کہنی ہل گئی تھی۔ دیر تک ڈاکٹروں کا علاج جاری رکھا اور فائدہ نہ ہوا۔ موچی دروازہ کے اندر ایک پہلوان تھا، اس نے مالش کے لیے تیل تیار کر دیا اور اس سے بہت جلد فائدہ ہوا۔

آپ نے ازراہِ محبّت و اخلاص ایک آدمی کے بھجوانے کا جو قصد کیا ہے، اسے ملتوی کر دیں۔ اگر وہ آدمی مل جائے تو اس کا پتہ محفوظ رکھیے، مگر سردست اس سے زیادہ کچھ نہ کیجیے۔ اگر آگے چل کر ضرورت ہوئی، تو میں آپ کی اس کوشش سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔[1]

یہاں بھی ایک پہلوان پنجاب کا ہے اور اپنے کام میں بہت ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔ وہ بیچارہ بار بار اصرار کر چکا ہے کہ اُس کا علاج آزمایا جائے۔ ایک صاحب ایک دوسرے معالج کو بھی لے آئے تھے۔ میں ابھی اپنی حالت دیکھ رہا ہوں۔ ممکن ہے چند دنوں کے بعد اُن کا علاج آزماؤں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس محبّت کے لیے جزائے خیر دے۔ شکر گزار ہوں اور دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۸۸)

عزیزی،

سادہ صفحات پر جا بجا یادداشتیں لکھی گئی ہیں۔ ان پر نمبر نہیں ہیں کہ یہاں حوالہ دیا جائے۔ چاہیے کہ ایک مرتبہ ہر ورق کو دیکھ لیا جائے۔ بعض جگہ اصل کتاب

---

[1] میرے ایک عزیز دوست شیخ محمد حیات سے اس پہلوان کے بڑے تعلقات تھے اور شیخ صاحب کلکتہ بھجوانے پر آمادہ تھے۔ میں نے مولانا سے پوچھا، تو انھوں نے فرمایا کہ سردست ضرورت نہیں۔

کے حواشی پر اشارات ہیں، اس لیے ہر صفحہ پر نظر ڈال لینی چاہیے۔[1]

ابوالکلام

کلکتہ ۲۹/۱/۴۰ء

افسوس ہے کہ جس قدر وقت دینا چاہتا تھا نہ دے سکا، چونکہ اب بہت عرصہ ہو چکا ہے اور آپ بھی مُصر ہیں، اس لیے جس قدر لکھا جا سکا تھا اُسی پر اکتفا کرتا ہوں اور بھیج رہا ہوں۔

زاہدا زما خوشہ، تاکے بچشم کم مبیں
ہی، نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

(۸۹)

کلکتہ

۴ فروری ۱۹۴۰ء

عزیزی،

خط پہنچا۔ شرمسار ہوں کہ "غالب" کی نسبت آپ کی فرمائش پوری نہ کر سکا۔ بہرحال اب اس کتاب کا اور زیادہ عرصے تک یہاں پڑا رہنا مجھے گوارا نہیں کرنا چاہیے۔ آج اس کے ابتدائی صفحہ پر آپ کا نام لکھ کر دفتر کے حوالے کر رہا ہوں کہ رجسٹرڈ بھیج دیں۔ میں نے آپ کو غالب کا شعر لکھا تھا۔

---

[1] یہ تحریر مکتوب کی شکل میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ میری کتاب "غالب" کے آغاز میں مرقوم تھی۔ چونکہ اس کا انداز مکتوب کا تھا اس لیے یہاں رکھا گیا۔ اس کے تین چار روز بعد ارسالِ کتاب کے ساتھ ایک مکتوب بھی بھیجا گیا جس کا مضمون فی الجملہ یہی ہے مگر اس میں زیادہ تفصیل ہے۔ وہ مکتوب آگے ملاحظہ فرمائیے۔

زاہدا زما خوشۂ تاک بچشمِ کم مبیں

ہی، ہمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم!

یہ تاک کا پورا ایک خوشہ بھی نہیں ہے لیکن اوقات کا ایک پورا پیمانہ ضرور نقصان کرنا پڑتا ہے۔

میں نے جا بجا عبارات و الفاظ کی نسبت بھی اشارات کیے ہیں۔ ان کی درستگی پر خصوصیت کے ساتھ زور دونگا۔ آپ کا اسلوب پختہ اور بیداغ ہو جائے، اگر ان امور پر نظر رکھی جائے۔

پاؤں کی خلش بدستور ہے اور شاید اب جانے والی نہیں۔

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا[۷۹]

البتہ بجلی کے عملیہ سے ایک دوسری شکایت کو کافی فائدہ ہوا جو پچھلے دنوں شروع ہو گئی تھی اور ہٹ میں زور کیا تھا یعنی ریڑھ کے نیچے پیٹھ کے درد میں۔

آپ نے اپنے جس خط کا ذکر کیا ہے کہ جواب نہیں دیا گیا، میرے حافظے میں نہیں ہے مجھے تو یہی یاد پڑتا ہے کہ ہر خط کا جواب دیتا رہا ہوں

سالکؔ صاحب کو دعا حسبِ ضابطہ و رسم، اور سلام حسبِ ضابطۂ اسلام۔

آپ کے لیے بھی دعا و سلام دونوں۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

(۹۰)

کلکتہ

۱۵ مارچ ۱۹۴۰ء

عزیزی،

لاہور سے کئی شخصوں نے مجھے "انقلاب" کا ایک کٹنگ بھیجا ہے، جس میں آپ لکھتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں پر بہتان لگایا اور قرآن کریم کی یہ آیت بھی مجھے یاد ہے سُبحانکَ ھٰذا بُہتانٌ عظیم۔ بہتان اگر فرد پر لگایا جائے تو سخت جرم ہے لیکن اگر ایک مسلمان خود مسلمانوں پر لگائے تو اس جرم کی شناعت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب آپ کی وہ رائے میری نسبت نہیں رہی ہوگی، جس کی بنا پر آپ اظہارِ اخلاص کرتے رہے ہیں اور یقیناً آپ یہ پسند نہیں کرینگے کہ مداہنت و نفاق سے کام لیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مخمصے سے آپ کو نجات دے دوں[1]۔ آپ نے اس وقت تک جو محبّت و اخلاص مجھ سے رکھا ہے، اس کے لیے شکرگزار ہوں اور دعا کرتا ہوں۔

والسّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلام

---

[1] "انقلاب" میں ایک تحریر شائع ہوئی تھی جس کا اسلوب بڑا ہی افسوسناک تھا لیکن اس وقت میں لاہور میں نہ تھا۔ بعد میں مولانا کا گرامی نامہ آیا اور میں نے وہ تحریر دیکھی تو معذرت بھی کی، حقیقتِ حال بھی لکھی، یہ بھی عرض کیا کہ آپ کو آخری فیصلے سے پیشتر تحقیق فرمالینی چاہیے تھی۔

(۹۱)

کلکتہ

۱۴ مارچ ۱۹۴۰ء

عزیزی،

ایک خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا۔ تفضل حسین خان کے حالات میں "نانا" سے مقصود صریح پیشوا کا متبنیٰ نانا راؤ بٹھور (کانپور) والا ہے۔ یہ کہ یہ معنی جد[1] رکن المدرسین کا تو بمبئی میں غدر سے کچھ پہلے انتقال ہو گیا تھا[2]۔ لکھنؤ کے سقوط کے بعد گونڈا اور ترائی کا علاقہ انقلابی جنگ کی تمام قوتوں کا

---

[1] میری کتاب "غالب" میں مولانا نے ایک مقام پر نواب تفضل حسین والیِ فرخ آباد کا ذکر کرتے ہوئے ایک یا دو جگہ "نانا" کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے مقصود ڈھونڈو پنت نانا تھا، مجھے خیال ہوا کہ ممکن ہے، یہ مولانا کے اپنے والد ماجد کے نانا رکن المدرسین کی طرف اشارہ کیا ہو صرف رفع اشتباہ کے لیے میں نے پوچھا تو توضیح فرما دی کہ یہاں نانا راؤ مراد ہے۔

[2] مولانا نے بالکل بجا فرمایا کہ رکن المدرسین مولانا منور الدین کا انتقال بمبئی میں غدر سے کچھ پہلے ہوا۔ ایک موقع پر انھوں نے مفصل حالات سناتے ہوئے فرمایا تھا کہ رکن المدرسین ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے کچھ پہلے اپنے نواسے (مولانا کے والد) کو لے کر بعزمِ ہجرت حجاز روانہ ہو گئے تھے۔ بھوپال پہنچے، تو ہنگامہ شروع ہو گیا اور انھیں وہیں رکنا پڑا۔ ہنگامہ فرو ہوا، تو بھوپال سے بمبئی پہنچے، لیکن جہاز پر سوار ہونے سے پیشتر فوت ہو گئے۔ بعد ازاں مولانا کے والد تنہا حجاز گئے اور معلوم ہے کہ ۱۸۹۸ء تک وہیں رہے۔

ملجا بن گیا تھا۔ موسم اور مزید فوجی طیّاریوں کے اہتمام نے چھ سات ماہ کی مہلت پیدا کر دی تھی۔ اس عرصے میں تمام انقلابی فوجیں اس طرف کا رُخ کر تی رہیں۔ نومبر ۱۸۵۸ء میں کمانڈر انچیف نے الہ آباد سے کوچ کیا اور اندرونِ اودھ کے تمام علاقوں کو مسخر کرتے ہوئے جنوری میں گورکھپور پہنچ گیا۔ یہاں نانا راؤ، تفضّل حسین اور حضرت محل کی متحدہ فوج سے ایک فیصلہ کن مقابلہ ہوا۔ متحدہ فوج شکست کھا کر ترائی کے علاقے میں ہٹ گئی۔ اس موقع پر تفضّل حسین خاں نے مایوس ہو کر ہتھیار رکھ دیے تھے۔ "ٹائمز" لندن کا نامہ نگار رسل اس موقع پر موجود تھا، جب تفضّل حسین کمانڈر انچیف کے خیمہ میں آئے۔ وہ لکھتا ہے، اس موقع کو دیکھ کر یہ باور کرنا نگاہوں کے لیے دشوار تھا کہ یہی شخص کل تک ہماری فوجوں سے نبرد آزمائی کر رہا تھا!

" لسان الصّدق" کے پرچے بڑی شکل سے ملینگے۔ نہیں معلوم کس ڈھیر میں پڑے ہیں[1]۔

منشی عبدالکریم کی تاریخ رجسٹرڈ بھیجی جارہی ہے، بہ احتیاط واپس کر دیجیے گا[2]۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

---

[1] مجھے "لسان الصّدق" (مولانا کا پہلا اخبار) کے چند پرچے مل گئے تھے، چاہتا تھا کہ فائل مکمل کر یوں۔ مولانا سے ذکر کیا تو انھوں نے باقی پرچے مہیّا کر دینے کا وعدہ فرمایا۔ خط لکھا تو یہ جواب ملا۔

[2] منشی عبدالکریم کی "تاریخ پنجاب" مجھے پرانی کتابوں کے ایک انبار سے مل گئی تھی اور مولانا کی کتاب میں نے جلد واپس کر دی تھی۔

(۹۲)

۷ اپریل ۱۹۳۰ء

عزیزی،

خط پہنچا اور یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ آپ نے میرے خط کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ایک چیز عقائد و مسائل کا اختلاف ہے، ایک شخصی دیانت و عدم دیانت کا مسئلہ یقیناً ایک شخص سے عقائد و مسائل میں سخت اختلاف رکھتے ہوئے بھی اخلاص و محبت رکھ سکتے ہیں اور یہ اخلاص اس سے مانع نہیں ہو سکتا کہ اس کے عقائد و مسائل پر سخت سے سخت نکتہ چینی کریں۔ امام بخاری نے عبدالرزاق کی نسبت کہا تھا: لوارتد عبدالرزاق اگرچہ عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائے، جب بھی میں اس کی دیانت میں شک نہیں کرونگا۔ لیکن اگر آپ کے سامنے ایسی باتیں آئی ہیں کہ آپ کو اس کی دیانت میں اعتماد نہیں رہا اور اختلاف صرف عقائد و مسائل ہی سے نہیں ہے بلکہ شخصی اخلاق و خصائل سے ہے، تو اس صورت میں آپ اس سے اخلاص و محبت نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ اب کوئی چیز باقی نہیں رہی، جس کے لیے اخلاص ابھر سکے، جس شخص کے اخلاق و خصائل پر آپ کو اعتماد نہیں رہا، آپ بغیر مداہنت و نفاق کے کیونکر اس سے اخلاص و محبت رکھ سکتے ہیں؟

ایک شخص کی غیر معمولی قابلیت اور دماغی محاسن کا ہم پر اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ جاننے پر بھی کہ وہ اخلاق و فضائل سے محروم ہے ہم یہ تاثر دل سے نہیں نکال سکتے۔ لیکن اس طرح کے تاثر کو دوسرے ناموں سے پکارنا چاہیے۔ یہ "اخلاص" اور "محبت" سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

لاہور سے جو کٹنگ انقلاب کا آیا تھا، وہ اُس کے لیڈنگ آرٹیکل کا تھا۔ ابھی اس بحث میں نہ جایئے کہ میں نے تقریر میں کیا کہا تھا؟ ۔ تقریر ہزاروں مسلمانوں نے سُنی تھی اور اُن سے دریافت کیا جاسکتا تھا کہ اصلیت کیا ہے ۔ بہرحال کسی وجہ سے آپ کو یقین ہوگیا کہ میں نے مسلمانوں پر افترا کیا اور اس درجہ یقین ہوگیا کہ مضمون کی سرخی یہی قرار دی گئی ۔ نیز جو آیت واقعۂ افک کی نسبت نازل ہوئی ہے، وہ میری نسبت لکھنی پڑی کہ سُبحانك هٰذا بُهتان عظیم

اب سوال یہ نہیں ہے کہ آپ نے میرے عقیدہ و مسلک سے اختلاف کیا بلکہ آپ کے سامنے میرے اخلاق و خصائل کا ایک بدترین پہلو نمایاں ہوگیا ۔ میں نہ صرف ایک فردِ واحد، بلکہ تمام مسلمانوں پر، بہتان لگانے کی جرأت کر سکتا ہوں ۔ ایسی حالت میں مجھے کیا سمجھنا تھا؟ کیا ایک لمحہ کے لیے یہ توقع جائز ہوسکتی تھی کہ آپ بدستور اخلاص و محبت رکھینگے ۔ یقیناً مجھے یہی سمجھ لینا تھا کہ اس معاملے کے بعد آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اگر کرینگے، تو مداہنت ہوگی اور نفاق ۔ کیونکہ میں خود آپ کو اس مخمصے سے نجات دلادوں ۔ چنانچہ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو میں نے یہی الفاظ اُس خط میں لکھے تھے۔ میں آپ کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا، اگر سمجھتا کہ اب بھی آپ محبت و اخلاص رکھ سکتے ہیں ۔ اگر میں ایسی توقع رکھتا، تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے تھے ۔ میں آپ کو منافق تصوّر کرتا ۔ میں آپ کو ایسا کبھی نہیں تصوّر کر سکتا ۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں، اس لیے میں نے محسوس کیا کہ اب آپ اپنے کو مخمصے میں مبتلا پاتے ہونگے ۔ میں کیوں اسے برداشت کروں کہ ایک شخص، جسے اپنا عزیز سمجھتا رہا ہوں، اس مخمصے میں مبتلا رہے ! مجھے فوراً اس کی راہ کھول دینی چاہیے ۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مضمون آپ کا نہیں ہے'۔۔۔ اب آپ نے لکھا تو صورت حال معلوم ہوئی۔ اگر آپ کا ایسا خیال نہیں ہے کہ میں نے مسلمانوں پر افترا کیا، تو ظاہر ہے کہ آپ کے لیے اس مخمصے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ آپ یقیناً مجھ سے اخلاص و محبّت اب بھی رکھ سکتے ہیں، جیسا کہ ہمیشہ رکھتے آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔۔۔۔۔
آپ نے "تاریخ پنجاب" مانگی تھی، جو بھجوادی گئی تھی۔ اس کی رسید نہیں ملی۔ جب کام پورا ہو جائے تو بھیج دیں۔

والسّلام علیکم

ابو الکلام

(۹۳)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی
سوراج بھون۔ الٰہ آباد۔ کلکتہ

۲۸ جون ۱۹۴۲ء

عزیزی،
"اُمّ القرآن" میں کچھ اور کمی بیشی کرنی تھی، اس لیے اتنا وقت نکل گیا۔ اب میں طباعت کے لیے آپ کو بھیج سکتا ہوں۔ کتابت میں خوش نویس کو آسانی ہوگی کیونکہ بڑا حصّہ مطبوعہ ہے۔ کتابت کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ پنجاب کی تعلیمی کتابوں کی طرح لفظ الگ الگ لکھے جائیں اور پنکچوایشن کا صحت کے ساتھ التزام رہے۔ جا بجا قرآن کی آیات آگئی ہیں، اس لیے نسخ کا بھی بہترین خوش نویس مطلوب ہوگا۔ اُمّید ہے سالک صاحب

بخیریت ہونگے [۱]

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۹۴)

بمبئی

۲۲ جون ۱۹۴۵ء

عزیزی،

زندہ ہوں اور پھر دنیا میں واپس آ گیا ہوں، معلوم نہیں جو کچھ دیکھ رہا تھا، خواب تھا، یا اب جو کچھ دیکھ رہا ہوں، خواب ہے۔

بیداری میان دو خواب است ہستیم

گرد تخیل دو سراب است ہستیم [۸۲]

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہونگے۔ سالک کو دعا و خیر پہنچا دیں۔

---

[۱] اس سے تھوڑی دیر بعد مولانا بمبئی میں گرفتار ہوئے اور انھیں احمد نگر کے قلعے میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں قریباً تین برس کامل انقطاع کی حالت میں گزارے۔ تقسیم کے بعد میں دلی گیا اور "اُم القرآن" کا ذکر کیا، تو فرمایا کہ اس میں مزید اضافے کرنے ہیں اور "حجت ابراہیمی" پر ایک مضمون الہلال (دور ثانی) کے چار نمبروں میں شائع ہوا تھا، وہ مل جائے تو "اُم القرآن" مکمل ہو جائے۔ اُن کے پاس "الہلال" کا کوئی پرچہ نہ تھا۔ میں نے لاہور پہنچ کر "حجت ابراہیمی" کا مضمون تیئیس فل اسکیپ اوراق پر نقل کرا کے بھیج دیا۔ پھر حکم آیا کہ اصل بھیجو میں اپنا فائل دے سکتا تھا۔ بڑی تلاش کے بعد دس پرچوں کا ایک مجموعہ ملا۔ جن میں وہ چار پرچے بھی تھے۔ چنانچہ وہ خرید کر بھجوا دیے۔ لیکن جون ۱۹۵۵ء تک وہ اس مضمون کو اُم القرآن میں شامل نہ کر سکے تھے۔

یہ خط ایک خاص ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ مُرادآباد کے ایک خوشنویس عبدالقیوم[۸۳] ہیں اور معلوم ہوا ہے وہاں کوئی "زمزم" پریس ہے، وہاں مقیم ہیں۔ انھیں میرا یہ پیغام پہنچا دیجیے کہ مجھے تھوڑا سا کام ان سے فوراً لینا ہے۔ میری نقل و حرکت انھیں اخبارات سے معلوم ہوتی رہیگی۔ جونہی میں شملہ سے واپس ہونے والا ہوں، دہلی پہنچ کر مجھ سے مل لیں۔

یہ بات صاف کر دیجیے گا کہ سر دست "ترجمان" کے لیے نہیں بلا رہا ہوں، بعض اور مختصر چیزیں ہیں، جو انھیں دینی ہیں۔ مجھ سے مل کر کام کی نوعیّت سمجھ لیں۔ انھیں خرچ کی ضرورت ہو، تو میری جانب سے بلا تامّل دے دیں۔ میں آپ کو بھیج دونگا۔[۱]

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۹۵)

وائسراے لاج۔ شملہ

۲۶ جون ۱۹۴۵ء

عزیزی

بمبئی سے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اسی سلسلے میں اب پھر لکھ رہا ہوں منشی عبدالقیوم مرادآبادی کو میں نے دہلی بلایا تھا لیکن چونکہ یہاں قیام کی مدّت اب بڑھ

---

[۱] احمدنگر سے رہائی کے بعد یہ پہلا مکتوب ہے منشی عبدالقیوم وہی خوشنویس تھے جنھوں نے "ترجمان جلد دوم" کی کتابت کی تھی میں نے حسب ارشاد پتہ لیا، تو معلوم ہوا کہ وہ مرادآباد میں ہیں اور مولانا کو شملہ اطلاع بھجوادی۔

گئی ہے، اس لیے وہ یہیں آ کر مجھ سے مل لیں، روانگی میں تاخیر نہ کریں۔

والسلام

ابوالکلام

(۹۶)

وائسرائے لاج

۲۷ جون ۱۹۴۵ء

عزیزی،

خط لکھ چکا تھا کہ آپ کا خط ملا۔ منشی عبدالقیّوم اگر مرادآباد میں ہیں، تو شاید وہ شملہ آ کر نہ مل سکیں۔ بہرحال "زمزم" سے ان کا پتہ دریافت کر کے مجھے لکھ دیجیے، تاکہ جونہی موقعہ ملے انھیں بُلوا لوں۔

سردست دہلی جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ غالباً چند دن اور شملہ ہی میں ٹھہرنا پڑے۔ اگر آپ یہاں آ سکتے تو ملاقات ہو جاتی۔ بہرحال آئندہ کوئی نہ کوئی موقعہ نکل آئیگا۔

والسلام ابوالکلام

(۹۷)

وائسرائے لاج

۱ جولائی ۴۵ء

عزیزی!

خدا ملا، شملہ کا قیام ممتد ہو گیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا۔ ہاں اسکے بعد

تک اب قیام متعین ہے۔ منشی عبدالقیوم کو یہیں بلا رہا ہوں۔
اس سفر کے سلسلے میں ممکن نہ ہوگا کہ پنجاب کے لیے وقت نکالوں۔ جونہی یہاں کے معاملات سے فارغ ہوا، کوشش کرونگا کہ چند دنوں کے لیے کسی گوشے میں جا کر آرام کر سکوں۔ اگرچہ زندگی میں آرام کہاں؟

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
ما زندہ از انیم کہ آرام نہ گیریم[۸۴]

والسّلام علیکم، عزیزی سالک صاحب کو دعاء خیر

ابوالکلام

(۹۸)

۱۹ اے، بالی گنج، سرکلر روڈ
کلکتہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۵ء

عزیزی،
آپ حق بجانب ہیں مگر عرفت ربّی بفسخ العزائم[۸۵] کانگریس کی صدارت ایک سال کے لیے تھی، کسے معلوم تھا کہ جنگ کی وجہ سے غیر متوقع حالات رُونما ہونگے اور پانچ سال نکل جائینگے۔ بہرحال اب امید ہے غالباً اپریل میں سالانہ جلسہ ہو، اور کم از کم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکوں[۱]۔
"غبارِ خاطر" کی کاپیوں میں معمولی غلطیاں رہ گئی ہونگی انھیں درست کر دیجیے۔

---

[۱] میں نے عرض کیا تھا کہ دیکھیے علیٰحدگی کا فیصلہ فرما چکنے کے بعد کتنی مدت ضائع ہوگئی۔ اور اصل کام شروع نہ ہو سکا۔

باقی رہے دریافت طلب اُمور، تو انھیں بہ ترتیب لکھتا ہوں۔[1]

(۱) موٹر کا لفظ میری زبان پر مونث ہی چڑھا ہوا ہے اور مجھے کبھی اس میں شک نہیں ہوا۔

(۲) فارسی میں صحیح املا "نہ بہرام و نہ گورش" ہی ہوگا، لیکن سہولتِ تلفظ کے لیے "نے" کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔[2]

(۳) "دونوں زندگیوں کے مرقع کی الگ الگ روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے" ٹھیک ہے نقش آرائی اگر پہلے آئیگا تو نحو کے لحاظ سے صحیح ہوگا مگر محاورے کے لحاظ سے ہمزہ ہو جائیگا۔[3]

(۴) "کوٹھڑی" کو کوٹھری" لکھنا منشی عبدالقیوم کا رسم الخط ہے، میرا نہیں ہے، اسے درست کر دیجیے۔ لیکن اگر بہت سے مقام پر ہے، تو چھوڑ دیجیے۔ کثرتِ تصحیح کاپی کو خراب کر دیتی ہے۔

(۵) اگر آپ کا مقصد مکڑی یعنی عنکبوت سے ہے تو وہ یقیناً "ڑ" سے ہے "ر" سے نہیں ہے "ر" پر "ط" بنا دیجیے۔

(۶) دولت خان لودھی کا مقولہ محض حافظے سے لکھا ہے لیکن اس میں

---

[1] "غبارِ خاطر" لاہور میں چھپ رہی تھی مجھے بعض امور کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑی، مثلاً موٹر مذکر استعمال ہوتا ہے اور مولانا نے مونث استعمال کیا تھا۔ ۸۶

[2] میں نے عرض کیا تھا کہ "نہ بہرام ست و نہ گورش" میں آخری "نہ" کو "نے" بنا دیا جائے یا بجنسہٖ قائم رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر "نے" استعمال ہوتا تھا اور اس کے بغیر شعر کا وزن ٹھیک نہیں رہتا تھا۔

[3] میری گزارش تھی کہ نقش آرائی کو الگ الگ سے پہلے آنا چاہیے۔

"فتح آسمانی" ہی ہے یعنی ایسی حالت ہے کہ سروسامان کی بناء پر فتح کی امید نہیں کی جاسکتی، آسمان کی مدد ہی سے ہو، تو ہو۔

"آسمان نے" ہرگز نہیں ہوسکتا جس لفظ نے پورے جملے میں زور پیدا کیا ہے، آپ اسی کو نکال دینا چاہتے ہیں۔ یہ کیا قیامت کرتے ہیں[1]

بقیہ کاپیاں بھی تصحیح کرکے منشی عبدالقیوم کو بھیج دی ہیں۔ امید ہے کہ وہ بہت جلد آپ کو بھیج دینگے۔ روپیہ کی طلبی میں ہرگز تامل نہ کیجیے گا۔ جب لکھیے بھیج دونگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس مخلصانہ خدمت کے لیے جزائے خیر دے۔ سالک صاحب کو دعائے خیر۔ ہاں، طباعت کے بارے میں جو عزیز آپ کے ساتھ آتے رہے اور جنھوں نے کاغذ کا اہتمام کیا ہے، میں ان کا نام بھول گیا ہوں، انھیں دعائے خیر پہنچایئے اور ان کا نام یاد دلا دیجیے[2]

اگرچہ دماغ مطمئن تھا خیال ہوا، برسوں کی بات ہے اصل مقام نکال کر دیکھ لوں۔ چنانچہ مآثرالامراء میں یہ مقام مل گیا اور دولت خان لودھی کا مقولہ ٹھیک ٹھیک وہی نکلا جو حافظہ میں محفوظ رہ گیا تھا۔ طبیعت خوش ہوئی کہ تیس برس تک دماغ نے اس مقولہ کی پوری محافظت کی تھی اور ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا۔

والسلام علیکم　　　ابوالکلام

---

[1] میرے نزدیک اس فقرہ میں "فتح آسمانی" عام فارسی محاورے کے مطابق نہ تھا لہٰذا عرض کیا کہ غالباً اصل الفاظ "فتح آسمان نے" ہوں۔ چونکہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بعض کتابوں کے مصححین اکثر غلطیاں کرتے رہے ہیں۔ اس لیے خیال تھا کہ "مآثرالامرا" کی یہ عبارت بھی صحیح نہ پڑھی گئی ہو۔ مولانا نے "فتح آسمانی" ہی کو درست قرار دیا اور یہ بھی فرمایا کہ مآثرالامراء میں یوں ہی ہے۔

[2] یہ مولوی محمد احمد صاحب تھے۔

(۹۹)

۱۹-اے بالی گنج، سرکلر روڈ
کلکتہ ۲۹ اکتوبر

عزیزی،

خط موصول ہوا، تفصیلی جواب متعاقب روانہ ہوگا۔ سردست چند ضروری باتیں لکھنی ہیں:

۱۔ "غبارِ خاطر" پانچ ہزار ایک سو کی تعداد میں چھپیگی۔ اس غرض سے کہ کچھ کاغذ ردی ہو جاتے ہیں۔ فی ہزار ایک دستہ زیادہ رکھ لیا جاتا ہے۔ یا جیسا آپ مناسب سمجھیں۔

۲۔ کاپیاں سب آپ کے پاس چلی گئیں۔ اس لیے فہرست کی ترتیب کے لیے صفحات مطلوب ہیں۔ اتنی زحمت برداشت کیجیے کہ ہر مکتوب کی تاریخ اور نمبر صفحہ لکھ کر بھیج دیجیے۔ مثلاً:

مکتوب ۱۰۔ اگست ۴۲ صفحہ۔۔۔

۳۔ ہر کاپی جو چھپ جائے، اس کا ایک فرما بھیجتے رہیے۔

آپ اور محمد احمد صاحب جس قدر زحمت میری خاطر اُٹھا رہے ہیں، اس کا مجھے پورا احساس ہے۔ احمد صاحب کا خط بھی مجھے مل چکا ہے۔ شکر گزار ہوں۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۰۰)

کلکتہ

۲۰ دسمبر ۱۹۴۵ء

عزیزی،

اگر میں صحت کی کمزوری اور اشغال کے ہجوم سے مجبور ہو گیا تھا تو آپ کو تو بالکل خاموش ہو نہیں بیٹھنا تھا! کچھ نہیں معلوم کہ کاپیوں کا کیا حشر ہوا۔ میں نے کہا تھا جو نہی فارم چھپنا شروع ہوں، مجھے ایک ایک کاپی بھیجتے رہیے۔ لیکن ابھی تک ان کی صورت نظر نہیں آئی۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ کی جانب سے عمداً تغافل نہیں ہوا ہوگا۔ اگر تمام کاپیاں جمائی جا چکی ہیں اور فارم چھپ چکے ہیں تو ایک ایک فارم بلا تاخیر بھیج دیجیے۔

اب کتاب کی تکمیل میں صرف تین مکاتیب کی کتابت مزید مطلوب ہے۔ وہ اس خط کے ہمراہ مرسل ہیں۔ جس خوشنویس کا آپ نے ذکر کیا تھا کہ وہ لاہور کے موجودہ کاتبوں میں بہتر درجہ کا تسلیم کیا جاتا ہے، اس سے یہ مکاتیب جلد لکھوا لیجیے، اور خود تصحیح کر کے چھپنے کے لیے دے دیجیے، کہ کتاب مکمل ہو جائے۔

اس کے بعد صرف دیباچہ رہ جائیگا۔ اس کا مسودہ متعاقب بھیجتا ہوں۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

۱۰۱

۲ ونڈسر پیلس، دہلی

عزیزی،

دہلی پہنچتے ہی خط ملا، چھپائی کی تاخیر نے طبیعت کو بے کیف کر دیا ہے۔ جی نہیں چاہتا کہ کچھ لکھوں یا چھپواؤں۔ آپ نے صرف ایک فارم بھیجا ہے، وہی میرے علم میں مطبوعہ ہے۔ اس سے زیادہ ایک ورق بھی اس وقت تک مجھے نہیں ملا۔ پریس والوں کا حال معلوم ہے۔ لیکن توقع یہ تھی کہ آپ کی جانب سے سرگرمی جاری رہیگی۔ دیباچہ فائل میں پڑا ہے لیکن کچھ چھپے ہوئے فارم ملیں تو بھیجوں، کاپیاں لکھوانے سے فائدہ کیا؟

میں ۲۵ تک دہلی ہی میں رہونگا۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۰۲)

بندھیاچل (ضلع مرزاپور

۴ جنوری ۴۶ء

عزیزی،

کلکتہ سے ایک رجسٹرڈ خط مع مسودات کے بھیج چکا ہوں۔ آپ کی خاموشی تعجب انگیز ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ "غبارِ خاطر" کی کاپیاں چھپی یا نہیں؟ میں نے آپ پر اعتماد کیا تھا۔ اُمید ہے آپ کی جانب سے دانستہ تغافل عمل میں نہیں آئیگا مجھے بلا تاخیر صورتِ حال سے مطلع کیجیے۔ میں ۱۵ جنوری تک یہیں بندھیاچل میں مقیم رہونگا

ابوالکلام

(۱۰۳)

ل انڈیا کانگرس کمیٹی

ورا ج بھون، الہ آباد

ندھیاچل (مرزا پور) ۲۰ جنوری ۴۶ء

عزیزی،

غبارِ خاطر" کا بہت تھوڑا حصّہ باقی ہے، مطمئن رہیے۔ بقیہ کاپیاں جلد
یج جائینگی۔

ا معین واعظ کاشفی، ملا محمد حسین صاحب تفسیرِ حسینی سے مختلف شخصیت ہے،
ران سے مقدّم ہے۔ ملا معین نے سیرۃ میں "معارج النبوۃ" لکھی ہے
ر تفسیر میں "نقرہ کار" دونوں متداول ہیں۔ پس یہ نام بجنسہٖ رہنے دیجیے،
ں میں کتابت کی کوئی غلطی نہیں ہے[1]

ں بیماری سے لڑتا رہا، لیکن اب اعترافِ شکست کے سوا چارہ نہیں۔ پرسوں
رھیاچل کا قصد کر رہا ہوں۔ ایک غیر آباد مقام ہے اور آب و ہوا کے
ظ سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کئی ڈاکٹروں نے اس پر زور دیا۔ مسودات
تھ لے جا رہا ہوں۔ تنہائی سب سے بڑی نعمت ہے، جس کا تشنہ ہوں، امید
، کہ وہاں ہاتھ آئے۔ آپ کو جو رسالہ کتابت کے لیے بھیجنا تھا، وہ انشاء اللہ
ل سے بھیجونگا، کیونکہ اس کے بعض اجزا میں مزید اضافے کرنے ہیں، جو

یں ملا معین واعظ کاشفی سے بالکل بےخبر تھا اور صرف ملا حسین واعظ کاشفی سے
ہ تھا۔ لہٰذا مولانا کی تحریر دیکھ کر خیال ہوا کہ ممکن ہے نام صحیح نہ لکھا ہو۔ مقصود
ب یہ تھا کہ مولانا کو اطلاع ہو جائے اور اپنے لیے اطمینان مطلوب تھا۔

رہائی کے بعد مطالعۂ کتب سے سامنے آئے۔ جب احمد نگر میں قلمبند ہوا تھا، تو حافظ کے سوا کوئی چیز سامنے نہ تھی۔

"ترجمان" حصۂ سوم کی نسبت منشی عبدالقیّوم نے جو کچھ کہا تھا، وہ ان کا ذاتی خیال ہوگا۔[1] میں تو انھیں بندھیاچل بلا رہا ہوں، تاکہ اس کام میں لگا دوں۔ جواب بندھیاچل ضلع مرزاپور کے پتے سے بھیجیے۔ بندھیاچل ریلوے اسٹیشن کے پاس پوسٹ آفس ہے اور اس سے انتظام ڈاک کا کرلیا گیا ہے۔

والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۱۰۴)

۲ ونڈسر پیلس، نئی دہلی

مکرمی، تسلیم

مہر صاحب کا خط حضرت مولانا کے نام آیا تھا کہ وہ دو تین دن کے لیے باہر جارہے ہیں۔[2]

اُن کو اطلاع دے دیجیے گا کہ کتاب کی قیمت جو مقرر ہوچکی، وہ ہوچکی، اب زیادہ نہ ہوگی۔

اس کے علاوہ سَو جلدیں کسی شخص کے ہاتھ مولانا کے پاس مسٹر آصف علی

---

[1] منشی عبدالقیّوم نے کسی سے ذکر کیا تھا کہ "ترجمان" جلد سوم ابھی تیار نہیں ہوئی

[2] یہ خط خان محمد اجمل خان کے پرائیوٹ سکریٹری نے سالک صاحب کو لکھا تھا، اس لیے کہ میں لاہور سے باہر چلا گیا تھا۔

کے مکان واقع مندرجہ بالا پر روانہ فرما دیجیے۔ ریل سے نہ بھیجیے۔ اُمید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

(۱۰۵)

دہلی ۲۰ جنوری ۴۶ء

عزیزی،

جب چھپائی کا یہ حال ہے تو لکھنا بیسود ہے، لاہور میں آپ کی اور محمد احمد صاحب کی عزیزانہ سرگرمیوں نے طبیعت میں نئی اُمنگیں پیدا کر دی تھیں۔ لیکن اب ان کی جگہ افسردگی نے گھر بنا لیا ہے۔ اوائل اکتوبر میں ۱۷ کاپیاں آپ کے حوالے کی گئیں۔ آج ۲۰ جنوری ہے اور ایک فارم سے زیادہ وجود پذیر نہیں ہو سکا ہے!

عجب نہیں، کاغذ کے معاملے میں روپے کا سوال اُٹھا ہو۔ میں نے بار بار آپ سے کہا کہ میں روپیہ بھیج دے سکتا ہوں، لیکن آپ نے اور محمد احمد صاحب نے بہ اصرار انکار کیا، اور کہا بعد کو لے لیا جائیگا۔ اب کم از کم یہی کیجیے کہ کاپیاں واپس کر دیجیے کہ کوئی اور انتظام کیا جائے۔ بہرحال آپ کا شکر گزار ہوں[1]۔

والسلام علیکم ابوالکلام

---

[1] کاغذ یا روپے کا سوال نہ تھا۔ چھپائی مولوی محمد احمد صاحب نے اپنے ذمّے لے لی تھی اور بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اس میں غیر معمولی تاخیر ہوگئی۔ اس تاخیر میں مولانا نے جو تاثرات قبول کیے، ندامت سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ وہ بالکل درست تھے۔

(۱۰۶)

تار کا ترجمہ

۲۵ جنوری ۴۶ء

(نئی دہلی سے)

چودھری غلام رسول مہر، انقلاب۔ لاہور

مہربانی فرما کر تمام چھپے ہوئے فرمے دہلی بھیج دیجیے۔[1]

ابوالکلام آزاد

(۱۰۷)

دہلی ۳۰ جنوری ۴۶ء

عزیزی،

پانچ فارم مع پہلے فارم کے جو آ چکا تھا، وصول ہوئے۔ ۴۴ صفحے پر ختم ہونے والے فارم کے بعد ۶۵ والا ہونا چاہیے، مگر وہ غائب ہے۔ صفحہ ۸۱ والا فارم اس کے بعد آیا ہے۔ معلوم نہیں وہ کاپی ابھی جمی نہیں، یا غلطی سے فارم بھیجنے سے رہ گیا۔ پہلا فارم اگرچہ بالکل صاف نہیں چھپا تھا، تاہم غنیمت تھا، لیکن اب جو فارم آئے ہیں انھیں دیکھ کر نئی کوفت ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاح سنگ کا کام بالکل نہیں ہوا۔ جیسی کاپی جمی تھی، اس پر چھپائی شروع کر دی۔ جا بجا حروف ناقص ہیں۔ دوائر درستگی سے رہ گئے ہیں، اور بعض حروف

---

[1] مراد ہے غبارِ خاطر کے فرمے۔

سیاہی کا دھبّا بن گئے۔ اکثر سطریں داغدار اور چھلنی ہیں۔ غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ بہر حال آپ کو جو درد سر کرنی پڑی، اس کے لیے شکر گزار ہوں[1] ۔ دیباچہ عنقریب پہنچ جائیگا۔

والسّلام علیکم
ابوالکلام

(۱۰۸)

دہلی۔ یکم فروری ۱۹۴۶ء

عزیزی،

۳۱ کا خط ابھی ملا، اپنی صحت کی کہانی آپ کو کیا سناؤں؟

گہے از دست و گاہے از دل و گاہے زپا مانم
بسرعت می روی اے عمر! می ترسم کہ وا مانم [88]

کل صبح کراچی جا رہا ہوں۔ غالباً ۵ کو کلکتہ واپس ہوں، اور فوراً شیلانگ کے لیے روانہ ہو جاؤں۔ اس لیے بقیّہ فارم کلکتہ ہی کے پتہ سے بھیجیے۔ ۵ یا ۶ کو وہاں پہنچونگا تو مل جائینگے۔ دیباچہ وغیرہ کل کراچی سے روانہ کرونگا۔ وہاں ایک بجے پہنچ جاؤنگا۔ ہوائی جہاز سے سفر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ آدمی بہ اطمینانِ تمام لکھ سکتا ہے۔ کان بیکار ہو جاتے ہیں، اس لیے آنکھیں پوری یکسوئی کے ساتھ کام کرنے لگتی ہیں۔ والسّلام علیکم۔

ابوالکلام

---

[1] بلاشبہہ چھپائی توقّع اور امید کے خلاف اچھّی نہ تھی، اس وجہ سے مولانا بہت متألم ہوئے۔ مگر دیکھیے کہ اس اہتمام کے لیے بھی شائستہ اعتراف تھا۔ زبانِ قلم پر شکریے کے الفاظ ہیں۔

(۱۰۹)

دہلی ۱۱۔مارچ ۱۹۴۶ء

عزیزمی

"غبارِ خاطر" کا دیباچہ وغیرہ بھیجتا ہوں۔ یہ سابق اندازے سے بڑھ گیا ہے۔ اب آپ کی مستعدی و آمادگی کی آزمائش ہے۔ اگر جلد اور صحت کے ساتھ یہ چھپ گیا تو پھر میں اپنے تمام مسودات آپ کے حوالے کر دونگا۔ نہ ہوسکا، تو سمجھونگا کہ میری محرومی کا علاج نہیں۔

"غبارِ خاطر" کے آخری اوراق جس کاتب نے لکھے ہیں، وہ بہت ہی بدخط ہے۔ خدا کے لیے، اُس سے نہ لکھوائیے۔ زیادہ سے زیادہ اُجرت دینے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن سب سے بہتر خوشنویس ہو، اس سے لکھوائیے۔ اور خدارا جلد لکھوائیے۔ محمد احمد صاحب سے کہیے کہ آپ نے پشاور میں مجھے جو اعتماد دلایا تھا، اس پر میں نے بھروسا کیا ہے، اُمید ہے کہ ویسا ہی ہوگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

(۱۱۰)

۸۹ وارڈن روڈ

بمبئی ۱۳ مارچ ۴۶ء

مکرمی مہر صاحب

تسلیم

جو مسودہ میں نے دہلی سے رجسٹرڈ روانہ کیا ہے، امید ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ اس میں

جو تمہید میں نے لکھی ہے، اس کے آخر میں دستخط سے پہلے جو آخری جملے ہیں، ان کی اصلاح یوں کر دیجیے:

مگر دراصل یہ "بے ستون" نہیں ہے، "بہستون (بہستان یا باغستان) ہے۔ فارسی قدیم میں "باغ" خدا یا دیوتا کو کہتے تھے، یعنی یہ مقام "خداؤں کی جگہ" ہے[1]

محمد اجمل خان

(۱۱۱)

بمبئی ۱۴ مارچ ۴۶ء

عزیزی

۱۱ کو دہلی سے دیباچہ وغیرہ کا مسودہ رجسٹرڈ بھیج چکا ہوں اب غلط نامہ بھیجتا ہوں۔ یہ غلط نامہ لوح کے بعد رکھا جائے اس کے بعد فہرست ہو گی۔

چونکہ کتاب کے تمام نسخے مجلّد فروخت ہوں گے، اس لیے ٹائیٹل پیج اس طرح کا چھپوانا چاہیے جو جلد کے اوپر کے کور کا کام دے، جیسا کہ عام طور پر انگریزی کتابوں کا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کاغذ کسی قدر دبیز رکھنا پڑیگا اور اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ دونوں طرف اس کے اطراف جلد کے اندر تک چلے جائیں۔

فہرست کے بعد پھر ایک سادہ لوح رکھی گئی ہے جس پر صرف "غبارِ خاطر" متوسط قلم سے لکھا جائیگا۔ لوح کی طرح زیادہ جلی نہ ہوگا۔

اب بنیادی باتیں تین ہیں:

(۱) خوشنویس بہتر سے بہتر ہو۔ آخر کے اوراق آپ نے جس سے لکھوائے ہیں،

---

[1] یہ گرامی نامہ خان محمد اجمل خان کی طرف سے تھا لیکن "غبارِ خاطر" ہی کے سلسلے میں تھا اور ظاہر ہے کہ مولانا کے ایما پر تحریر ہوا۔

وہ بدخط ہے۔ خدارا اس سے نہ لکھوائیے۔

(۲) جلد کام ہونا چاہیے، یعنی کتابت بھی اور طباعت بھی۔

(۳) کاپیاں اور پروفوں کی صحت۔ اس بارے میں طبیعت بہت اندیشہ ناک ہے اور اگر میرے اندیشے بجا ثابت ہوئے، تو پھر میری خوش اعتمادیوں کا ایک نیا دور شروع ہو جائیگا۔

تصیح اس طرح نہیں ہو سکتی کہ بغیر اصل مسودے سے مقابلے کے، محض کاپیاں پڑھ لی گئیں، اور جو بات غلط معلوم ہوئی، کاٹ دی۔ اس کا نتیجہ وہی نکلیگا جو نکل چکا ہے۔ یعنی "صبح چار بجے کا وقت نہیں ہے" کی جگہ "چار بجے کا وقت ہے" بنا دیا جائیگا۔ یا خود اپنے ظن وقیاس سے نئی نئی اصلاحات عمل میں آئینگی اور تصیح کی جگہ مزید تخریب ہو جائیگی۔ تصیح کا اعلا طریقہ ایک ہی ہے، یعنی دو آدمی وقت دیں۔ ایک اصل مسودہ سامنے رکھے، دوسرا کاپی پڑھتا جائے۔ تصیح سے مقصد یہ ہے کہ کاپیوں کو اصل مسودے کے مطابق کر دینا اور بس۔ مصحّح کا فرض تصیح ہے، اصلاح وترمیم نہیں ہے۔

اگر ایک مقام مصحّح کو غلط معلوم ہو، مگر اصل مسودہ میں ایسا ہی ہے، تو وہ غلطی چھوڑ دینی چاہیے۔ اس کی ذمّہ داری مصحّح پر نہیں عائد ہوگی، مصنّف پر ہوگی۔

میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ جیسا کچھ مسودہ ہے، ٹھیک ٹھیک اس کے مطابق کاپیاں درست کر دی جائیں۔ اگر مسودہ میں غلطیاں ہیں، تو غلطیاں ہی چھپنی چاہئیں۔[۱]

[۱] کاتب مولوی محمد احمد صاحب نے تجویز کیے تھے اور چھپائی بھی وہ اپنے اہتمام میں کراتے

مجھے اُمید ہے کہ آپ اور محمد احمد صاحب اس بارے میں جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کرینگے اور چھپائی کے بعد مجھے پریشانی اور کوفت نہ ہوگی، لیکن اگر آپ تصحیح کے معاملے کے لیے پورا وقت نہیں نکال سکتے، یا مطمئن ہو کر ذمہ داری نہیں لے سکتے، تو پھر میں مزید تاخیر گوارا کر لونگا اور درخواست کرونگا کہ کاپیاں مجھے تصحیح کے لیے بھیج دی جائیں۔ دیر ہو گی، تو ہو، لیکن عبارتیں خبط و مسخ تو نہیں ہو جائینگی۔

میں یہاں سے کلکتہ جاؤنگا اور پھر غالباً ۲۵ کو دہلی جاؤں۔ آپ یوں کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی کے ہاتھ کاپیاں دہلی بھیج دیں۔ میں تصحیح کر کے اس آدمی کے ہاتھ واپس بھیج دونگا۔ مصارف میرے ذمّہ ہونگے۔

سخت مشغولیت کے اوقات میں بھی صبح کا وقت نکال لیتا ہوں، اور اپنا تھوڑا بہت دماغی کام کر لیا کرتا ہوں۔

محمد احمد صاحب اور سالکؔ صاحب کو دعا خیر

والسّلام علیکم

ہاں، لاہور میں آخری صفحات کی کاپی محمد احمد صاحب نے دی تھی، وہ میرے پاس رہ گئی، اب اسے بھی بھیجتا ہوں۔ یہ آخری چوصفحہ تو الگ ہی چھپیگا۔ کیونکہ دیباچہ بڑھ گیا ہے۔

(حاشیہ بقیہ) تھے البتہ ہدایات مولوی صاحب موصوف تک پہنچانا اور رفتار طباعت کے متعلق مولانا کی خدمت میں گزارشات پیش کرنا میرا کام تھا۔ اس سے مقصود حقیقت کی توضیح ہے۔ یہ نہیں کہ اپنی ذمہ داری سے اعراض کروں۔ افسوس کہ مولانا کے اندیشے بیجا ثابت نہ ہوئے اور ان کی خوش اعتمادیوں کا نیا دور شروع نہ ہو سکا۔

اصل کتاب میں صفحات کا شمار "۱" سے ہوا ہے، اب دیباچہ کو بھی "۱" سے شروع کرنا پڑیگا۔ امتیاز کے لیے یہ کر دیجیے کہ اعداد صفحات میں اوپر نہ دیے جائیں، نیچے دیے جائیں۔

ابوالکلام

(۱۱۲)

بمبئی ۱۷ مارچ ۱۹۴۶ء

عزیزی،

آخری خطوط کا جو مسودہ میں نے آپ کو بھیجا تھا، انھیں مطبوعہ حالت میں مَیں نے پوری طرح نہیں دیکھا تھا، صرف ابتدائی حصّے پر نظر پڑی اور اس کی غلطیوں نے طبیعت کو بیحال کر دیا، لیکن اب اس وقت اس کا پورا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ سرے سے تصحیح کسی نے کی ہی نہیں، اور اگر کی ہے، تو اصل مسودے کا مقابلہ کر کے نہیں کی ہے۔ محض قیاس سے تصحیح کر دی اور وہ چونکہ عموماً میرے ذوقِ واسلوبِ تحریر کے خلاف ہوا کرتا ہے، اس لیے تصحیح نے اور زیادہ تحریف و تخریب کا سامان کر دیا۔

علاوہ صفحہ ۲۷۳ کی دو غلطیوں کے جن کا لاہور میں ذکر کیا تھا، مزید غلطیوں کا یہ حال ہے۔ صفحہ ۲۷۵ سطر ۸ "اور میں پسند نہیں کرتا کہ ایسی خاموشی میں" کی جگہ "اس خاموشی" میں ہونا چاہیے۔ صفحہ ۲۸۲ سطر ۱ "جیسے دماغ کا" کی جگہ "جسے دماغ کا" ہونا چاہیے۔

براہِ عنایت مسودہ دیکھیے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کس طرح صریح میری عبارت میں دخل دیا گیا ہے اور اسے محرّف کر دیا گیا۔ جس جگہ ہم قید تھے

وہ خود ایک احاطہ تھا، اس کے اندر کسی دوسرا احاطہ کی گنجایش ہی نہیں تھی۔ چونکہ پچھلے خطوط میں اسی احاطے کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس لیے یہاں اشارہ کیا گیا کہ "احاطہ کے اندر" کاتب نے اس میں اصلاح کر دی کہ "ایک احاطہ کے اندر" گویا اس احاطہ کے اندر ایک دوسرا احاطہ ہے اور اس میں قبر ہے۔ آپ نے چونکہ اصل سامنے نہیں رکھا تھا، اس لیے اسے صحیح سمجھا اور صریح خلاف واقعہ بات بنا دی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ دیباچہ وغیرہ جو چھپ رہا ہے، اس کا حشر کیا ہوگا؟ پہلے کاتب اصلاحات کریگا پھر آپ محض قیاس سے تصحیح کرتے ہوئے دھوکا کھا جائینگے اور عبارت کچھ سے کچھ ہو جائیگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ اگر کاپیاں منگواتا ہوں، تو خواہ مخواہ کو دیر ہوتی ہے۔ پہلے ہی صبر آزما دیر ہو چکی ہے نہیں منگواتا، تو پچھلا تجربہ بلائے جان ہو رہا ہے، اور طبیعت مطمئن نہیں ہوتی۔ کیا میں یہ توقع رکھوں کہ آپ مجھے اس خلش سے نجات دلا دینگے۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک ہفتے کے بعد یعنی زیادہ سے زیادہ ۲۵ مارچ تک کتاب مکمل ہو کر نکل آئے۔ کافی وقت جلد بندی کے لیے بھی مطلوب ہوگا اور اگر کتاب ایک ہفتہ کے اندر نہیں نکلتی، تو پھر بہت زیادہ دیر ہو جائیگی۔ آپ خدارا مصارف کی کمی کا خیال نہ کریں۔ ایسے موقعہ پر مصارف کی کمی کر کے آپ مجھے خوش نہیں کرینگے، بلکہ نئی نئی کاہشوں میں مبتلا کر دینگے۔ لاہور میں جو بہتر سے بہتر خوشنویس ہو، اس سے کام لینا چاہیے اور دگنی اجرت دینی چاہیے تاکہ دوسرا کام چھوڑ کر اسے جلد سے جلد انجام دے دے پھر اسی طرح چھپائی کا کام کرنا چاہیے۔ کاپیاں طیار ہوتے ہی جم جائیں اور بیک وقت متعدد مشینوں پر چھپائی شروع ہو جائے۔ اجرت دگنی سہ گنی دیجیے۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے شکایت نہ ہوگی۔

غلط نامہ آپ کو بھیج چکا ہوں۔ اس کے آخر میں اغلاط مندرجۂ صدر کا بھی اضافہ کر دیجیے۔ اس میں تغافل نہ ہو،

مجھے امید ہے کہ اس معاملہ میں آپ زحمت برداشت کر کے جو کچھ کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے۔ تصحیح دو آدمی بیٹھ کر اس طرح کریں کہ ایک اصل مسودہ پر نظر رکھے، دوسرا کاپی پر۔ بغیر اس کے تصحیح محال ہے۔

کل ہوائی جہاز سے کلکتہ جا رہا ہوں، وہیں جواب ملے۔

ابوالکلام

(۱۱۳)

دہلی ۱۸ مارچ ۴۶ء

عزیزی،

کل بمبئی سے ایک خط بھیج چکا ہوں۔ چونکہ بمبئی سے براہِ راست کلکتہ جانے کے لیے ہوائی سفر کا فوری انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے آج دہلی آ گیا۔ کل صبح کلکتہ کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔ اب مجھے کلکتہ کے پتہ سے اطلاع دیجیے کہ دیباچہ کا کیا حال ہے۔ کتابت شروع ہو گئی، یا ابھی تک خوشنویس کی جستجو ہو رہی ہے؟ نیز کاپیوں کی تصحیح کے لیے کیا انتظام کیا گیا ہے؟ مسودہ میں نے بمبئی جانے سے پہلے روانہ کر دیا تھا۔ غالباً ۱۱ مارچ کو یا ۱۲ کو مل گیا ہوگا۔ آج ۱۸ ہے۔ ایک ہفتہ ہو چکا۔ کتابت کا کام ایک ہفتہ سے زیادہ کا نہ تھا۔ بشرطیکہ بلا تاخیر شروع کر دی ہو۔

مجھے امید ہے، تصحیح و نگرانی کے بارے میں مزید مایوسیوں کا سامنا نہ ہوگا۔ لاہور میں آپ نے از سرِ نو توقع دلائی ہے، اور میں نے اس پر اعتماد کیا ہے۔ تصحیح

کے لیے بنیادی بات یہ ہے کہ کاپیاں محض قیاس کی بنا پر درست نہ کی جائیں، بلکہ اصل مسودہ سے لفظ بہ لفظ مقابلہ کر کے تصحیح کی جائے۔ یہ کام صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ بیک وقت دو صاحب کام میں شریک ہوں۔ ایک کاپی پڑھتا جائے، دوسرا اصل مسودے پر نظر رکھے۔ تصحیح کا معیار ذاتی قیاس نہ ہو بلکہ مسودہ سے مطابقت۔ اگر مصحح کہیں غلطی بھی محسوس کرے، تو دخل نہ دے۔ اُس کا کام اصلاح نہیں ہے، اصل مسودہ سے مطابقت کی کوشش ہے۔

غلط نامے کی بعض اغلاط جو پہلے رہ گئی تھیں، بعد کو لکھ کر بھیجی گئی ہیں، اُن کا اضافہ کر دینا ضروری ہے

٭ ٹائیٹل پیج اس طرح کا چھپوانا چاہیے کہ جلد کے اوپر کَوَر کا کام دے، کیونکہ تمام نسخے مجلّد فروخت ہونگے۔

لوح دو ہونگی، ایک فہرست سے پہلے، ایک مقدمے سے پہلے۔ فہرست سے پہلے والی لوح پر کتاب کا نام جلی قلم سے بہ طرزِ لوح لکھا جائیگا۔ لیکن دوسری لوح میں اس درجہ کا جلی قلم نہیں ہونا چاہیے۔ متوسّط قلم سے نام لکھا جائے اور صفحہ کے وسط میں لکھا جائے۔

خوشنویس اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیے جس خوشنویس سے آپ نے آخر کے اجزا لکھوائے ہیں، وہ نکمّا ہے۔ اس سے خدارا، نہ لکھوائیے گا، ورنہ کتاب کا ابتدائی حصّہ مسخ ہو جائیگا۔

محمد احمد صاحب اور سالک صاحب کو دعا محبّت۔ والسّلام

ابو الکلام

(۱۱۴)

کلکتہ

۲۲ مارچ ۱۹۴۶ء

عزیزی،

خطوں کے جواب کا انتظار ہے۔ اس وقت "غبارِ خاطر" کے پروف دیکھے، تو ایک غلطی اور نظر آئی۔ مہربانی کر کے اسے بھی غلط نامے میں بڑھا دیجیے۔ صفحہ کے نمبر کی ترتیب سے اس کی جگہ نکالی جائے۔

صفحہ ۱۰۱ سطر ۴ "چودہ پندرہ برس سے آگے نہیں بڑھا" کی جگہ "چودہ پندرہ برس کی عمر سے آگے نہیں بڑھا" ہونا چاہیے۔

والسلام

ابوالکلام

(۱۱۵)

کلکتہ ۲۳ مارچ ۴۶ء

عزیزی،

"غبارِ خاطر" کی ایک اور غلطی اس وقت نمایاں ہوئی۔ اسے بھی غلط نامے میں شامل کر دیجیے۔

صفحہ ۶۰، سطر ۴۔ انسان اپنی زندگی کے اندر" کی جگہ "انسان اپنی ایک زندگی کے اندر" ہونا چاہیے۔

کوئی خط آپ کا ابھی تک نہیں ملا۔

ابوالکلام

(۱۱۶)

کلکتہ

۱ اپریل ۱۹۴۶ء

عزیزی!

مدت کے انتظار کے بعد اب آپ کا خط مورخہ ۲۰ مارچ وصول ہوا۔

۱۔ لوحیں اتنی ہی رہینگی، جتنی قرار دی گئی ہیں۔

۲۔ کور جو جلد کے اوپر آئیگا، اس پر وہ عبارت اور شعر (میرسن ناچہ نوشتہ است الخ) لکھی جائے جو اندر کی اصل لوح پر لکھی گئی ہے، یعنی "ابوالکلام آزاد کی بعض تحریرات جو قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے میں (۹ اگست ۱۹۴۲ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۵ء تک) لکھی گئیں۔ روشنائی رنگین نہ ہو سیاہ ہو۔

۳۔ نام ابوالکلام آزاد ہی لکھیے، احمد سے لوگ آشنا نہیں ہیں، گو نام وہی ہے۔

۴۔ پشت پر بھی "غبارِ خاطر" از ابوالکلام آزاد لکھا جائے۔

۵۔ قیمت للعہ مجلد کور پر لکھ دیجیے۔

۶۔ اس سے اطمینان ہوا کہ صحت کی طرف سے آپ نے اطمینان دلا یا ہے۔

۷۔ جلد پوری کپڑے کی ہو، ۳۳ روپیہ فی صد مجھے منظور ہے۔ آرڈر دے دیجیے۔

کل ہوائی جہاز سے دہلی روانہ ہونگا اور ۵ تک ٹھہرونگا۔

والسلام علیکم

ابوالکلام

اگر محمد احمد صاحب والا کاتب اچھا ہے، تو لکھیے، کوئی دوسری کتاب کتابت کے لیے بھیج دوں۔

(۱۱۷)

دہلی ۲ اپریل ۴۶ء

عزیزی،

زندگی کی سخت غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ تھی کہ "ترجمان القرآن" اوّل کے طبع ثانی کی اجازت ..... کو دے دی۔ دو برس گزر چکے ہیں، کچھ معلوم نہیں ہوتا اُس کا کیا حشر ہوا۔ اجمل خاں خط پر خط لکھ کر تھک گئے، جواب ہی نہیں ملتا۔ میں چاہتا ہوں، آپ اُن سے ملیے اور میری جانب سے دریافت کیجیے کہ "ترجمان" کا کیا حشر ہوا؟ نیز بطورِ خود صورتِ حال معلوم کرکے مجھے مطلع کیجیے۔

سالک صاحب کو دعاءِ خیر

ابوالکلام

۱۱۸/۲۰۱

(۱۱۸)

دہلی ۴ اپریل ۱۹۴۶

عزیزی،

خط پہنچا، کلکتہ سے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ آپ کا خیال صحیح ہے، نظیری کے مقطع میں "ماند" زیادہ موزوں ہے، بہ مقابلہ "اند" کے:

تاریخ واقعاتِ شہاں نانوشتہ ماند
افسانہ کہ گفت نظیری، کتاب شد[۸۹]

آپ کاپی میں "ماند" ہی کردیں[۱]۔

---

[۱] مولانا کے مسودے میں نظیری کے اس شعر کا پہلا مصرع یوں تھا: (بقیہ حاشیہ اگلے پر)

اب خدارا جلدی کیجیے۔ لکھ چکا ہوں کہ تمام نسخے جلد سازی کے لیے فوراً دے دیے جائیں، جلد پوری کپڑے کی ہو گی۔
میں "حالی پبلشنگ" کو آپ کے نام کا خط دے رہا ہوں۔ جلد سازی میرے ذمّے ہے۔ وہ مجلّد نسخے لے لینگے۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

(۱۱۹)

تار کا ترجمہ

نئی دہلی ۷ اپریل ۱۹۴۶ء
مہربانی فرما کر "غبارِ خاطر" کا مکمّل نسخہ معاً بھیجیے۔

آزاد

(۱۲۰)

نئی دہلی
۲۴ اکتوبر ۱۹۴۶ء

جنابِ محترم
آپ کے سب سلام پہنچ گئے۔ مولانا شکر گزار ہیں اور دعا کرتے ہیں اور

(حاشیہ بقیہ) تاریخ واقعاتِ شہاں نانوشتہ اند
میں نے عرض کیا تھا کہ اصل شعر میں نے یوں دیکھا ہے:
تاریخ واقعاتِ شہاں نانوشتہ ماند
مولانا نے فرمایا کہ "اند" کی جگہ "ماند" بنا دیا جائے۔

فرماتے ہیں کہ جونہی موقع ملا آپ کو بلاؤنگا۔[1]

راقم
محمد اجمل خان

(۱۲۱)

۲۷ دسمبر ۴۶ء

مکرمی تسلیم

دو خطوں کا جواب دینے ہی والا تھا کہ آپ کا کارڈ ملا۔

Chantes Populaire Les Afgans

کے متعلق آپ پروفیسر نعیم الرحمان ۱۰ ہیلی روڈ الہ آباد کو میرے حوالے سے لکھ دیجیے۔ یہ کتاب پبلک لائبریری الہ آباد میں موجود ہے اور اگر یہ لوگ اس کے ممبر ہوئے، تو وہاں سے لے کر آپ کو روانہ کر دینگے، ورنہ اس کی تفصیل آپ کو مل جائیگی کہ کہاں چھپی ہے تاکہ آپ خود خرید سکیں۔

۲۔ پیر جی کا فالنامہ قصبہ گوتنی ضلع پرتاب گڑھ میں دس پندرہ سال ہوئے میں نے خود دیکھا تھا۔ میں خط لکھتا ہوں اگر وہ صاحب موجود ہوئے اور کتاب بھی باقی ہوئی تو نقل مل جائیگی۔ اس کی نصف نقل میں نے کرائی تھی ممکن ہے الہ آباد میں میرے کاغذات میں ہو۔

---

[1] خان محمد اجمل خان سے ذاتی تعلقات بھی بہت گہرے تھے، لیکن اب سے مولانا کے ساتھ نامہ و پیام انھیں کی وساطت سے ہونے لگا۔ ان کے جو خطوط، مولانا کے مکاتیب کے ساتھ درج کیے جا رہے ہیں، وہی ہیں، جو مولانا کے ارشاد کے مطابق انھوں نے مجھے تحریر فرمائے۔ کہیں کہیں ضمناً دوسری باتوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔

۳۔ اسلامی تجدیدی تحریکیں Islamic Movements of Islam
یا اس طرح کا کوئی انگریزی نام ہے۔ جولیس جرمانس Germanus
نے شانتی نکیتن بنگال سے شائع کیا ہے۔ پتہ اس کتاب کے ملنے کا یہ ہے:

Secretary, Vishwabharti
P.O. Shantiniketan (Bengal)

۴۔ رسالۂ جہاد۔ میرے کتب خانہ الٰہ آباد میں موجود ہے لیکن بغیر میرے گئے اس کا ملنا مشکل ہے۔ میری بیوی دمہ کی مریض ہیں اور کمزور بجید ہیں۔ اُن کے لیے تلاش کرنا ناممکن ہے۔

۵۔ احیاء القلوب "تاریخ حبیب الٰہ" میرے کتبخانے میں ہیں اگر جانا ممکن ہوا، تو لا دونگا۔ مطبوعہ ہیں (لوہے کے ٹائپ کلکتہ کی)

۶۔ "تاریخ لب لباب" وہی ہے، جسے آپ دیکھ چکے ہیں۔

۷۔ دُرِ مکنون (فارسی) بھی میرے کتبخانے میں ہے، اس میں مہدیوں کو گالیاں دی گئی ہیں، جن میں حضرت سید احمد اور سید محمد جونپوری وغیرہ کا نام ہے۔ مثنوی کی نقل کے لیے میں نے خط لکھ دیا ہے۔ جمیع کتب کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر میں جا سکا تو لے آؤنگا۔

میں نے داد اصاحب کے حالات کے متعلق بھائی صاحب کو خط لکھا ہے۔ وہ تلاش میں ہیں۔

مولانا کی طبیعت ہنوز ویسی ہی ہے۔ صحت ہونے پر اطلاع دونگا۔ مکرر یہ کہ ڈاکٹر سید عبدالعلی لکھنوی بھی ٹونک کی چند قلمی کتابوں کا ذکر کرتے تھے۔ یہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سکریٹری ہیں اور نبیرۂ سید احمد شہید ہیں۔

نیاز مند
اجمل

(۱۲۲)

۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء

برادرِ محترم

جمعرات کو مولانا کلکتہ گئے تھے، کل اتوار کو آنے والے تھے۔ معلوم نہیں کیوں نہ آسکے۔

میں غالباً ۲۰ تک الہ آباد سے واپس آسکونگا۔ بشرطیکہ حضرت مولانا نے ۱۵ کی رات کو جانے کی اجازت دے دی۔

عند الملاقات مفصّل گفتگو ہوگی۔

نیازمند
اجمل

(۱۲۳)

دہلی ۹ فروری ۱۹۴۷ء

عزیزی،

"غبارِ خاطر" کے نئے ایڈیشن کی تصحیح میں آپ نے بھی حصّہ لیا تھا اور میں اس طرف سے بالکل مطمئن تھا، لیکن بعض مقامات پر نظر پڑ گئی تو معلوم ہوا کہ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ مثلاً "طائرہ" کو ظالم کاتب نے "طاہرہ" بنا دیا ہے۔ بہرحال ان اغلاط سے طبیعت کو زیادہ کوفت نہیں ہوئی، لیکن اس وقت ایک صاحب نے دکھایا کہ عید اضحیٰ کو عید الضحیٰ کر دیا ہے[1]۔ یہ غلطی ناقابلِ برداشت ہے۔ اب اس

[1] یہ غلطی واقعی ناقابلِ برداشت تھی۔ کاپی دیکھتے وقت درست کردی گئی تھی، لیکن کاتب نے تصحیح نہ کی۔ اسے یقین تھا کہ صحیح وہی ہے، جو اس کے قلم سے نکلا ہے۔

کے سوا چارہ نہیں کہ غلطنامہ کتاب کے ساتھ شامل کیا جائے۔ معلوم نہیں، کتنے نسخے نکل چکے ہیں۔ بہرحال کل بھیجونگا۔

ابوالکلام

(۱۲۴)

نئی دہلی

۱۷۔۲۔۴۷

برادرِ محترم تسلیم

آپ کے دو گرامی نامے موصول ہوئے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جیسا آپ نے لکھا ہے، اس طرح کی غفلت کاتبوں وغیرہ سے ہو جاتی ہے۔

محمد اجمل خاں

میں نے دادا صاحب اور والد صاحب کے حالات کی جستجو کی[1]۔ دادا صاحب کے حالات بہت ہی کم دستیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر آپ فرمائیں تو ایک خط کی صورت میں، جس میں بعض دیگر تفاصیل بھی ہوں، لکھ کر روانہ کر دوں۔ والد صاحب کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا۔ اس وقت میں طالب علم تھا۔ دادا صاحب غدر سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔

نیازمند
اجمل

---

[1] ان حالات کی جستجو مجھے اپنی کتاب "جماعتِ مجاہدین" کے سلسلے میں تھی۔

(۱۲۵)

نئی دہلی

۲۰ اپریل ۴۷ء

برادرم

مولانا کا شملہ جانا ابھی طے نہیں ہوا۔ جونہی تسلیم ہوا آپ کو اخبارات سے معلوم ہو جائیگا۔

محمد احمد خان صاحب کو مسودہ عنقریب روانہ کر دیا جائیگا۔

آپ کی کتاب کب تک شائع ہو گی؟

محمد احمد خان صاحب میری چند کتابیں چھاپ رہے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آج کل وہ اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے اس کام کا جلد سر انجام نہ کر سکے۔ میں نے بنیادی ہندستانی پر چند رسالے بھی انھیں دیے تھے، جس میں ایک لغت بھی تھی۔ معلوم نہیں کہ کیوں دیر ہو رہی ہے۔

نیازمند

محمد اجمل خان

(۱۲۶)

نئی دہلی

۲۰ اپریل ۴۷ء

برادرِ محترم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ حضرت مولانا کو طباعت تسلیم کی حالت بتا دی گئی۔

محمد احمد خان صاحب کو میں نے ایک خط لکھا ہے۔ جواب کا منتظر ہوں۔ جو انگریزی ڈکشنری انھوں نے چھپوائی ہے، اس میں ہر سطر میں اغلاط ہیں۔ پروف دیکھ رہا ہوں، اس کو درست کرانے کے بعد شائع کرنا چاہیے۔ ورنہ ڈکشنری اگر غلط چھپے تو گویا پوری زبان (جو اس کے ذریعہ سے سکھائی جائیگی) غلط ہو جائیگی۔ براہِ کرم انھیں سمجھا دیجیے گا۔ میں علیحدہ بھی ان کو خط لکھ رہا ہوں۔

چونکہ موجودہ مکان یکم مئی تک تبدیل کرنے کا ارادہ ہے، لہٰذا آیندہ خطوط کے جوابات ۱۹ اکبر روڈ بذریعۂ وزیر تعلیمات آئیں تو بہتر ہوگا۔

سیرت بھی محمد احمد خان صاحب کے زیر نگرانی طبع ہو رہی تھیں۔ اس کا مقدّمہ (پس منظرِ اسلام) دہلی میں چھپ رہا تھا، لیکن عرصۂ دو ماہ سے اس کے چند فارم نہیں چھپ سکے۔ طباعت بند ہے۔ پریس والوں نے مجھے فون کیا تھا کہ بعض وجوہ سے طباعت رُکی ہوئی ہے اور انھوں نے محمد احمد خان صاحب کو لکھا ہے۔ جواب کا انتظار ہے۔

میں بھی آپ کی طرح سیرت کو جلد از جلد شائع ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ ابھی اس کی طباعت شروع بھی نہیں ہوئی۔

نیازمند

اجمل

(۱۲۷)

نئی دہلی

۲۹ اپریل ۱۹۴۷ء

برادرِ محترم تسلیم

طباعت کے متعلق مولانا کو حالات بتا دیے گئے، بلوچستان کے متعلق مولانا

نے فرمایا کہ کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی[1] انھیں اپیل کرنا چاہیے۔ اپیل میں معاملہ ادھر آجائیگا۔ پھر جو کچھ ہونا ہوگا، ہوگا۔
محمد احمد رضا خان صاحب کا خط ملا ہے۔ حالات معلوم ہوئے۔ زیادہ نیاز
محمد اجمل خان

(۱۲۸)

۸ مئی ۱۹۴۷ء

برادرم تسلیم
میں نے انتقالِ مقدمہ کے سلسلے میں حضرت مولانا سے گفتگو کی تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ اس بارے میں کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ مقدمہ چلیگا، پھر اپیل ہوگی۔
آپ فرماتے ہیں کہ "اپیل کو پہنچے ہوئے کم وبیش دو مہینے گزر چکے ہیں" غالباً آپ کی مراد "درخواستِ انتقالِ مقدمہ" ہے نہ کہ اپیل، کیونکہ اپیل تو فیصلہ کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔
بہرحال جو کچھ مولانا نے فرمایا ہے، وہ میں آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اب آپ جو حکم دیں، وہ کروں۔
آپ آخر میں پھر تحریر فرماتے ہیں کہ "آپ اپیل کی نقل پڑھ لیں" اس سے بھی مراد "درخواستِ انتقالِ مقدمہ" ہے۔
حضرت مولانا کو سلام پہنچادیا گیا۔ وہ دعاے خیر کہتے ہیں اور آج کل حالات کی رفتار سے بہت بےچین ہیں۔ اللہ مسلمانوں پر رحم فرمائے۔

---

[1] یہ ایک عزیز کا معاملہ تھا، جس کی تفصیل یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

"ترجمان" ابھی نہیں پہنچا۔
محمد احمد خان صاحب کا خط آیا تھا۔

والسلام مع الاکرام
نیاز مند
محمد اجمل خان

(۱۲۹)

۲۲ پرتھوی راج روڈ ، نئی دلی
۸ جولائی ۱۹۴۷ء

برادرِ محترم تسلیم

آپ کو معلوم ہے کہ .... نے عرصہ ہوا "ترجمان القرآن" شائع کر دی ہے۔ لیکن آپ کو حیرت ہوگی کہ باوجود متعدد خطوط اور ایک تار کے انھوں نے نہ تو حضرت مولانا کو ایک جلد روانہ کی، نہ خطوں کا جواب دیا۔ کتاب بازار میں موجود ہے، لیکن وہ خود بھیجنا نہیں چاہتے۔ کیا آپ اُن کی اس بد معاملگی پر توجہ دلا کر انھیں فرائض محسوس کرائینگے؟

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور آپ کی کتاب جلد شائع ہونے والی ہوگی محمد احمد خان صاحب، فرنٹیر کمپنی لمیٹیڈ کے نام سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے "پس منظرِ اسلام" دہلی میں چھپانا شروع کی تھی لیکن مہینوں سے وہ ادھوری چھپ کر رہ گئی ہے۔ پریس والے انھیں خط پر خط لکھتے ہیں، لیکن وہ جواب نہیں دیتے .... جس سیرت کا آپ سے ذکر ہوا تھا اس کا نصف بھی محمد احمد خان صاحب کے ذریعے سے چھپنے والا تھا۔ مسودہ ان ہی کے پاس

ہے۔ لیکن ابھی تک ایک فارم بھی وابستہ سنگِ مطبع نہ ہو سکا۔
یہ حال ہے باشندگانِ .... جیسے عربی میں .... کہتے ہیں۔
اُمید ہے کہ ...... سے گفتگو کرنے کے بعد آپ حضرت مولانا کو صورتِ حال سے مطلع فرمادینگے۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

(۱۳۰)

نئی دہلی

۲۷ - ۷ - ۴۷

برادرم، سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ عبدالرحیم صاحب کا بھی خط آیا اور جو دو نسخے انھوں نے شملہ روانہ کیے تھے، وہ پہنچ گئے۔
میں چاہتا تھا کہ سیرت کی طباعت جلد ہو جاتی۔ لیکن محمد احمد خان صاحب باوجود وعدوں کے اب تک اس عہدہ سے برآ نہیں ہو سکے۔ "پس منظرِ اسلام" دہلی میں چھپوائی ہے۔ پریس والے کہتے ہیں کہ وہ بالکل خبر نہیں لیتے۔ سیرتِ مکّیہ پوری تیار کر کے دے چکا ہوں اور ایک سال سے یہی قصّہ ہو رہا ہے۔ "مدینہ" لکھ رہا ہوں، لیکن معلوم نہیں وہ کب ادھر متوجّہ ہو سکینگے۔
خدا جانے آپ کی کتاب کب تک منصّۂ شہود پر آئیگی۔
مولانا کو میں نے سلام پہنچا دیا۔ اب دوبارہ عرض کیا، وہ بھی سلام کہتے ہیں اور دعاے خیر کرتے ہیں۔

نیاز مند
اجمل

(۱۳۱)

۱۹ اکبر روڈ، نئی دہلی
۸ اکتوبر ۱۹۴۷ء

برادرِ محترم تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ ان حالات کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ حضرت مولانا نے اس کے متعلق فوری کارروائی کرنے کا انتظام کیا ہے اور امید ہے کہ کسوئی سے وہ بخیریت لدھیانہ تک پہنچا دیے جائینگے[1]

محمد احمد خان صاحب یہاں ۵ ستمبر کو تشریف لائے تھے اور دس بارہ دن کے قیام کے بعد ہوائی جہاز سے لاہور تشریف لے گئے ہیں۔ وہ بیچارے بھی تباہ ہو گئے ہیں۔ ان سے میرے حالات معلوم ہونگے[2]

اگر وہ لاہور میں ہوں، تو میرا سلام پہنچا دیجیے گا۔ میں نے کئی خط بھیجے، جواب نہیں ملا۔

اسی طرح ایک محمد ذکی خان ۲۰ فلیمنگ روڈ پر مقیم ہیں۔ ان سے کہلوا دیجیے کہ ان کی بیوی مع الخیر ان کے والد کے پاس ہیں۔ دہلی سے، عرصہ ہوا، چلی گئی ہیں۔ لیکن ان کا سامان جو یہاں تھا، وہ لٹ چکا ہے۔ زیادہ نیاز

جواب کا متمنی
اجمل

---

[1] اگلے خط کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

[2] تقسیم کے دوران میں محمد احمد خاں صاحب بھی خوفناک حوادث کا ہدف بنے اور اجمل خان صاحب کا سامان بھی دہلی میں لٹ گیا۔ ان کی کتابیں نذرِ آتش ہوئیں۔ وہ خود بمشکل بچے۔

(۱۳۲)

۱۹ اکبر روڈ، نئی دہلی
۲۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء

برادرم تسلیم

پہلے خطوط کا جواب دے دیا گیا تھا اور حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ میں خود کارروائی کرونگا، بلکہ اس سلسلے میں شملہ ٹیلیفون بھی کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں آپ کے بھائی لدھیانہ پہنچے یا نہیں[1]۔ اور تعجب ہے کہ آپ تک خط کیوں نہیں پہنچا۔

راقم
محمد اجمل خان

(۱۳۳)

۵ ستمبر ۱۹۴۹ء

عزیزی،

خط ملا، کیا آپ اپنے کسی کاروبار کے سلسلے میں دہلی نہیں آسکتے؟ اگر ممکن ہو تو آئیے اور ایک دو دن یہاں ٹھہریے۔ والسّلام علیکم ابوالکلام

---

[1] میرا چھوٹا بھائی امیر احمد خان علوی سناور (نزد کسولی) میں تھا۔ وہ وہاں سے ایک قافلے میں روانہ ہوا۔ خود بال بچّوں کے ساتھ موٹر میں تھا اور سامان ٹرک میں رکھا تھا۔ موٹر اور ٹرک راستے میں رہ گئے۔ میرے بھائی کا کنبہ دو حصّوں میں بٹ گیا۔ بڑی دیر کے بعد کالکا سے ایک کارڈ ملا۔ دس پندرہ دن کے بعد کنبے کا ایک حصّہ بخیر و عافیت پہنچا اور خاصی دیر کے بعد میرا بھائی اور بچّے آئے۔ اس سلسلے میں مولانا کو بھی لکھا تھا۔ اس سے پہلے خط میں بھی یہی ذکر ہے۔

(۱۳۴)

دہلی، ۲۲ اکتوبر ۴۹ء

عزیزی،

آپ نے لکھا ہے، وسط نومبر میں آپ آئینگے، ضرور آیئے اور یہیں ٹھہریے۔

و السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

ابو الکلام

(۱۳۵)

نئی دہلی، ۲۱ نومبر ۱۹۴۹ء

مائی ڈیر چودھری صاحب

مولانا صاحب نے آپ کے خط کی رسید بھیجنے کے لیے کہا ہے۔ موصوف اس ماہ کے آخر تک دہلی میں ہونگے۔ موجودہ پروگرام کے مطابق ۲ دسمبر کو میسور جائینگے اور تین چار روز میں واپس آجائینگے۔ دسمبر کے تیسرے ہفتے میں دوبارہ تین چار روز کے لیے بمبئی تشریف لے جائینگے۔ آپ دہلی آنے کا قصد ایسے موقع پر کیجیے کہ مولانا صاحب یہاں موجود ہوں[1]۔

مخلص

ایم۔ این مسعود

---

[1] یہ مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری کے انگریزی خط کا ترجمہ ہے۔ میں نے پروگرام دریافت کیا تھا۔ اس لیے کہ دہلی جانے کا قصد کر رہا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا نے یہ خط لکھوایا۔

(۱۳۶)

نئی دہلی
۱۷ دسمبر ۱۹۴۹ء

جناب عالی

مولانا صاحب نے آپ کے خط کی رسید بھیجنے کے لیے کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ دہلی میں قیام کے متعلق چنداں فکرمند نہ ہوں۔ ان کا مکان آپ کی آمد کا استقبال کرنے کے لیے موجود ہے۔

آپ کا فرمانبردار
ایم، این، مسعود

(۱۳۷)

گورنمنٹ آف انڈیا
منسٹری آف ایجوکیشن
نئی دہلی ۳ ۴ جنوری ۱۹۵۰ء

ڈیر چودھری صاحب

مولانا صاحب کو آپ کے خطوط موصول ہوئے۔ وہ ۶ جنوری سے ۱۲ جنوری تک دہلی سے باہر ہونگے۔ اگر آپ ۱۲ جنوری کے بعد دہلی تشریف لائینگے، تو وہ یہاں موجود ہونگے۔

آپ کا فرمابنردار
ایم۔ این۔ مسعود
پرائیوٹ سکریٹری عزت مآب وزیر تعلیمات

(۱۳۸)

۲۰ مئی ۵۰ء

عزیزی،

آپ کا خط مجھے مل گیا تھا، مگر ادھر اس درجہ مشغولیت رہی کہ میں اس معاملے کی تفصیلات پر غور کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا۔[1] بہر حال بہت جلد صورتِ حال سے آپ کو مطلع کرونگا۔ آپ کا خط میں نے ضروری کاغذات میں رکھ دیا ہے، تاکہ پیشِ نظر رہے۔

والسلام علیکم
ابوالکلام

(۱۳۹)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دلّی
۲۲ اکتوبر ۱۹۵۰ء

مکرّمی تسلیم

بحمدہٖ، اب مولانا بالکل اچھّے ہیں۔ پاؤں اور ہاتھ میں جو ضربات آئی تھیں، اُن پر

[1] میں نے مولانا کے حسبِ ارشاد ایک اسکیم بنائی تھی کہ "ترجمان القرآن" کی تینوں جلدیں پورے اہتمام سے کم از کم مدّت میں شائع ہو جائیں۔ شیخ نیاز احمد صاحب (شیخ غلام علی اینڈ سنز) اس سلسلے میں گرانقدر رقم خرچ کرنے کے لیے تیاّر تھے۔ میری تجویز یہ تھی کہ تفسیر سورۂ فاتحہ کو ترجمان سے الگ کر لیا جائے۔ جلد اوّل کے حواشی میں اتنا اضافہ فرما دیا جائے کہ یہ جلد دوسری اور تیسری کے درجے پر آجائے۔ تفسیرِ فاتحہ "اُمّ القرآن" کے نام سے الگ شائع ہو جائے۔ مکتوبِ گرامی میں اس معاملے کی طرف اشارہ ہے۔

مالش ہوتی ہے، اور کوئی شکایت نہیں[1]۔

۱۔ چند کتابیں سیّد صاحب کے متعلق حضرت مولانا کے پاس آگئی ہیں مثلاً:

(الف) مجموعۂ خطوط، چشم دید حالات: اُردو کی ایک ضخیم کتاب، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں نواب صاحب ٹونک نے سیّد صاحب کے ساتھیوں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ تمام چشم دید حالات لکھوا دیں۔ مولوی حیدر علی نے یہ مرتّب کیے۔ افسوس ہے کہ اس میں زیادہ تر خوش اعتقادی کے واقعات ہیں۔ ان کی زندگی کے تاریخی کوائف پر روشنی نہیں پڑتی۔ درمیان سے ناقص بھی ہے۔

(ب) مجموعۂ فارسی: اس میں بھی سفر کے حالات اور قیام کی تفصیلات ترتیب وار درج ہیں۔ نواب صاحب ٹونک سے معلوم ہوا کہ وہاں کے کتبخانے میں بعض اور کتابیں بھی سیّد صاحب کے متعلق ہیں، جنھیں مولانا منگوا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہتر ہوگا کہ آپ دہلی تشریف لے آئیں اور کچھ دن ٹھہر کر اطمینان سے یہ کتابیں دیکھ لیں[2]۔

---

[1] مولانا ۱۹ اکبر روڈ والی کوٹھی سے ۴ کنگ اڈورڈ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے تھے۔ آٹھویں دن رات کے وقت باہر نکلتے ہوئے گر گئے، جس سے ہاتھ اور پاؤں میں سخت ضربات لگیں اور مدّت تک پابند بستر رہے۔ میں اس سے پیشتر ایک مرتبہ ڈھاکہ سے واپس آتے ہوئے دہلی میں ٹھہر کر انھیں دیکھ چکا تھا۔ پھر ایک مرتبہ مولانا موٹر میں جا رہے تھے، اچانک سامنے سے دوسری موٹر آگئی۔ مولانا کے ڈرائیور نے اپنی موٹر ایک دم روکی، جھٹکا لگنے سے مولانا موٹر ہی میں گر گئے اور ہاتھ پر سخت ضرب لگی۔

[2] میری گزارش پر مولانا نے نواب صاحب ٹونک کے کتبخانے سے حضرت سیّد احمد شہید کے متعلق کچھ قلمی نسخے منگوائے تھے۔ یہ ان کا ذکر ہے۔ بعد میں اور کتابیں بھی آگئی تھیں اور میں نے دہلی جا کر ان کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تھا۔

۲۔ "ترجمان القرآن" کی طباعت کے متعلق بھی آپ دہلی آجائینگے، تو باتیں ہو جائینگی۔

مولوی عبدالرزاق صاحب اپنی کتاب "نہج البلاغہ" ختم کر چکے ہیں۔ ان کو آپ کا سلام کل پہنچا دونگا، اور رسالہ کے متعلق بھی کہہ دونگا۔

نیازمند
محمد اجمل خان

(۱۴۰)

۴ کننگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۳ جنوری ۱۹۵۱ء

برادرم،   تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۵۱ء ملا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ بہت اچھی بات ہے، خوشی سے آیئے اور یہاں قیام کیجیے۔

مولانا ملیح آبادی کو تشویش تھی کہ کتاب پہنچی یا نہیں[1]۔ بہرحال اب آپ کی اطلاع سے وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ سیرتِ نبوی کے متعلق آپ سے یہاں آنے پر گفتگو ہو سکیگی[2]۔

نیازمند   محمد اجمل خاں

---

[1] نہج البلاغہ کے حصۂ مکاتیب کا ترجمہ جو مل گیا تھا اور شیخ نیاز احمد صاحب نے اسے چھپوایا تھا۔

[2] اس سے مراد وہ سیرت ہے جو خان محمد اجمل خان نے قرآن مجید کو پیش نظر رکھ کر تیار کی تھی اور "منظرِ اسلام" کے نام سے شائع ہو چکی ہے، پہلے مختصر، بعد ازاں متوسط۔ مفصل سیرت ان کے پاس مدت سے تیار ہے۔

(۱۴۱)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دلّی

۱۷ فروری ۵۱ء

برادرِ محترم ، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۳۰ جنوری وصول ہوا تھا، مگر احمد آباد جانے کے بعد، فروری سے حضرت مولانا کو بخار شروع ہوگیا، کچھ کھانسی بھی تھی۔ اب بحمد اللہ اچھّے ہیں۔ مولانا عبدالرّزاق صاحب کو آپ کا سلام پہنچا دیا گیا۔ لیکن ابھی تک انھیں روپیہ نہیں ملا۔

جن کتابوں کو آپ نے ٹونک سے منگوانے کے لیے کہا تھا، وہ پھر بذریعۂ تحریر منگوائی گئی ہیں۔ دو کتابیں آ چکی ہیں، بقیّہ کا انتظار ہے۔ سیرت کی تلخیص ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہو جائیگی۔ خلافت کے خطبہ کے متعلّق بالمواجہ گفتگو ہو جائیگی[1]۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے پبلک ڈاکومنٹ کی اشاعت کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر مقصود اشاعت نہیں، جیسا کہ آپ نے لکھا ہے بلکہ صرف ترتیب ہے، تو اس کو تو آپ ضرور کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

---

[1] مولانا کا خطبۂ صدارت جس میں خلافت کے مسئلے پر مفصّل بحث کی گئی تھی۔

(۱۴۲)

ب ایڈورڈ روڈ۔ نئی دہلی

مکرمی

تسلیم

کے پہلے خط کا براہ راست مسلم ٹاؤن کے پتے پر جواب دے دیا گیا تھا پہلے
ں یہ لکھا تھا کہ جو خطبہ آپ مرتب کر رہے ہیں، اسے کر سکتے ہیں۔ لیکن اس
پنے لکھا تھا کہ غرض طباعت نہیں۔ اب جو خط آیا ہے، اس میں اس کی
ت کا ذکر ہے۔ اس کا کوئی جواب مولانا نے نہیں دیا۔ جب آپ یہاں
یف لائینگے، تو گفتگو کر لیجیے گا۔

بان" کے متعلق آپ کا تخمینہ پہنچ گیا اور حضرت مولانا کو دے دیا گیا۔ وہ ان
امنے ہے، مگر ان کو دردِ کمر اور بخار کی شکایت ہو گئی ہے۔ پارلیمنٹ جانا بھی
ہے اور سب کام بند کر رکھا ہے۔ ذرا طبیعت درست ہو تو آپ کو لکھینگے۔

ا خط آنے کے دوسرے دن مولانا ملیح آبادی صاحب کے نام کا روپیہ امرتسر
صول ہو گیا تھا، وہ انھیں دے دیا گیا۔ رسید انھوں نے ابھی نہیں دی۔ وہ
تے ہیں کہ کتاب ایک اشاعت کے لیے وہ اس معاوضہ پر دے سکتے ہیں،
شرط ہوئی تھی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے بہتر ہو کہ آپ اُن سے
راست خط و کتابت کر کے معاملہ صاف کر لیں۔ یا مسودہ واپس کر دیں، جو
رت طے ہو۔

عۂ سیرت کا کام تیزی سے ہو رہا ہے، اور امید ہے کہ ماہِ مارچ کے آخر میں
ب بالکل مکمل ہو جائیگی۔ اس کے لیے بھی تحریری یادداشت کی ضرورت ہو گی۔
ت مولانا کی طبیعت جوں ہی درست ہوئی وہ آپ کو خط لکھینگے۔ ٹونک سے
ں کتابیں آگئی ہیں۔ نفیسہ کے لیے حضرت مولانا نے لکھوایا ہے۔ اُمید ہے کہ

وہ بھی مل جائینگی۔

امید کہ آپ مع الخیر ہونگے اور جلد ملاقات ہوگی۔

نیازمند

محمد اجمل خان

(ڈپٹی پرائیوٹ سیکرٹری حضرت مولانا آزاد مدظلہم)

(۱۴۳)

ایجوکیشن منسٹر انڈیا

۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء

عزیزی،

آپ کا خط مجھے فروری میں مل گیا تھا، مگر میں یکے بعد دیگرے امراض میں مبتلا رہا اور آپ کو بروقت جواب نہ بھیج سکا۔ آپ "ترجمان" کی طباعت کے لیے جو کوشش کر رہے ہیں، اس کے لیے شکرگزار ہوں۔

مجھے تین روپیہ رائلٹی منظور ہے۔ صرف اتنی تبدیلی چاہتا ہوں کہ جس طرح پچھلا ایڈیشن چھ ہزار چھپا تھا، نیا ایڈیشن بھی اتنی مقدار میں چھپے۔ جہاں تک تیسری جلد کا تعلق ہے میں چاہتا ہوں، اس کی تعداد اس سے بھی زائد ہونی چاہیے۔ جو لوگ پہلی دونوں جلدیں لے چکے ہیں، وہ ضرور تیسری جلد بھی لینگے۔ اور نئے خریدار بھی مکمل سٹ کے خواستگار ہونگے۔ اس پہلو پر غور کر لیجیے۔

میں پہلی فوراً دے سکتا ہوں، دوسری بھی تیار ہے۔ ان کی کتابت کا کام بلا تاخیر شروع ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد تیسری کا مسودہ مطلوب ہوگا۔

لیکن اب ایک دقت یہ پیش آگئی ہے کہ میں ۳ مئی کو انگلینڈ جا رہا ہوں۔ جون کے

آخر میں واپس آؤنگا۔ جتنے دن اب اپریل کے باقی رہ گئے ہیں، ان میں معاملے کی انجام دہی شکل ہو گی۔ بظاہر اس کے سوا چارہ کار نظر نہیں آتا کہ کام جولائی کے پہلے ہفتے میں انجام پائے۔

جولائی میں پہلی جلد دے دونگا۔ ستمبر میں دوسری جلد۔ یہ دونوں جونہی قریب الاختتام ہونگی، تیسری جلد کی طباعت شروع کر دی جائیگی۔

ہر جلد کی رقم مجھے علیحدہ علیحدہ وصول ہو جانی چاہیے، چھ ہزار طباعت کا معاہدہ ہوگا[1]۔

ابوالکلام

(۱۴۴)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

دوشنبہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء

برادرِ محترم تسلیم

گرامی نامہ ۶ مارچ کو ملا تھا، جواب دے دیا گیا تھا، امید ہے کہ مل گیا ہوگا ...... ان دنوں حضرت مولانا کی طبیعت ناساز رہی۔ اب خود انھوں نے اپنے قلم سے ایک مکتوب تحریر فرمایا ہے، جو مرسل[2] ہے۔

مولانا عبدالرزاق صاحب بلیح آبادی کو روپیہ پہنچ گیا ہے لیکن اس کے بعد انھوں نے آپ کو اپنے طور پر خط لکھا ہے، اور اپنا مسودہ واپس مانگا ہے۔

---

[1] میرے نام یہ آخری خط ہے جو مولانا نے اپنے قلم سے تحریر فرمایا۔

[2] یعنی خط ۱۴۳۔

میرا خلاصۂ سیرت بھی تیار ہے، امید ہے کہ مئی جون میں اس کی اشاعت کی کوئی سبیل نکل آئیگی۔ اس زمانے میں مجھے فرصت بھی ہو گی۔

نیاز مند

محمد اجمل خان

(۱۴۵)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۹ مئی ۵۱ء

مکرم و محترم جناب مہر صاحب، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ اپریل پہنچ گیا اور حضرت مولانا کا خط انھیں دے دیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو کتابیں ٹونک سے آئی ہیں، ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ آپ اپنی کتاب شائع کر دیں۔ ان کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصۂ سیرت تیار ہے۔ رائل سائز کے ۵۰،۳ صفحات ہونگے جو رائے ہو، جلد لکھیے۔ ملیح آبادی صاحب ملیح آباد گئے ہوئے ہیں۔ بہتر ہو تاکہ آپ انھیں براہ راست انڈین کلچرل کونسل، حیدر آباد ہاؤس کے پتے پر خط لکھ دیتے۔

اگر جواب خط نہیں، تو کم از کم رسید فوراً بھیج دیجیے۔

راقم

محمد اجمل خان

(۱۴۶)

۴ کنگ ایڈورڈ، نئی دہلی

۹ مئی ۱۹۸۱ء

مکرم و محترم زاد مجدکم، السلام علیکم

حسب ارشادِ حضرت مولانا آج ہی ایک خط روانہ کر چکا ہوں جس میں میں نے یہ لکھا ہے کہ آپ اپنی کتاب پریس کو دے دیں اور ان کتابوں کے دیکھنے کا انتظار نہ فرمائیں۔ حضرت مولانا نے ان کو دیکھا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔

مولانا ملیح آبادی کل پرسوں واپس آجائینگے۔ اپنے لڑکے کی شادی میں گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کے آنے پر آپ کا پیام پہنچا دونگا۔ بہتر ہوتا کہ آپ براہِ راست انڈین کلچرل کونسل، حیدر آباد ہاؤس، نئی دہلی کے پتے پر بھی انھیں لکھ دیتے۔

خلاصۂ سیرتِ قرآنی تیار ہے۔ یہ تقریباً ۳۷۵ صفحات رائل سائز کے (جس پر معارف چھپتا ہے) ہونگے۔ حضرت مولانا سات ہفتے باہر ہونگے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس درمیان میں یہ چھپ جائے اور میں خود ہندوستان میں اس کی کتابت اور تصحیح کرا دوں۔ اس سلسلے میں تقریباً بارہ تصویریں اور تین یا چار نقشے بھی ہونگے۔ جن کے بلاک بنوانے ہونگے۔

اردو کا حقِ طباعت، مناسب معاوضے کے عوض، میں دینے کو تیار ہوں۔ یہ صرف ایک اشاعت کے لیے ہوگا۔ آپ جتنی جلدیں چھاپنا چاہیں، چھاپ سکتے ہیں اور چھاپنے کے بعد چند سال کی مدت بھی متعین کر سکتے ہیں کہ اس درمیان میں نہ چھاپ سکوں۔ یا آپ سے دوبارہ معاہدہ کر سکوں۔ اس پہلی طباعت و اشاعت کے بعد کتاب کے حسابہ نقشوں اور تصویروں کے بلاک اور پلیٹیں مجھے

واپس کردی جائینگی۔

میں چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ یا اس کے خلاصے کا ترجمہ بھارت اور پاکستان کی مختلف زبانوں میں بھی کراؤں، اور انگریزی، عربی، فارسی، چینی، جاوی، برمی اور ملائی میں بھی ہو۔ ترجمہ کرانے کا انتظام یہاں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اگر ان زبانوں میں اشاعت کا کام بھی آپ کرسکیں تو جہاں تک ترتیب و ترجمہ کا کام ہے، وہ میں کرادونگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے لیے بنگالی زبان میں سیرت کا ترجمہ بہت کارآمد ہوگا، اس لیے کہ بنگالی زبان میں کوئی معقول کتاب اس سلسلے کی نہیں ہے۔ کلکتہ اور بردوان میں میرے چند احباب ایسے ہیں، جو بہت اچھی اُردو اور بنگالی جانتے ہیں۔ وہ ترجمہ کردینگے۔ البتّہ چینی میں ترجمے سے پہلے انگریزی ترجمہ شائع کرنا ضروری ہوگا۔

یہ ایک بہت بڑے انٹرنیشنل پبلشنگ کا کام ہے اور پانچ چھ سال تک آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔

البتّہ اُردو اشاعت کے لیے آپ اپنی تجاویز جلد بھیجیے۔ تاکہ معاملہ طے ہوجائے، اور آیندہ ہفتے سے کتابت کا کام شروع کرادیا جائے۔ اگر یہ معاملہ جلد طے نہ ہوسکا، تو میں ہند میں کسی نہ کسی صورت سے اس کی طباعت کا انتظام کرونگا، اس لیے کہ مجھے صرف سات ہفتوں کی مہلت ہے۔ اس میں سب کچھ کرنا ہے۔ کم ازکم رسیدِ خط سے مطلع فرمائیے اور جلد۔

نیازمند

محمد اجمل خان

(۱۴۷)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۱۱ مئی ۱۹۵۱ء

جناب محترم تسلیم

خلاصۂ سیرت بھی ۳۲۰ صفحات فل اسکیپ کا ہو گیا، جو تقریباً پانسو صفحات پر چھپ کر ہو گا۔ اس کے متعلق میں آپ کو پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اب اگر آپ اس کی طباعت کے مسئلے کو جلد طے کر سکیں، تو حضرت مولانا ۱۸ مئی کو روانہ ہو جائینگے اور میں چند ہفتوں میں اس کی کتابت اور تصحیح کرادونگا۔ چونکہ اتنی فرصت بعد میں مشکل سے ملیگی، لہٰذا جلد سے جلد جو کچھ تصفیہ ہو کر دیجیے۔ میں نے آپ کو پہلے جو خط لکھا تھا، اس کی رسید تک نہیں آئی۔

مولانا ملیح آبادی آ گئے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نے انھیں لکھا ہو گا۔ زیادہ نیاز۔ کم از کم رسید تو بھیج دیجیے، تاکہ معلوم ہو کہ کارڈ آپ کو پہنچ گیا۔

نیازمند

محمد اجمل خان

(۱۴۸)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۱۵۱ء

برادر محترم تسلیم

گرامی نامہ ملا۔ حضرت مولانا کے نام جو مکتوب تھا، وہ پیش کر دیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ آج کل مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ انشاءاللہ فرصت ہونے پر آپ کو

خط لکھئیگے ۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

مکرر
معلوم نہیں آپ کی کتاب چھپی یا نہیں؟ میری کتاب "مختصر سیرت قرآنیہ" سنگم کتاب گھر سے شائع ہوگئی ہے ۔ یہ سیرت کبیر کا خلاصہ ہے اور پونے تین سو صفحوں پر مشتمل ہے ۔غلط نامہ چھپ جائے، تو جناب کی خدمت میں بھیج دی جائیگی۔ آپ کے ملک میں اس کی اشاعت ہو، تو بہت مفید ہوگی۔ اس کے ذرائع پر تحریر فرمائیے ۔ امید کہ کوتاہ قلمی مانع نہ ہوگی۔

اجمل

(۱۴۹)

۱۴۹
۳۳۲

۴ کلنگ اڈورڈ روڈ ، نئی دہلی

۶ جون ۱۵ء

برادر محترم و مکرم تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۳۱ مئی ۲ جون کو ملا۔ آپ کی بیماری کی نوعیّت کیا ہے؟ خدا کرے جلد صحتیاب ہو جائیں ۔ اس کتاب طویل کا خلاصہ بھی نو سو صفحے ہو گیا تھا ۔ لہذا خلاصہ کا خلاصہ تیار کرنا پڑا، جو دو سو صفحوں سے کچھ زیادہ، کراؤن سائز پر ۳ پلیٹوں میں آجائیگا اور پلیٹوں پر جمع ادیا جائیگا، تاکہ جب جتنی ضرورت ہو چھپوائی جائیں ۔ ہزار جلدوں پر تقریباً پہلی مرتبہ ہزار روپیہ مع جلد صرف ہوگا۔ جو بھی قیمت رکھی جائے اور جتنی جلدیں چاہیں، پانچ سال تک چھپوائیں۔

پیشگی کوئی رقم معاوضہ نہ ہوگی، البتّہ رائلٹی ۵ افیصدی ہوگی۔ پانچ سال کے بعد تجدیدِ معاہدہ ہوسکیگی۔ صرف اُردو کی اشاعت کی اجازت ہوگی۔ بقیہ بیس زبانوں میں ترجمہ میں خود کراؤنگا۔ ان کے لیے بعد میں معاہدہ ہوسکتا ہے۔ انگریزی، عربی، فارسی، بنگالی میں آپ کو دلچسپی ہوسکیگی۔ بقیہ زبانیں ہند، چین، جاوا، برما وغیرہ سے متعلق ہیں۔ کتاب کو میں نے نہایت مختصر اور جامع کر دیا ہے۔ اگر آپ جلد جواب دے سکیں، تو بہتر ہے، ورنہ میں یہاں کسی نہ کسی طرح طباعت شروع کرادونگا۔ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سے بات چیت کر کے سب کتابیں خرید لیں۔ ابتدا میں صرف ایک ہزار چھپوانے کا قصد ہے۔ امید ہے جواب میں جلدی فرمائیے گا۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

(۱۵۰)

۴ کننگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲۰ دسمبر ۱۵ء

برادرِ محترم تسلیم

گرامی نامہ بلا تاریخ کل ملا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ آج کل کا موسم بھی اچھا ہے اور انھیں فرصت بھی ہے۔ آپ تشریف لاسکتے ہیں۔
کتابوں کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ پورے کتبخانے کو دہلی منتقل کرنے کا انتظام ہورہا ہے، جو انشاء اللہ آیندہ سال تک ہوجائیگا۔ مزید کتابیں

نہیں آئیں۔
مولوی عبدالرزاق صاحب معالجات میں کامیاب ہوکر دہلی آچکے ہیں[۱]۔

نیاز مند
محمد اجمل خان

(۱۵۱)

۴۔ کنگ ایڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۳ اکتوبر ۵۲ء

تسلیم

برادرم،
گرامی نامہ ملا۔ آپ کا مکتوب حضرت مولانا کو پہنچا دیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ آپ کیوں نہیں کسی موقع پر آتے اور چند روز ٹھہرتے؟ (اس سے زیادہ انھوں نے نہیں فرمایا)
یہ صحیح ہے کہ طباعت بہت خراب ہوئی ہے[۲]۔ غالباً بہت ہی ادنیٰ درجے کی چھپائی بھی اس سے بہتر ہو سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہاں کے چند مفلس خوشنویس اور پریس والے ہیں، جنھوں نے دام تو زیادہ لیے، مگر کام میں کوتاہی کی۔
اگر جناب سے ملاقات ہوئی تو چند اہم تحقیقاتیں زیر بحث لاؤنگا۔
ملیح آبادی صاحب تک آپ کا پیغام پہنچا دیا گیا۔ امید کہ مع الخیر ہونگے اور جلد آئینگے۔

---

[۱] بھائی عبدالرزاق صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے، اور مدت تک بمبئی میں زیر علاج رہ کر واپس آگئے تھے۔
[۲] یہ خان صاحب کی مرتبہ سیرت کا ذکر ہے۔

، کے کئی اخباروں کے پاس سیرت برائے تبصرہ بھیجی گئی۔ کسی نے اس
ت" پر توجہ نہیں کی۔ ہند میں عام رائے تو کوئی رائے ہی نہیں، البتہ چند
، ہیں، جیسے علمائے دیوبند اور بعض اخبارات (خلافت، صدقِ جدید
) ان سب نے اس سیرت کے مضامین کی فی الحقیقت سخت مخالفت کی ہے،
نہیں کر سکے، اس لیے کہ وہ شاید قرآن سے ان بیانات کا کوئی رد
سکے۔
، اہلِ علم اس کی تعریف بھی کرتے ہیں، مگر میں سب کو ناقابلِ اعتنا سمجھتا
اور دیکھ رہا ہوں کہ تیرہ سو سال سے قرآن مہجور ہے اور عوام کی رائے کا
، کے نام پہ غلبہ ہے۔

زیادہ نیاز
محمد اجمل خاں

(۱۵۲)

نگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
، فروری ۵۳ء

برادرِ محترم تسلیم

ی نامہ مورخہ ۲۵ فروری ملا، حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ جب آپ کو
ت ملے، آپ آ سکتے ہیں۔
آبادی صاحب کو سلام پہنچا دیا گیا، وہ بھی سلام کہتے ہیں۔
تِ قرآنیہ پر ابھی تک تبصرہ کہیں نہیں ہوا۔ اُمید کہ وہ آپ دیکھ چکے
گے۔

نیازمند
اجمل

(۱۵۳)

۴ کنگ ایڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۳۰ مارچ ۵۴ء

برادرِ محترم، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۲ مارچ ملا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ یہاں دو تین دن کے لیے آجائیں، تو ان سوالوں کے جواب زبانی مل جائیں[1]

امید کہ اب آپ اچھے ہوں گے!

نیاز مند

محمد اجمل خان

(۱۵۴)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲۳ جون ۵۴ء

برادرِ محترم، تسلیم

گرامی نامہ مہر زدہ ۲۱ جون ۵۴ء آج ملا۔ حضرت مولانا ۲۰ جون کو واپس تشریف لے آئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے مسودہ کے بھیجنے کا کوئی انتظام ہو جائے۔

سیرت کی کتاب نصف سے زیادہ ہو چکی ہے جو فارم تیار ہیں انھیں پلیٹوں پر بنوانے کا انتظام جلد کرنا چاہتا ہوں۔ چربہ لینے کے متعلق معلومات حاصل

[1] یہ سوالات خود مولانا کے سوانح کے متعلق تھے۔

،آپ کو اطلاع دونگا ۔
ی عبدالرزاق ملیح آبادی کو آپ کا سلام پہنچا دیا گیا ۔ وہ بھی سلام کہتے
۔آپ کا کب تک یہاں آنے کا قصد ہے ؟

اجمل

(۱۵۵)

جولائی ۶۵۴

برادر محترم ،
تسلیم
ی نامہ مورخہ ۱۰ جولائی پہنچ گیا تھا ۔منقولہ مضمون اور دوسرے کاغذات
ظار ہے جو اس مہینے کے اواخر میں کسی صاحب کے ذریعے یہاں پہنچینگے ۔
یہ مہینہ کل ختم ہو رہا ہے ۔ان کے آنے پر، ان ہی کے ساتھ آپ کی کتاب
نل بھی روانہ کر دونگا ۔ وہ نقل تیار رہے ،مگر کوئی صاحب ایسے نہیں
جن کے ہمراہ روانہ کرتا ۔ پوسٹ آفس سے ضائع ہونے کا خطرہ

ے تاریخ آزادیٔ ہند میں "وہابی تحریک" کا بھی ذکر ہے ۔ اس سلسلے میں آپ
علومات بہت کارآمد ہو سکتی ہیں ۔ آپ کچھ اشارات فرمائیں، تو یہاں
ری لکھنے والوں کو ادھر تحقیق کرنے پر لگا دیا جائے ۔
ر سید محمود صاحب اس سلسلے میں ۱۴ اگست سے دہلی آجائینگے ۔ گا
ت کی کتابت اس ماہ میں مکمل ہو جائیگی ۔ چربوں کی ضرورت نہ ہوگی
س لیے کہ پلیٹوں کا انتظام ہو گیا ہے ۔حضرت مولانا دعائے خیر
اتے ہیں ۔

یہاں بارش کے بعد موسم بہت اچھا ہوگیا ہے، آپ جب چاہیں تشریف لا سکتے ہیں۔

نیازمند
محمد اجمل خان

(۱۵۶)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۳ ستمبر ۶۵۴

برادرِ محترم، تسلیم
گرامی نامہ مع کاغذات بذریعہ ڈپلومیٹک بیگ پہنچ گئے۔ اطلاعاً تحریر ہے۔ حضرت مولانا کو مل گئے
ڈاکٹر سید محمود صاحب آگئے ہیں۔ پارلیمنٹ شروع ہے۔ حضرت مولانا بفضلہٖ بخیریت ہیں۔ امید ہے کہ آپ کے آنے میں اب زیادہ دیر نہ ہوگی۔
باقی سب خیریت ہے۔

اجمل

(۱۵۷)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۲۰ اکتوبر ۶۵۴

برادرِ محترم، تسلیم
آپ کی بیماری کی خبر سن کر مولانا کو افسوس ہے۔ دعا ہے کہ آپ جلد بصحت

ہو کر یہاں آسکیں۔

ڈاکٹر سید محمود صاحب کے پاس سید احمد بریلوی صاحب کے متعلق آپ کی معلومات روانہ کردی گئی ہیں۔ آپ کی کتاب اگر شائع ہو گئی ہو، تو مطلع فرمایئے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ ان کا جو مضمون "الہلال" سے نقل کرا کے آپ نے بھیجا ہے، اگر اس کا اصل پرچہ کسی قیمت پر ان صاحب سے مل سکتا، تو بہتر تھا اگر وہ فروخت نہیں کرنا چاہتے، تو ایک ماہ کے لیے عارضی طور پر اسے یہاں بھجوا دیں۔ دیکھنے کے بعد واپس کر دیا جائیگا۔ غالباً لاہور میں بہت لوگوں کے پاس وہ نمبر ہوگا۔[1]

میری کتاب وسیط (بلکہ کبیر کہنا چاہیے) ۴۸۰ صفحات پر کتابت ہو چکی ہے۔ اب پلیٹوں پر جمائی جارہی ہے۔

امید کہ آپ اس خط کی رسید بھیج دینگے

والسّلام

محمد اجمل خان

(۱۵۸)

۳۰ اکتوبر ۴۸ ۶۵

تسلیم

برادر محترم،

مولانا کو آپ کی بیماری کا حال معلوم ہو کر افسوس ہوا۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ

---

[1] یہ حجّت ابراہیمی والا مضمون ہے، جو "الہلال" کے دورِ ثانی میں چار نمبروں میں چھپا تھا۔ مولانا اسے تفسیر سورۂ فاتحہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ "الہلال" پاس نہ تھا۔ میں نے پہلے مضمون نقل کرا کے بھیجا، پھر پرچے ارسال کیے۔

اللہ آپ کو جلد شفا دے۔
اگر آپ کے پاس وہ جلد ہے، جس میں چاروں نمبر ہیں تو چند دنوں کے لیے عاریتاً دے دیں، مولانا دیکھ کر واپس کر دینگے۔
یا جس شخص کی جلد سے نقل کیا ہے، وہ عاریتاً دے دیں۔ اگر وہ چاہیں کہ اس کا کچھ معاوضہ ملے، تو مولانا اس کے لیے بھی تیار ہیں۔

نیاز مند
اجمل

(۱۵۹)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۸ دسمبر ۵۴ء

تسلیم

برادرم۔
آپ کا پوسٹ کارڈ ملا تھا۔ اس میں کوئی بات جواب طلب نہ تھی۔ بیماری کے لیے دست بدعا تھا اور ہوں۔ آنے کے متعلق پوچھنے کی ضرورت نہیں، آپ کا گھر ہے، جب جی چاہے، آیئے۔ حضرت مولانا اوریٔنیں اوائلِ جنوری میں یہیں ہونگے۔
میں نے پہلے بھی لکھا تھا، اب پھر گزارش ہے کہ حضرت مولانا شکر گزار ہونگے اگر الہلال بار دوم کے اُس نمبر کی کاپی ساتھ لا سکیں جس میں حضرت ابراہیم کی حجت کا مضمون نکلا تھا۔ اگر بقیمت ملے، تو مولانا قیمت دینے کو تیار ہیں۔ ورنہ عاریتاً ایک ماہ کے لیے مل جائے، پھر واپس کر دینگے۔
کتابیں امید ہے کہ روانہ کر دی ہونگی۔ آپ کی اور کتابوں کے لیے چشم براہ

ہوں۔

مولوی عبدالرزاق صاحب کو حلق کا سرطان ہو گیا تھا۔ جلد علاج پر توجہ ہوئی۔ ایک ماہ میں بمبئی سے اچھے ہو کر آ گئے۔ بجلی کے اثرات ابھی باقی ہیں۔ عود کرنے کا خطرہ نہیں ہے۔

مولانا آپ کی اس بے مثل کتاب کو شوق سے مطالعہ فرمائینگے[1]۔

نیازمند

اجمل

(۱۶۰)

۴ کننگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۳۰ دسمبر ۵۴ء

برادرِ محترم، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۴ دسمبر سے خیریتِ مزاج معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ دعا ہے کہ پوری صحت بھی ہو جائے۔

کتابیں ابھی تک نہیں پہنچیں، معلوم نہیں کیا وجہ ہوئی۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ وہ ضرور اس سے استفادہ کرینگے۔

قیمت کے سلسلے میں عرض ہے کہ اس کا تعلق اُس پرچہ سے تھا، جو کسی دوسری جگہ سے دستیاب ہو سکتا۔ یہ بات دوبارہ میں نے حضرت مولانا کے ارشاد پر لکھی تھی۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ بقیمت نہ ملے، تو ایک ماہ کے لیے وہ پرچہ جس میں حضرت ابراہیم کا "کرہے عاریتاً" مل جائے۔ اب پھر حضرت

[1] سیّد احمد شہید کی طرف اشارہ ہے۔

نے فرمایا ہے کہ سردست وہ پرچہ جس میں ذکر ابراہیم ہے، عاریتاً ایک ماہ کے لیے مل جائے تو بہتر ہے (یعنی آپ کا نہیں بلکہ اس شخص کا پرچہ جس کے پاس ہے)

مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ حسن" دس پرچوں کی جلد" کا آپنے ذکر کیا ہے جس میں ذکرِ ابراہیم ہے، وہ ضرور لیتے آئیے گا۔

آپ کے فائل کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ اُسے بھی اپنے ہمراہ لیتے آئیے گا۔ اس کے متعلق وہ آپ سے گفتگو کرینگے۔ اُن کی خواہش ہے کہ اسے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے کتبخانے میں محفوظ کر دیا جائے، تاکہ اس سے اور لوگ بھی استفادہ کر سکیں اور آپ کو ایک معقول رقم بطور تحفہ پیش کر دی جائے۔ بہرحال اگر کسی وجہ سے اتفاق نہ ہوا تو واپس لے جائیے گا۔

مولوی عبدالرّزاق صاحب کو آپ کا سلام پہنچا دیا گیا۔ وہ دوبارہ بمبئی گئے تھے اور اب بالکل اچھے ہیں۔

نیاز مند
اجمل

(۱۶۱)

۶ جنوری ۵۵ء

برادرِ محترم — نیا سال مبارک

حضرت مولانا ۱۳ جنوری کے بعد آخر ماہ جنوری تک دہلی میں نہ رہینگے۔ لہذا

لے یعنی "الہلال و البلاغ" کے فائل

ٹے یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے لکھ دیا تھا کہ کسی بھی قیمت پر فائل دینے کے لیے تیار نہیں۔

اوائل فروری میں یہاں آنے کا قصد کیجیے۔
آپ کی کتابیں اب تک یہاں نہیں پہنچیں۔
اس سے پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں "الہلال" وغیرہ کے مکمّل فائلوں کو جو آپ کے پاس ہیں، یہاں لانے کا ذکر ہے۔
امید ہے کہ دونوں خطوں کی رسید سے مطلع فرمائیے گا اور خیریتِ مزاج کی بھی خبر دیجیے گا۔

نیازمند
اجمل

(۱۶۲)

۲۶ جنوری ۵۵ء

برادرِ محترم تسلیم
۲۸ دسمبر کا خط مل گیا۔ حضرت مولانا مدراس کانگرس گئے ہوئے تھے کل واپس تشریف لائے ہیں۔ بہت اچھا ہوا کہ آپ کو وہ فائل مل گیا جس کی مولانا کو ضرورت تھی۔
آپ کتابوں کو ہمارے ہائی کمشنر کے حوالے کر سکتے ہیں۔ وہ یہاں مولانا کے نام بھیج دینگے۔ افسوس ہے کہ کتابیں یہاں نہ پہنچیں۔
بہرحال مولانا فرماتے ہیں کہ آپ جب چاہیں یہاں آئیں۔ باقی عندالملاقات
اجمل

(۱۶۳)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۴ اپریل ۶۵۵

برادرِ گرامی قدر، تسلیم

آپ نے عنوانِ خط پر صرف لاہور لکھا ہے۔ کتابوں کا ریویو مجھے نہیں ملا۔ نہ وہ تجاویز پہنچیں، جن میں آپ نے طباعت کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ خیر سگالی مشن آیا تھا، حضرت مولانا سے ملاقات ہوگئی۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔ حضرت مولانا کو آپ کا سلام پہنچا دیا گیا۔ دعاے خیر کرتے ہیں۔ امید کہ آپ اپنا پتہ تحریر فرمائینگے۔

نیاز مند

اجمل

(۱۶۴)

نئی دہلی، ۴ کنگ اڈورڈ روڈ

۴ اپریل ۶۵۵

برادرِ مکرّم و محترم تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۳ مارچ ملا تھا۔ امید کہ اس موسم گرما میں اوجاع میں شدّت کم ہوگئی ہوگی۔ خدا کرے کہ یہ رکاوٹیں جلد دور ہوں اور آپ جلد تشریف لاسکیں۔

محمد عبداللہ بٹ کا پتہ معلوم ہو تو تحریر فرمائیے گا۔

اجمل

(۱۶۵)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲ مئی ۵۵ء

برادرِ محترم تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۵ اپریل کا شفِ حالات ہوا۔ حضرت مولانا کو آپ کی حالت سے بہت رنج ہوا۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جلد صحتِ کامل عطا فرمائے۔ گو ابھی قطعی طور پر طے نہیں ہوا ہے لیکن مولانا ابھی مئی کے آخر میں باہر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اگر سفر کی صورت پیش آئی، تو پھر آپ سے جولائی میں ملاقات ہوگی، اگر آپ انشاء اللہ اس موقع پر بخیریت آسکے۔

"الہلال" کی جلدوں کے متعلّق یہ فرمایا ہے کہ آپ مناسب سمجھیں تو بھیج دیں۔ لیکن "الہلال" بارِ دوم کے وہ پرچے جن میں ان کا مضمون حضرت ابراہیم اور نام نہاد نمرود کے مناظرے کے متعلق نکلا تھا، خاص طور پر انھیں فوراً مطلوب ہے۔ آپ نے اسے نقل کرا کے بھیجا تھا، مگر مولانا چاہتے ہیں کہ اصل پرچہ دو ہفتے کے لیے انھیں مل جائے۔ اس کے بعد وہ واپس کر دینگے۔ مہربانی فرما کے رجسٹرڈ انھیں بھجوا دیجیے۔ تاکہ ہفتہ عشرہ کے اندر انھیں مل جائے۔ کتابیں ابھی نہیں پہنچیں۔ باقی خیریت ہے اور دعا ہے کہ خدا آپ کو شفائے عاجل عطا فرمائے!۔

نیازمند

اجمل

(۱۶۶)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۲۱ مئی ۵۵ء

برادر محترم، تسلیم

حضرت مولانا ۲۳ مئی کو بمبئی تشریف لے جائینگے اور وہاں سے ۲۵ مئی کو بذریعۂ سٹیمر لندن روانہ ہو جائینگے۔ وہاں سے دو تین ہفتے کے بعد فرانس، سوئٹزرلینڈ، اٹلی ہوتے ہوئے واپس ہونگے۔ آپ اس درمیان میں ہائی کمشنر لندن کے ذریعہ ان کا پتہ معلوم کر سکتے ہیں۔

آپ کی کتابیں ابھی نہیں پہنچیں۔ نہ اب آپ کے آنے کی امید ہے۔ آپ نے جو کتاب نقل کرائی تھی، وہ مسودہ رکھا ہوا ہے۔ جو صاحب سیرۃ سید شہید لائینگے۔ انھیں دے دیا جائیگا۔ کاتب صاحب اُجرت کے جلد خواہشمند ہیں۔

جن ۴۔۱۸۹۳ء کے پرچوں کے متعلق آپ نے لکھا ہے، ان کی ضرورت حضرت مولانا کو نہیں ہے۔

سیرۃ قرآنیہ کتابت شدہ تیار ہے۔ طباعت کاغذ کی قلت کی وجہ سے تعویق ہے۔ زیادہ نیاز

دعا ہے کہ آپ جلد صحت پا کر ہند آ سکیں۔

راقم
محمد اجمل خان

(۱۶۷)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۴ جون ۶۵۵

برادرِ محترم، تسلیم

آپ نے جو دو جلدیں "سیّد احمد شہیدؒ" کی روانہ فرمائی ہیں، وہ پہنچ گئیں اور ان کے ساتھ "الہلال" کی ایک جلد بھی پہنچی۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ حضرت مولانا ۲۳ کی صبح کو بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو گئے اور یہ کتابیں ۲۳ کے بعد ملیں۔ حضرت مولانا غالباً ۱۲ جون تک لندن پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے معلوم کرونگا کہ آیا یہ کتابیں وہاں بھیجی جائیں یا اُن کی آمد کے انتظار میں یہاں رہیں۔ ان کا قیام دو ہفتہ (غالباً) لندن میں رہیگا۔ آپ ہائی کمشنر آف انڈیا، انگلینڈ، لندن کے پتے پر انھیں چاہیں، تو لکھ سکتے ہیں۔

اُمید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میری وسیط سیرتِ قرآنیہ ۵۰۰ صفحوں سے زیادہ کتابت ہو چکی ہے۔ آپ کے انتظار میں پبلشر کا انتظار رہا۔ اب آپ کی جو رائے ہو، کیا جائے۔ اگر آپ ولایت تشریف لے گئے، تو کب تک واپسی کا ارادہ ہے؟ آپ نے جن صاحب کے متعلق لکھا تھا کہ وہ آئینگے اور آپ کا مسودہ لے جائینگے، وہ تشریف نہیں لائے۔ مسودہ جوں کا توں رکھا ہوا ہے۔ غالباً آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ایک صاحب کا ذکر کیا تھا، جو پرانے رسالے فروخت کرنا چاہتے تھے۔ اب معلوم نہیں وہ کب آئینگے۔

لہ میں بھی ولایت جا رہا تھا لیکن بیوی کی شدید علالت کے باعث رُک گیا اور یہ علالت تین سال تک عناں گیر رہی۔ ۱۱ اگست، ۵۸ء کو اس کی وفات ہوئی۔

جن صاحب نے نقل کی ہے، وہ نقل کی اُجرت کے امیدوار ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ستمبر سے پہلے یہ رقم مل جائے، تاکہ وہ مصر جا سکیں۔ انھیں ایک وظیفہ مل گیا ہے، عربی پڑھنے جائینگے۔

زیادہ نیاز
اجمل

(۱۶۸)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۹ اگست ۵۵ء یوم جمعہ

برادرِ محترم، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۱۴ اگست ملا۔ اس سے پہلے بھی ایک کرمنامہ ملا تھا، جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آپ بہت جلد ولایت جانے والے ہیں۔ آج کے خط میں آپ نے اپنی صحت کا حال نہیں لکھا۔ خدا کرے، آپ اچھے ہو گئے ہوں۔
عبدالرزاق ملیح آبادی صاحب کا لاہور جانے کا کوئی ارادہ تھا، نہ ہے اب وہ سرطان سے بالکل بچ گئے ہیں اور تندرست ہیں۔ البتہ ان کا سادہ ضرور بُرجِ سرطان میں ہے۔

عامر انصاری صاحب نے آپ کی کتاب نقل کی ہے۔ وہ نقل بذریعہ سرکار آپ کے پاس کل پرسوں میں پہنچ جائیگی۔ رسید سے مطلع فرمائیے گا۔ نقل کرنے کی اُجرت کو انھوں نے آپ ہی پر چھوڑا ہے، جو مناسب سمجھیے۔ وہ عنقریب عربی تعلیم کے وظیفے پر مصر جانے والے ہیں۔
حضرت مولانا نے آپ کی کتاب پڑھ ڈالی، اور میں نے بہت پہلے پڑھ لی تھی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ لکھنے کی مہلت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ کو مہلت ملے، تو چند دنوں کے لیے دہلی آجائیں۔
رسیدِ خط سے مطلع فرمائیے۔

زیادہ نیاز
اجمل

(۱۶۹)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۷ ستمبر ۵۵ء
برادرِ محترم زیدت المکارم تسلیم

۲۱ اگست کا گرامی نامہ کاشفِ حالات ہوا تھا۔ میں نے عامر انصاری صاحب سے معاوضہ کتابت کے متعلق باصرار پوچھا، تو انھوں نے کہا کہ عہ فی صفحہ کے حساب سے ۲۰۰ صفحوں کی کتابت تین سو (۳۰۰) روپے ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ۲۳ ستمبر کو مصر جانے والے ہیں لہٰذا اب انھوں نے یہ بتایا ہے۔ پہلے کچھ بتاتے ہی نہ تھے۔ اگر (۲۲) تک کچھ انتظام ہو سکے، تو بہتر ہوگا۔

حضرت مولانا نے کوئی علیحدہ خط تحریر نہیں فرمایا۔ وہ منتظر ہیں کہ آپ تشریف لائیں، تو بالمواجہ گفتگو ہو، اور جو کچھ وہ فرمانا چاہتے ہیں فرمائیں۔ امید کہ آپ کی بیگم صاحبہ کی طبیعت اب درست ہو گئی ہوگی اور آپ جلد دہلی آسکیں گے۔
کتاب کے متعلق میری ناچیز رائے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں جو کچھ لکھوں گا، عقیدت سے لکھوں گا اور حضرت مولانا کی رائے کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔ بہتر ہو کہ آپ ایک ہی رائے لکھیں اور وہ صرف مولانا کی رائے ہو۔

خوشی ہوئی کہ تیسری جلد بھی تیار ہو گئی ہے اور کتابت کے لیے جا رہی ہے۔ باقی عند الملاقات۔

حضرت مولانا بفضلہٖ بخیریت ہیں یہاں موسم بہت اچھا ہے۔ امید کہ آپ جلد تشریف لائینگے۔

اجمل

(۱۷۰)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۸ اگست ۵۵ء

جناب محترم۔ تسلیم

کتاب اخبار مولوی محمد نصیر الدین قلمی کی نقل ارسال خدمت ہے۔ عامر انصاری صاحب نے اس کی نقل کی۔ وہ کہتے ہیں کہ نقل کرنے کی اُجرت جو مناسب سمجھی جائے وہ دے دی جائے۔

حضرت مولانا بفضلہٖ بخیریت ہیں۔ وہ علیحدہ ایک خط تحریر فرما رہے ہیں۔ براہِ کرم اس نقل کی رسید سے مطلع فرمایا جائے۔

نیاز مند محمد اجمل خان

(۱۷۱)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۷ نومبر ۵۵ء

مکرّم و محترم تسلیم

ابھی آپ کا کارڈ ۱۴ نومبر کا مرسلہ پہنچا۔ مولانا کا کہیں باہر جانے کا پروگرام

نہیں ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔

رہ گیا کتاب کی اُجرت کا معاملہ، تو وہ صاحب عرصہ ہوا، مصر جا چکے۔ ان کے بھائی یہاں ہیں۔ جو مناسب ہو، دے دیا جا سکتا ہے۔

اگر جناب کو مولوی عبدالرحیم صاحب، زمزم کمپنی لمیٹڈ، لاہور کا صحیح پتہ معلوم ہو، تو تحریر فرمائیں۔ انھیں ایک خط بھیجا گیا تھا، جو واپس آ گیا اور اگر ان سے فون پر ملاقات ہو سکے، تو فرما دیجیے گا کہ حضرت مولانا کی رائلٹی کی رقم بذریعہ بنک یا بذریعۂ اشخاص دہلی وہ روانہ کر سکتے ہیں۔ مگر انھوں نے پھر نہ خط لکھا، نہ دہلی کے کسی صاحب نے کچھ لکھا۔

اُمید کہ آپ بالکل اچھے ہو گئے ہونگے اور جلد دہلی تشریف لائینگے۔

نیاز مند
اجمل

(۱۷۲)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۳ فروری ۵۶ء

برادرِ محترم   تسلیم

میں آپکے گزشتہ خط کا جواب دے چکا ہوں۔ حضرت مولانا ان دنوں بہت مصروف ہیں۔ پھر ادھر کانگرس میں جانا ہے، اس کے بعد پارلیمنٹ شروع ہے۔ غرض کہ مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔ جونہی وہ کچھ لکھ دینگے، میں آپ کی خدمت میں بھیج دونگا۔[۱]

[۱] یہ میری کتاب "سید احمد شہید" کے متعلق مولانا کی رائے کا معاملہ ہے۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ وہ کچھ لکھ دینگے۔

ضرورتِ تحریر یہ ہے کہ مولوی عبدالمجید سالک صاحب نے کوئی کتاب "یارانِ کہن" لکھی ہے جس میں بعض بے بنیاد باتیں مولانا کے متعلق درج ہیں مثلاً یہ کہ مولانا ان کی کتب سے بہت متاثر ہوئے یا جنازہ کے ساتھ قادیان گئے وغیرہ دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ خود سالک صاحب اس کی تردید کر دیں[1]۔
سیرتِ رسولِ عربی کی رسید ابھی نہیں آئی۔ امید ہے کہ پہنچ گئی ہوگی۔ اور آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔
ممنون ہونگا، اگر اس خط کی رسید آپ بھیج دیں۔

نیازمند
محمد اجمل خاں

(۱۷۳)

۶ فروری، ۵۶ء

برادرِ محترم، تسلیم
گرامی نامہ مورخہ یکم فروری ملا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ کانگرس سے واپسی کے بعد (۱۴ فروری تک) آپ کو لکھینگے
ہمایوں کبیر صاحب چھٹی پر ہیں۔ وہ آجائیں، تو ان کے دادا دُودُو میاں کا شجرہ آپ کو بھجوادوں اور تحریک[2] کے حالات بھی ان سے لکھوا کر بھیج دونگا۔
خدا کرے آپ کا پورا خاندان بخیر و عافیت ہو۔
اس سے پہلے میں خط متعلقِ "یارانِ کہن" لکھ چکا ہوں، امید کہ ملا ہوگا۔

نیازمند
اجمل

---
[1] تردید کر دی گئی تھی۔
[2] فرائضی تحریک

(۱۷۴)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲۹ فروری ۵۶ء

برادرِ محترم تسلیم

آپ کے خط کا بذریعۂ ڈاک جواب دے چکا ہوں اور ایک کتاب بھیج چکا ہوں۔ اب دو جلدیں اور ارسالِ خدمت ہیں۔ ان میں سے ایک عزیزی شورش کو اور دوسری مکتبۂ بیت الحکمت کو، یا جسے آپ مناسب سمجھیں، دے دیں۔ یہ کتاب میری بست سالہ محنت و کاوش کا نچوڑ ہے۔ اگر ممکن ہو اور چند اخبارات میں اس کا ذکر آجائے، تو بہتر ہے۔

میں نے ہائی کمشنر پاکستان سے معلوم کیا تھا کہ پاکستان میں کتابوں کے جانے پر کیوں پابندی ہے، خصوصاً ایسی کتابوں پر جو مذہبی ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ "جو صاحب آپ کی کتاب منگوانا چاہیں وہ مجھے لکھیں میں معاملہ طے کرا دونگا" غرض کہ اگر اس کتاب کو پاکستان میں عام کیا جا سکے تو "میری راے میں" یہ اسلام کی ایک خدمت ہوگی۔

جن پبلشر کا نام میں نے کتاب میں دیا ہے، وہ اگر اس کے حربے یا پلیٹیں چاہیں، تو ہائی کمشنر سے کہہ کر منگوا سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ انھیں اس پر توجہ دلائیں۔

مولانا کا Blood Pressure[1] بہت بڑھ گیا تھا۔ دو ہفتے سے فریش ہیں۔ سب کام بند ہیں۔ ڈاکٹروں کا مشورہ ہے کہ مکمل آرام کریں۔ کل سے

[1] بلڈ پریشر یعنی خون کا دباؤ

دباؤ نارمل ہے۔ آرام کے بعد انشاء اللہ بالکل اچھے ہو جائینگے۔ اس سے بعد آپ کو یاد فرمائینگے۔

میں نے سیرت کا ایک انگریزی خلاصہ بھی تیار کیا ہے، اگر اس کے لیے آپ کے یہاں کوئی پبلشر ہو، تو مسودہ بھیج دوں۔ زیادہ نیاز

شورش اگر ملیں تو سلام پہنچا دیجیے گا اور پوچھ لیجیے گا کہ ہندو فلسفہ پر مضامین کس پتہ پر بھیجوں، یعنی ایسا ذریعہ ہو کہ حفاظت سے وہ پہنچ جائیں۔

اجمل

(۱۷۵)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲۷ مارچ ۵۶ء

برادرِ محترم تسلیم

حضرت مولانا بفضلہٖ رو بصحت ہیں، اگرچہ انھیں قطعی آرام کرنے کی ہدایت ہے اسی لیے وہ دفتر یا پارلیمینٹ بھی نہیں جانے پاتے۔

آپ کے خط سے ۔۔۔۔۔ کے کوٹھیوں کے حالات معلوم ہوئے۔ اور جب آپ یہاں تھے، تو زبانی بھی معلوم ہوا تھا اور خود ۔۔۔۔۔ کے متعلق آپ مولانا سے زبانی کہہ چکے ہیں۔ اس سوال کو مولانا نے کیبنٹ سب کمیٹی میں اٹھایا اور کافی بحث ہوئی اور معلوم ہوا کہ اس طرح کے اور معاملے بھی ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اس خاص معاملہ میں نیا طرزِ عمل نہیں اختیار کیا جا سکتا۔

لیکن بہرحال اگر ۔۔۔۔۔۔۔ چاہتے ہیں کہ یہ معاملہ عارضی طور پر ملتوی ہو جائے تو وہ اپنا ریپریزینٹیشن منسٹری ہیلی ٹیشن (محکمۂ آبادکاری) کو بھیج دیں۔

کہ میں متروکہ جائیداد کے متعلق یہ چاہتا ہوں (یعنی اس کی نوعیت بدستور قائم و بحال رہے) حضرت مولانا پھر اس پر توجہ فرمائینگے۔
بیت الحکمت کو میں کتاب روانہ کرا دونگا۔ امید کہ آپ مع الخیر ہونگے۔

نیازمند
اجمل

(۱۷۶)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۸ نومبر ۵۶ء

برادر محترم، تسلیم

۷ نومبر ۵۶ء کا گرامی نامہ کاشفِ حالات ہوا۔ خدا کرے کہ آپ اور بیگم صاحبہ اب بالکل اچھے ہوں!
حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ آپ کے یہاں تشریف لانے کا مناسب وقت جنوری کے بعد ہوگا۔
"جماعتِ مجاہدین" مجھے مولوی حبیب الرّحمان صاحب لدھیانوی کی معرفت مل گئی تھی۔ حضرت مولانا کو اس کا نسخہ نہیں ملا۔ شاید آپ اپنے ہمراہ لانے والے تھے۔[۱]
جن صاحب نے آپ کی ایک کتاب نقل کی تھی، وہ مصر سے کل واپس آ گئے ہیں۔ اور اُجرت کے لیے عرض پرداز ہیں۔

[۱] مجھے اتفاقیہ تین چار دن کے لیے دہلی جانے کا موقع مل گیا تھا اور مولانا کی خدمت میں خود ایک نسخہ پیش کر آیا تھا۔

اُمید کہ آپ جواب میں بطورِ رسید کے ایک پوسٹ کارڈ بھیج دینگے۔

راقم
محمد اجمل خان

(۱۷۷)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی
۱۵ دسمبر ۵۶ء

برادرِ محترم، تسلیم

حضرت مولانا سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ مجھ سے مسامحت ہوئی، کتاب مل گئی تھی۔

مولانا ظفر علی خان صاحب کے متعلق آج اختر صاحب کو لکھ رہا ہوں۔ ان کے پوتے کو پہلے لکھ چکا ہوں۔

مولانا کو اور اس خادم کو سید عبدالجبار صاحب کے انتقال کی خبر سے بہت افسوس ہوا۔ مولانا ان سے خوب واقف تھے۔

کتاب کے متعلق آپ جو بھی مناسب فیصلہ کر دیں، وہی مناسب ہوگا۔ جن صاحب نے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ معمولی صفحات کے نقل کرنے کے لیے ۸ر فی صفحہ یہاں مقرر ہے۔

امید ہے کہ ۱۰ جنوری کے بعد آپ سے ملاقات ہوگی۔ سالانہ اجلاس کانگرس ۱۰ کو ختم ہوگا۔

زیادہ نیاز
اجمل

(۱۷۸)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۷ جنوری ۵۷ء

برادرِ مکرّم، تسلیم

۳۱ دسمبر کا مکتوب ملا۔ "الہلال" کی سات جلدیں بحساب ۵۰ روپیہ فی جلد خرید لیجیے اور یہاں بھجوا دیجیے۔ مولانا کی طرف سے قیمت دے دی جائیگی۔
مولانا دعائے خیر کرتے ہیں۔ سیرت کی پلیٹیں یہاں موجود ہیں، آپ جب چاہیں منگوا لیں۔

نیازمند
محمد اجمل خان

(۱۷۹)

۴ کنگ اڈورڈ روڈ، نئی دہلی

۲۱ مئی ۵۷ء

برادرِ محترم، تسلیم

ایک سٹ حضرت مولانا کے لیے اور ایک میرے لیے ڈاک سے آچکا تھا کہ دوسرا سٹ دونوں کے لیے دستی پہنچا۔ اس کا شکریہ قبول فرمائیے۔ اگر اجازت ہو تو دوسرا سٹ کتبخانوں کو دے دیا جائے۔
حضرت مولانا ان کتابوں کو دیکھ رہے ہیں، اور موقع ملتے ہی ضرور لکھینگے۔
انھوں نے فرمایا ہے کہ آپ ۱۵ اگست کے بعد دہلی آنے کا قصد کر سکتے ہیں۔

براہِ کرم تاریخ کا تعین کرنے کے بعد مطلع فرما دیجیے گا۔ امید کہ اب آپ اور آپ کی بیگم صاحبہ بالکل بخیر و عافیت ہونگے [1]

نیاز مند
محمد اجمل خاں

(۱۸۰)

میں نے ایک عریضے میں دو باتیں پوچھی تھیں:

۱۔ آپ نے "غبارِ خاطر" میں ایک جگہ عرفی کا ایک شعر بہ تغیرِ الفاظ درج فرمایا، یعنی:

من از "یں رنج گرانبار" چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

میں نے اسے یوں دیکھا ہے:

من از "یں درد گراں مایہ" چہ لذت یابم
کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

بدلا ہوا ٹکڑا اصل سے بہتر معلوم نہیں ہوتا، پھر اس کے بدلنے کی وجہ کیا تھی؟

۲۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر تبصرہ لکھا تھا۔ کیا یہ دیوان بہت اچھا ہے نیز کیا اس تبصرے کا کوئی حصّہ آپ کے

---

[1] میں اپنی بیوی کی وفات کے باعث جا نہ سکا۔ فروری یا مارچ ۱۹۵۸ء میں جانے کا قصد تھا کہ مولانا اچانک بیمار ہوئے اور تیسرے دن سفرِ آخرت پیش آگیا۔

سودات میں موجود ہے ؟
واب میں فرمایا :
ہوسکتا ہے میرے حافظے میں وہی الفاظ ہوں، جو میں نے لکھ دیے۔
گر آپ نے دیوان عرفی دیکھا ہے تو وہی الفاظ ٹھیک ہیں[۹۰] [1]
رف جہاں قزوینی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے فارسی شاعری میں
قوعہ گوئی کے طرز کی بنیاد ڈالی۔ وقوعہ گوئی اس معاملے میں بولا جاتا
ہے، جس معنی میں اُردو میں معاملہ بندی کہتے ہیں۔ اس کے مسودات
ضائع ہو گئے۔ موجود نہیں ہیں۔

ن عرفی کے جتنے نسخے میری نظر سے گزرے، ان میں سے کسی میں بھی یہ شعر نہیں ملا
دش نے "کلمات الشعرا" میں لکھا ہے ناصر علی سرہندی سے جب پوچھا گیا، عرفی کا
ترین شعر کونسا ہے تو اس نے یہ شعر لکھ دیا تھا۔ اس امر کا ذکر متعدد اصحاب نے
ہے۔

حواشی

از

مالک رام

عبدالرّزاق کانپوری

۱۔ عبدالرّزاق کانپوری :

نسباً فاروقی تھے۔ ان کے خاندان کا مسقط الرّاس یوپی کا شہر فرخ آباد تھا جہاں سے ان کے والد منشی الٰہی بخش مضطر (مشہور منجّم اور رمّال)، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد نقل مکان کرکے کانپور چلے آئے۔ منشی صاحب موصوف انبالہ چھاؤنی میں مقیم تھے کہ وہاں جمعہ ۱۷ رمضان ۱۲۹۱ھ (۲۸ اکتوبر ۱۸۷۴ء) کو عبدالرّزاق پیدا ہوئے[۵]۔ ان کی نشو ونما ننھیال فتحپور ہسوہ میں ہوئی اور تعلیم کا بیشتر زمانہ بھی وہیں بسر ہوا۔

فارسی کی تکمیل کرلی تھی اور عربی متوسطات زیر مطالعہ تھیں کہ ۱۸ برس کی عمر میں وہیں فتحپور کے مدرسے میں فارسی، حساب اور ابتدائی عربی پڑھانے پر

---

۵ مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق ولادت ۱۸۶۳ء میں ہوئی (یادِ رفتگاں: ۴۰۴)۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اگست ۱۸۷۴ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے (مکاتیب ابوالکلام (مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری): ۳۵۸) اور یہ تین کی روایت ابوالخیر مودودی کی ہے، جو ان کے ملنے والے تھے (نقوش، شخصیات نمبر (۲) : ۱۴۷۷)

ملازم ہو گئے۔ لیکن ان کے والد منشی الٰہی بخش کو یہ منظور نہ ہوا۔ انھوں نے کہا: میں انھیں ملّا نہیں بنانا چاہتا۔ اور مدرسے کا تعلق منقطع کر کے انھیں اپنے ساتھ کانپور لے گئے۔ یہاں یکے بعد دیگرے کلکٹری میں اہلمدی (۱۸۸۹۔ ۱۸۹۶ء) پھر میونسپل کمیٹی میں سررشتہ داری (۱۸۹۶۔ ۱۹۰۷ء) میں سترہ اٹھارہ برس بسر ہوئے۔

کانپور کے قیام کے زمانے میں مولوی محمد علی مونگیری (بانیٔ ندوۃ العلما) سے کچھ حدیث پڑھی اور مدرسۂ فیضِ عام سے درسِ نظامی کی سند حاصل کی۔ یہی زمانہ ہے جب شبلی نے سلسلۂ فرمانروایانِ اسلام کی بنیاد ڈالی۔ 'المامون' شائع ہو چکی تھی؛ اور 'الفاروق' کا چاروں طرف غلغلہ تھا۔ اس کے تتبّع میں عبدالرّزاق کو سلسلۂ وزراے اسلام لکھنے کی سوجھی۔ اتفاق سے انھیں ایام میں "مرقعِ عالم" (ہردوئی) میں اس کے ایڈیٹر حکیم محمد علی طبیب کا ناول "جعفر عبّاسہ" بالاقساط شائع ہونے لگا۔ عبدالرّزاق کو اس کے بعض مقامات پر اعتراض تھا۔ انھوں نے اس کا جواب لکھنا شروع کیا، جو بڑھتے بڑھتے ایک کتاب کا مواد بن گیا۔ یہی بعد کو 'البرامکہ' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا؛ اور یوں "سلسلۂ وزراے اسلام" کی بنیاد پڑ گئی۔ عبدالرّزاق کے منشی رحمت اللہ رعد، مالک 'نامی پریس' کانپور سے بڑے گہرے تعلّقات تھے۔ البرامکہ سب سے پہلے اسی مطبع 'نامی پریس' سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ اور اتنی مقبول ہوئی کہ لوگ مصنّف کا اصلی نام بھول گئے اور انھیں البرامکہ کہنے لگے۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں بھوپال پہنچے۔ نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ ریاست نے قدردانی فرمائی اور انھیں اپنی ریاست میں تحصیلدار مقرّر کر دیا۔ یہیں بھوپال میں انھوں نے "سلسلۂ وزراے اسلام" کی دوسری کتاب 'نظام الملک طوسی'

۱۹۱۳ء میں شائع کی جس طرح شبلی اپنا سلسلہ المامون اور الفاروق ہی تک لکھ کے رہ گئے۔ اسی طرح عبدالرزاق بھی ان دو کتابوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ۱۹۱۷ء میں نواب بیگم بھوپال نے انھیں منتظم تاریخ بھوپال کے عہدے پر فائز کر دیا۔ سر راس مسعود کے زمانۂ وزارت میں انھوں نے "تاریخ بھوپال کی" تالیف و ترتیب کا کام ہاتھ میں لیا تھا، لیکن چونکہ سر راس مسعود کا زمانہ ہی ختم ہو گیا، اس لیے یہ منصوبہ بھی انھیں کے ساتھ غت ربود ہو گیا۔

عبدالرزاق نے تاریخ اسلام پر معتدبہ کام کیا۔ البرامکہ اور نظام الملک طوسی کے علاوہ، تاریخ تاشر جلالی، عہد جاہلیت، عہد خلافت راشدہ شائع ہو چکی ہیں۔ اپنی یادداشتیں بھی قلمبند کی تھیں، جو 'یاد ایام' کے عنوان سے طبع ہو کر مشہور ہوئیں۔

ان کی بیٹی کی بھوپال میں شادی ہوئی تھی۔ آخری ایام میں انھیں کے ساتھ قیام تھا۔ لمبی بیماری کے بعد ۱۷/۱۸ فروری کی درمیانی شب میں بھوپال میں انتقال کیا۔ اور وہیں امن شاہ کے تکیہ میں سپردِ خاک ہوئے۔ (یادِ رفتگاں (سید سلیمان ندوی : ۴۰۴-۴۰۹)؛ نقوش (شخصیات نمبر (۲) : ۱۴۷۷-۱۴۸۱؛ مکاتیب ابوالکلام (ابوسلمان شاہجہانپوری) : ۳۵۸-۳۵۹۔)

۲۔ مولانا عبدالرزاق کانپوری نے ایک مبسوط تاریخ اسلام مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ بہت کچھ لکھ بھی لیا تھا۔ لیکن یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔

۳۔ (ترجمہ) کسی کام میں اپنی بساط بھر کوشش کرنا میرا فرض ہے۔ اور اس کی تکمیل (اور اس پر اجر) اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

۴۔ یہ ندوۃ العلماء کے ساتویں اجلاس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اجلاس ۱۱-۱۲-۱۳ رجب ۱۳۱۸ھ (مطابق ۴-۵-۶ نومبر ۱۹۰۰ء) کو پٹنہ میں منعقد ہوا۔

تھا۔ مولانا احمد حسن کانپوری (خلیفۂ حضرت مولانا حاجی امداد اللہؒ) اس کے صدر تھے۔ اس اجلاس کے مفصّل حالات تاریخ ندوۃ العلما مصنّفہ مولوی محمد اسحاق جلیس ندوی (حصّہ اوّل: ۲۱۸ - ۲۶۰) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس خط پر تاریخ نہیں تھی۔ اس کا تعیّن بھی اسی جگہ سے ہوتا ہے۔ مولانا آزاد نے یہاں ندوہ کے اس اجلاس میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ گویا یہ خط اس تاریخ سے پہلے لکھا گیا تھا اور وہ بھی قریب کے زمانے میں۔ پس، غالباً یہ اکتوبر ۱۹۰۰ء کی کوئی تاریخ ہوگی۔

اس وقت تک کے دستیاب خطوں میں مولانا آزاد کا یہ سب سے قدیم خط ہے۔

۵۔ تقی الدین سبکی کی کتاب طبقات الشافعیہ مراد ہے، جس کا پہلا اڈیشن اُس وقت تک قاہرہ (مصر) میں چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔ اب اس کا زیادہ اہتمام سے مرتبہ دوسرا اڈیشن بھی وہیں سے شائع ہوا ہے۔

۶۔ بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ 'غلام' کا سابقہ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام کا جزو نہیں تھا۔ اس قدیم ترین خط میں ان کا دستخط میں "غلام" کا استعمال اُن کی تغلیط کے لیے کافی ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ خیال ٹھیک نہیں ہے۔ یوں بھی دیکھا جائے، تو ان کے والد مولانا خیرالدین کے مزاج اور معتقدات کی جو افتاد تھی، اس کے پیشِ نظر ان کا اپنے دونوں بیٹوں کے نام میں 'غلام' کے سابقے کا اضافہ بالکل درست تھا۔ انھوں نے بڑے بیٹے کا نام غلام یٰسین رکھا اور چھوٹے کا غلام محی الدین احمد۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا آزاد نے بعد کو اسے ساقط کر کے صرف 'محی الدین احمد' استعمال کیا۔ اس کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ کُنیّت ابوالنصر اور ابوالکلام بھی والد ہی کی دی ہوئی تھی۔

۷ ۔ ان کے حالات ان کے نام کے خط کے حواشی میں دیکھے جائیں ۔

۸ ۔ مولانا آزاد کی یہ تصنیف، اگر چھپی تھی تو اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ۔

۹ ۔ یہ خط اسی طرح نامکمل حالت میں مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے کاغذات میں دستیاب ہوا اور خدا بخش لائبریری کے جرنل (۴۷) میں چھپا، جہاں سے ہم نے نقل کیا ہے ۔ چونکہ رنجور کے نام کے خطوط ۱۹۰۲ء اور اس کے قریب کے زمانے کے ہیں ۔ اس لیے گمانِ غالب ہے کہ یہ خط بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ہوگا ۔

حکیم محمد علی

۱۔ حکیم محمد علی :۔

شاہ آباد (ضلع ہردوئی ۔ یو پی) میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد علی خان تھا محمد علی طبابت پیشہ تھے ۔ اور اسی مناسبت سے مدتوں صدر مقام ضلع ہردوئی کی میونسپل کمیٹی میں طبیب کے عہدے پر فائز رہے ۔ یہاں سے فارغ ہوئے، تو حکومت نے آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا ۔

یہ وہ زمانہ ہے جب شرر کا طوطی بولتا تھا۔ ان کے ماہنامے "دلگداز" کی جو ۱۸۸۷ء میں جاری ہوا، شہرت اپنے شباب پر تھی اور شرر کے ناول مسلسل اس میں شائع ہو رہے تھے ۔ محمد علی آدمی تھے پڑھے لکھے، اور تصنیف و تالیف کے شائق، انھوں نے 'دلگداز' کے تتبع میں جنوری ۱۸۹۰ء میں اپنا ماہنامہ "مرقع عالم" جاری کیا، اور شرر کے ناولوں کے رنگ میں ناول لکھے اور انھیں بالاقساط اپنے پرچے میں شائع کرنے لگے ۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے کتابخانے میں "مرقع عالم" کے پہلے دو سال (۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۱ء) کا مکمل فائل محفوظ ہے ۔

عبرت، نیل کا سانپ، جعفر و عباسہ، خضر خان دیول دلوی، اور رام پیاری ان کے تاریخی ناول ہیں، اختر حسینہ، گورا، اور حسن و سرور، کا موضوع معاشرتی ہے ۔ انھوں نے شرر کی تقلید کی ۔ لیکن ایک ترتیب واقعات کے علاوہ کہ اس میں انھیں ضرور کامیابی حاصل ہوئی، وہ اور کسی پہلو سے بھی شرر کے مقابلے میں نہیں رکھے جا سکتے ۔ ان کے علاوہ ان کی ایک کتاب 'مسیحائے عالم'

طب کے موضوع پر ہے۔ انھوں نے ابوالولید محمد بن شحنہ کی عربی تاریخ روضۃ المناظر کا 'المظاہر' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ شائع کیا تھا۔

بعض اصحاب نے انھیں شاعر خیال کیا ہے اور طبیب ان کا تخلص قرار دیا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ نہ وہ شاعر تھے، نہ طبیب ان کا تخلص تھا، نہ کبھی انھوں نے طبیب کا لفظ بطورِ تخلص استعمال کیا۔ یہ غلط فہمی غالباً "مرقعِ عالم" کے سرورق کی عبارت سے پیدا ہوئی۔

مرقع عالم
جس کو
خادم الاطبا محمد علی طبیب میونسپلٹی صدر ہردوئی
مہتمم مرقع عالم نے
قومی پریس، لکھنؤ میں چھپوا کر ہردوئی سے شائع کیا

ان حضرات نے لفظِ طبیب کو اُن کے نام محمد علی سے وابستہ کر دیا۔ حالانکہ اس کی نسبت میونسپل کمیٹی، ضلع کے صدر مقام ہردوئی سے ہے یعنی وہ ہردوئی میونسپلٹی میں طبیب کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۱۸ء میں فوت ہوئے۔ جامع مسجد، ہردوئی کے قریب سپردِ خاک ہوئے تھے۔ اب قبر کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

(مکاتیبِ ابوالکلام آزاد (ابوسلمان شاہجہانپوری): ۳۷۰۔ ۳۷۱،

حکیم محمد علی طبیب (عبدالحی)

۲۔ پیڈ (Paid) وہ خط جس کا محصول ادا شدہ ہو۔

۳۔ (Punctuality) پابندیِ اوقات کسی کام کا ٹھیک یا مقررہ وقت پر کرنا۔

۴۔ یہ خط 'مرقعِ عالم' کی اشاعت مئی ۱۹۰۲ء سے لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پرچہ دیر سے چھپا ہوگا، ورنہ اس میں ۱۱ جون کا لکھا ہوا خط کیونکر شامل ہو سکتا تھا۔

محمد یوسف جعفری رنجور

۱۔ محمد یوسف جعفری رنجور:

ان کے والد مولانا یحییٰ علی (ف ۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۸ء) مشہور مقدمۂ وہابیان صادق پور (بہار) میں ماخوذ ہو کر مستوجب سزا ٹھہرے تھے۔ انھیں اوّلاً پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ لیکن بعد کو اسے حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ کالے پانی یعنی جزیرۂ انڈمان جنوری ۱۸۶۶ء میں پہنچے اور دو سال بعد وہیں ۲۰ جنوری ۱۸۶۸ء کو بعارضۂ بخار و درد و ورم کبتین چودہ دن بیمار رہ کر واصلِ حق ہوئے۔

مولانا محمد یوسف جعفری ۲۶ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ (۱۵ مئی ۱۸۶۳ء) کو پیدا ہوئے۔ والد کی جبری غیر حاضری میں ان کی تعلیم و تربیت سرا سر اپنے چھوٹے خالو شمس العلماء مولوی محمد حسن کی نگرانی میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بچ کے انتظام میں پوری کی۔ اس کے بعد پہلے پٹنہ کالج میں اور بعد کو علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد ملازمت کا زمانہ آیا تو سب سے پہلے محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں عربی کے مدرس اوّل مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی پٹنہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت کا کام بھی ان کے سپرد رہا۔ یہاں چھ سات برس کام کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں بورڈ آف ایگزامینرس، کلکتہ میں چیف مولوی کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جب اس عہدے سے سبکدوش ہوئے، تو حکومت نے دوہرے خطاب شمس العلما اور خان بہادر سے ان کی زندگی بھر کی خدمات کا اعتراف کیا۔

اردو اور فارسی نظم و نثر دونوں سے یکساں شغف تھا۔ رنجور تخلص کرتے

تھے۔ انگریزی بھی خوب جانتے تھے، بلکہ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے استاد بھی تھے۔ انھوں نے طلبہ کے لیے متعدد نصابی کتب مرتب کی تھیں جو زیادہ تر ولایت سے نو آمدہ انگریزوں کے کام کی تھیں۔ بہت دن ہوئے میں نے ان کی مرتبہ و مطبوعہ کتابیں (کلامِ اردو، اور نظمِ اردو منتخب) پیرس (فرانس) کے ایک کتاب خانے میں دیکھی تھیں۔

دیوان شائع نہیں ہوا بلکہ آخری ایام میں شعر گوئی سے اس حد تک بیزار ہو گئے تھے کہ ضخیم دیوان نذرِ آتش کر دیا جن بیاضوں میں رباعیات اور قطعاتِ تاریخ تھے وہ محفوظ رہ گئیں اور اب قلمی حالت میں ان کے ورثا کے پاس کراچی میں موجود ہیں۔

ان کی شادی عظیم النسا بنتِ حکیم ظہور الحسن سے ہوئی، جن کے بطن سے سات اولادیں — تین بیٹے (شرف الدین، محمد بن یامین، محمد حسان) اور چار بیٹیاں (نجم النسا، زاہدہ، حسنیٰ، بتول) ہوئیں۔ سب سے بڑا لڑکا شرف الدین ۱۴ برس کی عمر میں خدا کو پیارا ہو گیا۔ منجھلے بیٹے محمد بن یامین نے بھی عینِ عالمِ شباب میں وفات پائی۔ ان دنوں رنجور کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا اور کالا موتیا بڑھ رہا تھا، جس سے بینائی بہت کم ہو گئی تھی۔ اس حالت میں دن رات کی گریہ وزاری سے جو تھوڑی بہت روشنی رہ گئی تھی، وہ بھی زائل ہو گئی اور اب وہ آنکھوں سے بالکل معذور ہو گئے۔ اسی حالت میں ۷ جون ۱۹۲۳ء کو راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

(تذکرۂ صادقہ: ۶۱-۷۵؛ ۸۷ - ۸۸؛ خدا بخش لائبریری جرنل ۴۷: ۳ - ۱۹ (مقدمہ)؛ کشکول (قلمی): ۵۲

رنجور کے نام کے یہ خطوط خوش قسمتی سے ان کے خاندان میں محفوظ رہ گئے۔

ان کے نواسے پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی نے انھیں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے جرنل (نمبر ۴) میں شائع کروا دیا۔ ہم نے وہیں سے لیے ہیں۔

۲۔ مولوی احمد حسن فتحپوری احسن الاخبار (ہفتہ وار) کے شریک مالک اور ایڈیٹر تھے۔ بقول مولانا آزاد "عربی کے پورے مولوی' اور انگریزی، انٹرنس تک پڑھے ہوئے تھے، اور بہت روشن خیال تھے" ان سے رنجور کی وساطت سے ملاقات ہوئی اور پھر تعلقات بہت دوستانہ ہو گئے۔ ان کی وفات پر مولانا آزاد نے لسان الصدق میں ایک مضمون بھی لکھا تھا (آزاد کی کہانی : ۲۷۶ ، ۲۷۷؛ لسان الصدق :)

۳۔ Asiatic Society سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی مراد ہے

۴۔ غالباً مولانا عبدالرحیم مصنف تذکرۂ صادقہ مراد ہیں۔ ان کے مفصل حالات تذکرۂ مذکور میں دیکھے جا سکتے ہیں (ص ۱۳۰ - ۱۵۸) ان کی حقیقی ہمشیر فاطمہ، رنجور کی والدہ تھیں، گویا یہ رنجور کے ماموں تھے۔

۵۔ ہفتہ وار 'احسن الاخبار' کا ذکر اوپر ہو چکا ہے (حاشیہ ۲)۔ اس کے تبادلے میں عرب ممالک اور دوسری جگہوں سے بہت سے اخبار آتے تھے۔ ممکن ہے اخبار کے دفتر میں ان اخبارات کے لیے الگ کمرہ مختص کر دیا گیا ہو۔ رنجور اور مولانا آزاد اور ان کے احباب ان اخبارات کے مطالعے کے لیے احسن الاخبار کے دفتر جاتے تھے۔ انھوں نے اسی دار المطالعہ کا نام "دارالاخبار" رکھا تھا۔ (آزاد کی کہانی : ۲۷۷)

۶۔ یہ نامکمل تحریر بھی رنجور صاحب کے کاغذات میں دستیاب ہوئی ہے۔ بظاہر یہ خود نوشت سوانح حیات کسی شخص کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں۔ شبہہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ بھی رنجور کے نام کا خط ہے، حال آں کہ دونوں کے اتنے

قریب کے تعلقات ہونے کے بعد، سمجھ میں نہیں آتا کہ رنجور کو ان کے حالات معلوم کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی ؛ یوں بھی دونوں کلکتہ کے رہنے والے تھے ۔ ناممکن ہے کہ رنجور، مولانا کے والد یا خود ان سے اچھی طرح سے واقف نہ ہوں ۔

اس موضوع پر میرا تفصیل سے لکھنے کا ارادہ ہے ۔ لیکن بعض مجبوریوں کے باعث میں معذور ہوں، اسے فی الحال ملتوی رکھتا ہوں ۔

۷ ۔ آبرو تخلص تھا ، مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی بہن ۔ ان کا نام محمودہ بیگم حنیفہ تھا اور وہ مولانا سے چار برس بڑی تھیں ۔ ان کی شادی کلکتہ کے ایک صاحب مولوی احمد ابراہیم سے ہوئی ، جو وہاں لینڈ ریکارڈز کے محکمہ میں معقول اسامی پر متعین تھے ۔ ان کے انتقال کے بعد نکاحِ ثانی بھوپال کے واحد علی خاں صاحب سے ہوا ، جن سے ایک بیٹا واحد علی خان پیدا ہوا ۔ نواب بیگم بھوپال نے آبرو بیگم کو پرنسس آف ویلز لیڈیز کلب ، بھوپال کا سکتر مقرر کر دیا تھا ۔ آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء میں بھوپال ہی میں انتقال ہوا ۔

۸ ۔ "تذکرۂ صادق پور" کا پورا نام "الدر المنثور فی تراجم اہلِ صادق پور معروف بتذکرۂ صادقہ" ہے ۔ اس کے مصنف (جیسا کہ اوپر حاشیہ (۴) میں لکھا جا چکا ہے) رنجور کے چھوٹے ماموں مولوی عبدالرحیم تھے یہ تذکرہ ۱۹۰۱ء / ۱۳۱۹ھ میں شائع ہوا ۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں مولانا آزاد کی نثری تقریظ ہے ، جو ان کی قدیم ترین اردو نثر ہے ۔ اس تقریظ پر جو سب سے اول دی گئی ہے ، مصنف نے عنوان میں لکھا ہے :

ریویو بر کتاب مستطاب تذکرۂ صادقہ از
مجمع الفضائل و محاسن شاعرِ باکمال سخنورِ بےمثال مولوی ابوالکلام

محی الدین آزاد دہلوی مقیم کلکتہ صان الدین شرور الحساد حمد المن جعل کلامہ تذکرہ لاولی ابصار۔ وادرع البواطن القدسیہ خزائن الاسرار۔

اس عمر میں ان کا ذکر ان الفاظ میں حیرتناک اور ان کے معاصرین کی نظر میں ان کے علم کا اعتراف بمثال ہے۔

۹۔ گورا، رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک ناول ہے، لیکن امید کم ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں اس کا اردو میں ترجمہ ہوا ہو میرے خیال میں یہ عین ممکن ہے کہ یہاں حکیم محمد علی (ایڈیٹر مرقع عالم) ہردوئی کے ناول "گورا" کا ذکر ہو

۱۔ خواجہ غلام الثقلین :

ان کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاری تک پہنچتا ہے۔ یہ اور خواجہ الطاف حسین حالی یکجدی تھے۔ ان کے والد خواجہ غلام عباس کی شادی حالی کی حقیقی بھانجی سے ہوئی تھی۔ خواجہ غلام الثقلین ان کے منجھلے بیٹے تھے۔ ان سے بڑے غلام الحسنین تھے، اور چھوٹے غلام السبطین۔

غلام الثقلین ۲۷۸اء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں گورنمنٹ اسکول، دلی سے دسویں کی سند پائی۔ ماحول کا تقاضا تھا، شروع سے لکھنے پڑھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ ابھی اسکول میں تھے کہ انھوں نے "انتظر نتائج" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جو مشہور رسالے حسن، حیدرآباد کی نظر میں قابل انتخاب ٹھہرا اور غلام الثقلین کو اس پر ایک اشرفی انعام ملا۔ ۱۸۹۳ء میں علی گڑھ سے بی اے کی اور دو سال بعد ۱۸۹۵ء میں وکالت کی سند حاصل کی۔ اگلے برس حیدرآباد ریاست میں ملازم ہو گئے۔ پانچ برس وہاں رہنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں واپس آکر میرٹھ میں وکالت شروع کی۔ آل انڈیا

مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے اپنے ۱۹۰۲ء کے اجلاسِ دہلی میں سوشل ریفارم کا شعبہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور خواجہ غلام الثقلین کو اس کا سکریٹری مقرر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ خواجہ صاحب نے اس منصوبے کی اشاعت کے لیے اپنا مشہور رسالہ 'عصرِ جدید' جاری کیا۔ یہ رسالہ پہلے ماہانہ تھا، بعد کو اسے ہفتہ وار کر دیا گیا۔ اس سے کانفرنس کا پیغام دور دور تک پہنچا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک کتاب "مضامین اصلاح و ترقی" بھی شائع کی تھی۔

۱۹۰۹ء میں وہ صوبائی اسمبلی کی رکنیت کے لیے امیدوار کھڑے ہوئے، لیکن اپنے حریف صاحبزادہ آفتاب احمد خان کے مقابلے میں ہار گئے۔ ۱۹۱۲ء میں دوبارہ قسمت آزمائی کی اور اب کے کامیاب ہو گئے۔ اسی کے بعد ان کے نام کے ساتھ "آنریبل" کا سابقہ لکھا جاتے لگا۔

افسوس کہ روشنیِ طبع ان کے لیے بلا ثابت ہوئی۔ متواتر جسمانی اور ذہنی تشویش نے ان کی تندرستی پر بہت برا اثر کیا۔ اسی میں جمعہ ۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو بعارضۂ قلب پانی پت میں انتقال ہوا۔ اگلے دن وہیں عیدگاہ کے متصل درگاہ میر جی میں دفن ہوئے۔

ہمارے مشہور ماہرِ تعلیم خواجہ غلام السیدین انھیں کے بڑے بیٹے تھے۔ اردو کی معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین (بیگم ڈاکٹر سید عابد حسین) بھی انھیں کی بیٹی تھیں؛ (اصلی نام مصداق فاطمہ تھا)

(تذکرۂ معاصرین، ۴ : ۴۰۷ - ۴۱۰)

۱۱۔ "بھائی صاحب" سے مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین مراد ہیں۔

۱۲۔ شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی۔ وہ ملکۂ وکٹوریہ کی وفات ۲۲ جون ۱۹۰۲ء) کے بعد انگلستان

کے تخت پر بیٹھے۔ ہندستان میں اس موقع پر بڑی شان و شوکت سے جشنِ تاجپوشی منعقد کیے گئے۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن وائسرائے تھے۔ انھوں نے برطانیہ اور قیصرِ ہند کی عظمت و سطوت کا سکہ جمانے کی خاطر یہ جشن بڑی دھوم دھام سے منایا تھا۔ کلکتہ اور دلّی، دونوں جگہ ہفتوں ہر روز، روزِ عید اور ہر شب شبِ برات کا سماں رہا۔ مولانا آزاد اور ان کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ نے اس موقع پر منظوم خراجِ عقیدت پیش کیے تھے۔ (نوادرِ ابوالکلام: ۲۱-۲۵)

۱۳۔ یہ غالبؔ کے سفرِ کلکتہ کے دوران میں ان کے شعرائے کلکتہ کے ساتھ مناقشے کا ذکر ہے۔ وہاں مشاعرے میں بعض اصحاب نے ان کی فارسی غزل پر کچھ اعتراض کیے تھے۔ اگرچہ غالب کی طرف سے جواب دیا گیا، لیکن ہنگامہ فرو نہ ہوا اور بعد کو انھیں معذرت میں مثنوی "بادِ مخالف" لکھنا پڑی (تفصیل کے لیے دیکھیے "ذکرِ غالب": ۴۲ - ۴۷)

۱۴۔ داغ کا سفرِ کلکتہ (جون ۱۸۸۳ء میں) مُنّی بائی حجاب سے ملاقات کے لیے تھا۔ اس کا مفصّل ذکر انھوں نے اپنی مثنوی "فریادِ داغ" میں کیا ہے۔ لیکن ان کے کسی سوانح نگار نے کلکتے میں ان کے وہاں کے شعرا سے معمولی شاعرانہ سخن گسترانہ باتوں کے سوا کسی سنجیدہ مناقشے یا مجادلے کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے متعلق پہلی مرتبہ مولانا آزاد کے اس خط سے معلوم ہوا۔

۱۵۔ مولانا آزاد کا اپنا شعر ہے (خدا بخش لائبریری جرنل (۴۷) : ۲)

۱۶۔ یہ مصرع حسابی نطنزی کا ہے۔ پورا شعر ہے:

درمحفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

(سفینۂ خوشگو)

۱۷۔ ان خطوط کے مرتب نے لکھا ہے کہ اس سے مولانا ابراہیم آروی کے انتقال کی طرف اشارہ ہے۔ مرحوم مکتوب الیہ دنجور کے رشتے میں سسر ہوتے تھے۔ ان کا انتقال پٹنہ میں ہوا۔ مولانا آزاد تعزیت کے لیے پٹنہ گئے تھے، جیسا کہ اگلے خط (نمبر ۳۸) سے ظاہر ہوتا ہے۔

۱۸۔ غالب کا شعر ہے (دیوان: ۹۴)؛ فرق صرف یہ ہے کہ مطبوعہ مصرع ثانی میں 'دلائے' کی جگہ "ستائے" ہے۔

۱۹۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس زمانے میں ایک مضمون لکھا تھا: "اسلام اور محرم" یہ مضمون احسن الاخبار میں (جس کا اوپر ذکر آچکا ہے) شائع ہوا۔ مضمون میں محرم کے دنوں میں علم وغیرہ کے جلوس پر کسی قدر سخت لفظوں میں تنقید کی گئی تھی، اور ان تمام رسوم کو خلافِ اسلام اور "رومن کیتھولک عیسائیوں اور بت پرست قوموں" کی تقلید کہا گیا تھا۔ اس پر شیعی حضرات میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور بڑی مشکل سے یہ ہنگامہ فرو ہوا۔
یہاں (اور اس سے آگے کے دو تین خطوں میں بھی) اسی مضمون کا ذکر ہے۔ اس پورے واقعے کی تفصیل کے لیے دیکھیے، عبدالرزاق ملیح آبادی کی مرتبہ کتاب "آزاد کی کہانی، خود آزاد کی زبانی" (ص ص ۳۸۲۔ ۳۹۹) طبع اول، دلی اپریل ۱۹۵۸ء)

۲۰۔ یہ عبدالرحیم خانخاناں کا شعر ہے۔ (خریطۂ جواہر، ۱۸۴)

۲۱۔ احسن الاخبار مراد ہے۔ جس میں مضمون شائع ہوا تھا۔

۲۲۔ یہ شعر رضا علی وحشت کلکتوی کا ہے (نوادرِ ابوالکلام: ۴۱)

۲۳۔ مولانا آزاد کی تصنیف "حیاتِ خاقانی شروانی" کی یہ تاریخ بھی مولوی محمد یوسف جعفری رنجور کے کاغذات میں دستیاب ہوئی ہے اور مولانا آزاد

کے خطوط کے ساتھ خدا بخش لائبریری جرنل (۴۷) میں شائع ہوئی ہے، جہاں سے اسے نقل کیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۳ء) میں یہ تصنیف مکمل ہو چکی تھی۔ مولانا آزاد نے خود کہا ہے کہ ایک زمانے میں اُن کا ارادہ "شعراے ایران کے حالات میں آبِ حیات کی طرح ایک تذکرہ لکھنے کا ہوا تھا"۔ اسی سلسلے میں انھوں نے خاقانی شروانی کے حالات پر ایک مضمون لکھا، جو ماہنامہ مخزن، لاہور میں شائع ہوا تھا (آزاد کی کہانی : ۲۷۶؛ نوادرِ ابوالکلام : ۴۷)

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بعد کو خاقانی کے مفصّل حالات کتاب کی شکل میں مرتّب کر لیے تھے۔ اور یہ مکمل تحریر ۱۹۰۳ء میں راقم نے دیکھی اور انھیں اس کی یہ تاریخ قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یہ کتاب شائع نہیں ہوئی۔ اور نہ آج اس کا کوئی سراغ ملتا ہے۔

محمد بن یامین

۱۔ محمد بن یامین

یہ خط بھی رنجور کے کاغذات میں تھا ۔

بن یامین، جیسا کہ رنجور کے حالات میں لکھا جا چکا ہے ان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کا ذکر رنجور کے نام لکھے گئے اکثر خطوں میں آیا ہے ۔ ان کا عین عنفوانِ شباب میں انتقال ہو گیا (خدا بخش لائبریری جرنل (۴۷) جس کے غم میں انھوں نے رو رو کر اپنی بینائی ضائع کر لی تھی ۔

اس مجموعے میں رنجور کے نام کا سب سے پہلا خط غالباً ۲۸ مئی ۱۹۰۲ء کا ہے ۔ کہ بن یامین کے نام کا یہ خط انھیں دو تاریخوں کے درمیان کسی وقت لکھا گیا ہوگا ۔

(نوٹ: یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بن یامین نام، اگرچہ مسلمانوں میں دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا، لیکن یہودیوں میں عام ہے ۔ وہ در اصل حضرت یوسف علیہ السلام کے اعیانی چھوٹے بھائی تھے)۔

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی

۱۔ بستی حضرت نظام الدین اولیا (نئی دہلی) میں جمعرات ۲ محرّم ۱۲۹۶ھ (۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء) پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سیّد بدرالدّین اسحاق سے ملتا ہے، جو حضرت علیؓ سے انیسویں پشت میں اور حضرت بابا فرید گنج شکر کے داماد تھے۔ سیّد بدرالدّین اسحاق کے دو بیٹے ہوئے: سیّد محمد اور سیّد موسیٰ۔ والد کی وفات کے بعد یہ دونوں حضرت محبوب الٰہی نظام الدّین اولیا کی کفالت میں آ گئے۔ بعد کو سیّد محمد ان کے امام الصّلوٰۃ مقرّر ہوئے، جس سے لفظ "امام" ان کے نام کا جزو قرار پایا اور وہ خواجہ محمد امام کہلانے لگے۔ یہی خواجہ محمد امام خواجہ حسن نظامی کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔

اس کے بعد خواجہ محمد امام کے خاندان کے رشتے حضرت محبوب الٰہیؒ کی ہمشیر کے خاندان میں ہونے لگے (حضرت محبوب الٰہیؒ خود ساری عمر مجرّد رہے)۔ اسی لیے خواجہ حسن نظامی اپنے آپ کو ہمیشہ "خواہر زادہ سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی" لکھتے رہے۔

خواجہ حسن نظامی کے والد کا نام سیّد عاشق علی تھا۔ ان کی تعلیم برائے نام بھی نہیں تھی۔ غالباً صرف حافظِ قرآن تھے اور یہی ذریعۂ معاش تھا۔ پیدائش پر خواجہ صاحب کا نام قاسم علی رکھا گیا تھا، لیکن ان کے ماموں سیّد عابد علی شاہ انھیں علی حسن کہہ کر پکارتے تھے۔ جب انھوں نے لکھنا شروع کیا، تو قلمی نام حسن نظامی اختیار کر لیا۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ یہ ایسا مشہور ہوا کہ آج اُن کا اصلی نام کسی کو معلوم بھی نہیں ہے۔

گھر کی مالی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ یہ گیارہ بارہ برس کے تھے، جب سال بھر کے اندر والدین کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ اور یہ بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے۔ بارے، بڑے بھائی نے دستگیری کی۔ شکر ہے کہ خود انھوں نے تعلیم کی طرف سے

غفلت نہیں برتی۔ مکتب کے بعد دلی اور گنگوہ (مدرسۂ رشیدیہ) کے مختلف اساتذہ سے فارسی اور عربی اور دینیات کی تعلیم حاصل کی اور ان میں فی الواقع معقول استعداد بہم پہنچائی۔ ان میں شروع سے لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ وہ چھوٹے موٹے مضمون لکھتے، اور یہ کبھی کبھار کسی پرچے میں چھپ جاتے۔ ظاہر ہے، اس سے ان کا حوصلہ بڑھا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۹۰۵ء میں امرتسر اور پنجاب کا سفر کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب اخبار وکیل (امرتسر) میں مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ یہیں پہلی مرتبہ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ یہ تعلق اور دوستی عمر بھر قائم رہی۔

۱۹۰۸ء میں بعض بےتکلف دوستوں کے تعاون سے انھوں نے حلقۂ نظام المشائخ کی بنا ڈالی۔ اس کا مقصد اولیاء اللہ کی درگاہوں اور خانقاہوں کی اصلاح اور ان مقامات پر ہونے والی بدعنوانیوں کا سدِّ باب کرنا تھا۔ اس کام میں مُلّا واحدی (جو ان کے مرید بھی تھے) خاص طور پر ان کے معاون، بلکہ دستِ راست ثابت ہوئے۔ بعد کو خواجہ صاحب نے ان کی شراکت میں ماہانہ "نظام المشائخ" جاری کیا۔ وہ اس میں مسلسل مذہبی اور اصلاحی مضامین لکھتے رہے۔ ان کا روزنامچہ بھی اسی پرچے میں چھپنا شروع ہوا۔ یہ رسالہ بہت کامیاب رہا، اور لوگوں میں ان کی اور ان کے خیالات کی اشاعت کا اچھا وسیلہ ثابت ہوا۔

۱۹۱۱ء میں وہ ممالکِ اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے لیے نکلے۔ اس میں وہ چند ماہ دلی اور ہندوستان سے غائب رہے۔ اس سفر کی رُوداد "سفرنامۂ حجاز و مصر و شام" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔

اب ان کی شہرت بطور ادیب و انشا پرداز مسلّم ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ان کے ایک دوست احسان الحق صاحب نے میرٹھ سے ہفتہ وار "توحید" جاری کیا۔ تو ادارت کی ذمّہ داری خواجہ صاحب کے سپرد کر دی۔ چنانچہ یہ میرٹھ منتقل ہو گئے۔ اس تجربے نے ان کے سیاسی خیالات میں پختگی پیدا کر دی۔ افسوس کہ یہ پرچہ جلد ہی ایک مضمون شائع کرنے کی پاداش

یں حکومتِ وقت کے عتاب کا شکار ہو کر بند ہوگیا۔ اور خواجہ صاحب واپس دلّی چلے آئے۔

لیکن اب وہ بیکار نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ان کے منھ کو خون لگ چکا تھا۔ وہ صحافت کی طاقت جان گئے تھے۔ اور ان میں اپنے قلم پر بھی اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے متعدّد پرچے اور اخبار نکالے، لیکن وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد دم توڑ گئے۔ ان میں سے "منادی" زیادہ سخت جان ثابت ہوا، اور یہ ان کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی نظامی کی ادارت میں آج تک جاری ہے۔

یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اردو انشا پردازی میں خواجہ حسن نظامی کا کوئی حریف نہیں۔ وہ صاحبِ طرز ادیب ہیں۔ ان کی سی ٹھیٹ اور سلیس اردو کم کسی کو لکھنا نصیب ہوئی۔ انھوں نے کم و بیش، بڑی اور چھوٹی، پانسو کتابیں شائع کیں اور متعدّد چھپنے سے رہ بھی گئیں۔

ان علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت کی طرف سے انھیں ۲ جنوری ۱۹۴۶ء کو خطاب شمس العلماء دیا گیا۔

انھوں نے بڑی مصروف اور کامیاب زندگی بسر کی۔ وہ سراسر خود ساختہ شخص تھے۔ ان کی ابتدا جن حالات میں ہوئی، اس کے مقابلے میں انتہا قابلِ رشک ــــ کہی جا سکتی ہے۔

آخری چند سال مختلف امراض کا شکار رہے، خاص طور پر بواسیر کی شکایت سے بہت عاجز تھے۔ دل کا عارضہ بھی لاحق ہوگیا تھا۔ اسی میں عیدالاضحیٰ کے دن یکشنبہ ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو مغرب کے بعد اپنے خالقِ حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ قبر اپنے سکونتی مکان کے قریب ہی بستی نظام الدین میں اپنی زندگی میں کھدوالی تھی۔ اسی میں دفن ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہِ واِنّا اِلَیہ راجعونَ (آپ بیتی (حسن نظامی)؛ سوانحعمری خواجہ حسن نظامی (ملّا واحدی)؛ خواجہ حسن نظامی: حیات اور ادبی خدمات (ڈاکٹر امام مرتضٰی نقوی)

خواجہ حسن نظامی۔ حیات اور کارنامے (مرتبہ خواجہ حسن ثانی)
نوٹ: خواجہ حسن نظامی مرحوم کے نام کے تمام خطوط ان کی مرتبہ کتاب "اتالیق خطوط نویسی" (دہلی۔ نومبر ۱۹۲۹ء) کے ص ۴۹۔۵۵ سے لیے گئے ہیں۔

۲۔ امرتسر کے اخبار 'وکیل' کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور اور موقر جریدہ تھا۔ اس کے مالک شیخ غلام محمد سے مولانا آزاد کی ملاقات انجمن حمایت اسلام (لاہور) کے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کے موقع پر ہوئی تھی، جب مولانا آزاد تقریر کرنے کے لیے وہاں گئے تھے۔ جب مولانا آزاد کا الندوہ (لکھنؤ) سے تعلق منقطع ہوگیا، تو وہ شیخ غلام محمد کی دعوت پر امرتسر چلے گئے، اور وکیل کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے، جس کے سابقہ ایڈیٹر حامد علی صدیقی صاحب مستعفی ہوگئے تھے۔ خواجہ حسن نظامی سے ان کی پہلی ملاقات یہیں وکیل کے دفتر میں ہوئی تھی (تفصیل کے لیے دیکھیے، آزاد کی کہانی: ۳۱۵۔۳۲۴)

۳۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ اس سال اس کا سالانہ اجلاس ڈھاکا میں ہوا تھا۔

۴۔ یہ دراصل بہت پرانا اخبار تھا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتا ہوا یہ دارالسلطنت کہلایا۔ جس زمانے کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس وقت اس کی ملکیت کلکتہ کے ایک متمول تاجر چرم عبدالطیف صاحب کے پاس تھی۔ وہ اسے دوبارہ جاری کرنا چاہتے تھے۔ مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی وساطت سے انھوں نے مولانا آزاد کو اس کی ایڈیٹری پر آمادہ کر لیا۔ لیکن یہ انتظام بہت دن تک نہیں چلا اور جلد ہی مولانا آزاد اس سے الگ ہوگئے اور پھر یہ پرچہ بھی بند ہوگیا (تفصیل کے لیے دیکھیے آزاد کی کہانی: ۳۱۹۔۳۲۲)

۵۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مضمون میں خواجہ حسن نظامی مرحوم نے دُمدار ستارے کے آثارِ نحوست سے بچنے کے لیے کوئی وظیفہ لکھا تھا اور پانی دم کرکے اسے چھڑکنے کی ہدایت کی تھی۔ اصلی متن میں عدد (۹۳) چھپا ہے۔ بگمانِ غالب یہ سہو ہے، ٹھیک

(۹۲) ہوگا۔ جو حضرت رسول کریم صلعم کے نام محمدؐ کے حسابِ جمل سے عدد ہیں۔
لیکن پورا خط معمّا ہے اور جب تک متعلقہ مضمون سامنے نہ ہو، ان اشاروں کا سمجھنا اور ان کی کچھ وضاحت کرنا محال۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے صاحبزادے خواجہ حسن ثانی کا خیال ہے کہ اس خط میں مرموز زبان استعمال کی گئی ہے اور مقصود کوئی سیاسی پیغام پہنچانا تھا؛ زبان ایسی استعمال کی گئی کہ سنسر کرنے والا حکومت کا خفیہ پولیس کا عملہ اصلی مقصد نہ سمجھ سکے۔ (ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت (مرتبہ رشید الدین خان) : ۶۵۱) واللہ اعلم بالصواب۔

۶۔ قرآن کے آخری پارے کی پہلی سورت النبا کی آیت نمبر ا۔ اسی سے اس پارے کا نام "عمّ" ہوا۔

۷۔ اس سے سورۃ الکوثر (۱۰۸) مراد ہے اس کی آیتِ اول ہے: اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ

۸۔ یہ سورۃ الاخلاص (۱۱۲) کی پہلی آیت کا ٹکڑا ہے: قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ یہاں پوری سورت مراد ہے۔

۹۔ سرمد: ان کے مفصّل حالات دستیاب نہیں۔ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ دراصل آرمینیا کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ابتدا میں وہ یہودی تھے یا نصرانی۔ اور اسلام قبول کرنے کے بعد کیا سرمد ہی نام اختیار کیا تھا، یا یہ محض تخلّص تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی کی استعداد بھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی رباعیات کا مجموعہ متعدد بار چھپ چکا ہے؛ ان کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔
ذریعۂ معاش تجارت تھا۔ اسی سلسلے میں عہدِ شاہجہانی میں ہندستان آئے، اور سندھ کے شہر ٹھٹہ میں وارد ہوئے۔ یہاں ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہو گئے، اور اسی میں ہوش و حواس کھو بیٹھے اور مجنوں ہو گئے۔
رفتہ رفتہ دارالخلافہ شاہجہان آباد پہنچے۔ یہاں داراشکوہ سے ملاقات ہوئی اور وہ

ان کا بہت گرویدہ ہوگیا۔ اورنگ زیب تخت پر بیٹھا، تو ان کی برہنگی اور آزادہ روی قابلِ اعتراض ٹھہری۔ قاضی کے سامنے پیش ہوئے۔ سوال و جواب کے بعد فتویٰ کفر اور حکمِ قتل صادر ہوا۔ یہ واقعہ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۱ء کا کہا جاتا ہے۔

جامع مسجد دلّی کے مشرقی دروازے کے مقابل مزار ہے (قاموس المشاہیر، ۱: ۲۸۷۔ ۲۸۸)۔

۱۰۔ معلوم نہیں، یہ کون بزرگوار تھے۔ (کہنے کی بات یہ ہے کہ پنجابی، پنجابی کا معرّب ہے "پ" کا حرف عربی میں نہیں؛ اسے "ف" سے تبدیل کر دیتے ہیں۔)

۱۱۔ خدا معلوم، یہ کس اخبار کے جاری ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

۱۲۔ انھوں نے سرمد کے بارے میں یہ مضمون لکھا تھا۔ یہ 'نظام المشائخ' میں چھپا۔ اور پنڈی (منڈی؟) بہاءالدین (پنجاب) کے ماہنامہ 'صوفی' میں بھی۔ اس کے بعد یہ کتابچے کی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ چھپا۔

۱۳۔ بہ ظاہر حضرت معین الدین چشتیؒ کے سالانہ عُرس کی تقریبات میں شرکت کی طرف اشارہ ہے۔

۱۴۔ اس خط (نمبر ۹) میں بالترتیب جوابات ہیں، حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کے مندرجۂ ذیل خط کے سوالات کے۔

از میرٹھ، دفتر اخبار توحید

۱۶ مئی ۱۹۱۳ء

مولٰنا، السلام علیکم

(۱) آپ کراماتِ اولیاء اللہ کے قائل ہیں؟

(۲) کیا آپ نے کوئی کرامت حضرت خواجہ اجمیریؒ کی دیکھی ہے؟

(۳) کیا آپ اجمیری خواجہؒ صاحب کی درگاہ اور عُرس کو کسی حیثیت سے آج کل مفید سمجھتے ہیں؟

جواب دو سطری اور جلد ہونا چاہیے۔ حسن نظامی

انشاء اللہ خان

۱۔ انشاء اللہ خان

پنجاب کے مشہور صحافی ۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنا صحافتی سفر اخبار "وکیل" امرتسر کی ادارت سے ۱۸۹۸ء میں شروع کیا۔ یہ اپنے زمانے کا مشہور اور کامیاب اخبار تھا، جو ہفتے میں تین بار شائع ہوتا تھا۔ یہاں سے الگ ہونے کے بعد انھوں نے ۱۹۰۱ء میں اپنا ذاتی ہفتہ وار "وطن" لاہور سے جاری کیا۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ یہ اپنے زمانے کا بہت ہر دلعزیز پرچہ تھا اور اسے اپنے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں کا کامل تعاون حاصل تھا۔ ۱۹۰۷ء میں وہ اس کی جگہ روزانہ "وطن" شائع کرنے لگے۔ یہ بھی بہت کامیاب رہا۔ لیکن جب مولانا ظفر علی خان اپنے والد (سراج الدین احمد) کی وفات کے بعد ان کا جاری کردہ ہفتہ وار "زمیندار" لاہور لے آئے اور پھر ۱۹۱۲ء میں اسے روزانہ کر دیا تو اس کا "وطن" پر اثر پڑا۔ چنانچہ "وطن" پھر ہفتہ وار میں تبدیل ہو گیا۔ یہ پرچہ ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔

مولوی انشاء اللہ خان صحافی کے علاوہ مصنف بھی تھے۔ ان کی چند کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جو تقریباً سب کی سب ترکی اور عثمانی حکومت کے بارے میں ہیں۔ علامہ اقبال کا "وطن کی بہنوں" والا مشہور لطیفہ انھیں سے متعلق ہے۔ ان کا ۱۹۲۸ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ (خطوط اقبال: ۷۵ - ۷۶، تاریخ صحافت پاکستان و ہند:)

۲۔ وی، پی (Value Payable) جب کوئی پارسل یا چیز اس شرط پر بھیجی جائے کہ مکتوب الیہ اسے وصول کرنے سے پہلے اس کی قیمت ادا کریگا۔

۳۔ نوٹ :- تنقیدی شذرہ :

مولوی عبداللطیف

۱۔ مولوی عبداللطیف:

'دارالسلطنت'، کلکتہ کے پرانے اخباروں میں سے تھا۔ غدر (۱۸۵۷ء) سے پہلے اس کا نام "دوربین" تھا۔ یہ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اور اس کی زبان بھی فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ فارسی کا رواج کم ہوتا گیا، اور اردو نے اس کی جگہ لے لی۔ دوربین پریس مولوی کبیرالدین احمد نے خرید لیا اور اخبار بھی اردو میں شائع کرنے لگے۔ چندے بعد انھوں نے اس کا نام "اردو گائیڈ" کر دیا۔ یہ اخبار بہت مقبول ہوا اور سرکاری حلقوں میں بھی اس کا خاصا اثر و رسوخ تھا۔

مولوی کبیرالدین احمد کے انتقال کے بعد پریس اور اخبار کا انتظام مولوی عبدالباری کے ہاتھوں میں آیا۔ انھی کے زمانے میں اس کا نام دارالسلطنت ہوا۔ پروفیسر عبدالغفور شہباز (ف: نومبر ۱۹۰۸ء) بھی کسی زمانے میں اس کے ایڈیٹر رہے تھے۔ پھر پرچہ بند ہوگیا۔

مولوی عبدالباری کے صاحبزادے مولوی عبداللطیف تھے، جن کے نام یہ خط لکھا گیا ہے۔ وہ دراصل چمڑے کے تاجر تھے، اور کلکتہ میں ان کا وسیع کاروبار تھا۔ انھیں خیال ہوا کہ اپنے والد کی یادگار دارالسلطنت کو دوبارہ زندہ کریں۔ انھوں نے اس کا مولوی محمد یوسف جعفری رنجورؔ سے ذکر کیا۔ اور رنجور کے کہنے پر مولانا آزاد نے اس کی ایڈیٹری قبول کر لی۔

جیسا کہ خط سے ظاہر ہے، یہ اخبار کی اشاعت سے قبل مولوی عبداللطیف کو لکھا گیا تھا۔ اس سال (اواخر دسمبر ۱۹۰۶ء) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکا میں ہونے والا تھا اور مولانا آزاد اس میں شامل ہونا چاہتے تھے۔ اس اجلاس کی صدارت

کلکتہ ہائی کورٹ کے جج سید شرف الدین نے کی تھی۔

جیسا کہ مولانا آزاد نے خود کہا ہے ان کا یہ تعلق زیادہ دن نہ چل سکا۔ مولوی عبداللطیف دوسروں کے اغراض سے متاثر ہوئے اور اخبار کی پالیسی اور وقت کے مسائل میں غیر ضروری دخل دیتے تھے۔ اس پر مولانا آزاد نے علیحدگی اختیار کر لی (آزاد کی کہانی: ۳۱۹۔ ۳۲۲؛ خطبات عالیہ، ۱: ۲۷۸)

۲۔ یہ خط نقوش لاہور کے خطوط نمبر (۱) ص ۴۷۶۔ ۴۷۷ (اپریل / مئی ۱۹۶۸ء) سے ماخوذ ہے۔ چونکہ یہ ڈھاکہ کانفرنس سے معاً قبل لکھا گیا ہے۔ اس کا زمانہ دسمبر ۱۹۰۶ء ہوگا۔

مُلّا واحدی

۱۔ مُلّا واحدی

ان کا اصلی نام محمد ارتضیٰ تھا۔ ان کے ایک ہم جماعت ظہیر احمد تھے۔ انھوں نے اپنے چچا مشتاق احمد زاہدی (مدرس اینگلو عربک اسکول) کے نام کی مناسبت سے زاہدی کا لاحقہ اپنے نام کے ساتھ شامل کرنا شروع کیا اور ظہیر احمد زاہدی بن گئے۔ ایک دن محمد ارتضیٰ صاحب نے مذاق مذاق میں ان سے کہا: تم "زاہدی"، میں "واحدی"۔ یہ لفظ کس لمحے زبان سے نکلے تھے کہ یہ واقعی واحدی کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جب نظام المشائخ ماہنامہ نکلا اور یہ اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، تو لوگ انھیں مولانا واحدی، مولوی واحدی کہنے لگے۔ اس پر انھوں نے خیال کیا کہ میں اس بلند بانگ لقب کے لائق نہیں، اور مُلّا واحدی کہلانے کو ترجیح دی۔ پھر خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنی تحریروں میں اس نام کا اس کثرت سے استعمال کیا کہ آج بہت کم لوگ ہونگے، جو ان کا اصلی نام محمد ارتضیٰ جانتے ہیں، لیکن مُلّا واحدی کو سب جانتے ہیں۔

مُلّا واحدی جمعہ، ۶ رمضان ۱۳۰۵ھ (۱۷ مئی ۱۸۸۸ء) اپنے آبائی مکان کوچہ چیلان دلّی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سیّد محمد مصطفیٰ تھا۔ ددھیال کی طرف سے وہ شاہ عالم ثانی کے ہمعصر میر محمد اکبر عرف حکیم سیّد شاہ ارزانی کے اسلاف میں سے تھے، اور ننھیال کی طرف سے فوجدار خانی۔ ان کا بچپن والد کے ساتھ دلّی سے باہر مفصّلات میں گزرا، جہاں ان کے والد اپنی ملازمت

(اسسٹنٹ انجینیر محکمۂ نہر) کے دوران میں تعینات رہے۔ تعلیم کا زمانہ آیا، تو گنج کا انتظام کردیا گیا اور بالآخر دلّی آکر سان اسٹیفنس مشن ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ لے لیا لیکن جلد ہی یہاں سے نکل کر اینگلو عربک اسکول پہنچ گئے۔ لیکن رسمی تعلیم ان کے بس کی نہیں تھی۔ دسویں کے امتحان میں متواتر تین سال ناکام ہوتے رہے۔ آخر خواجہ حسن نظامی کے کہنے پر یہ خیال چھوڑ دیا۔ خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔ ملازمت کی احتیاج نہیں تھی۔ جتنا کچھ کر سکے تھے، بفضلہٖ اسی کے بل بوتے پر اپنی زندگی بہت کامیاب اور باوقار طریقے پر بسر کر لے گئے۔

۱۹۰۹ء میں خواجہ حسن نظامی نے حلقۂ نظام المشائخ کی بنیاد رکھی۔ پہلے جلسے میں جو داراشکوہ کی قبر پر مقبرۂ ہمایوں (دلّی) کے احاطے میں ہوا تھا، لے دے کے کل آٹھ آدمی تھے، لیکن خواجہ صاحب مرحوم کی انتظامی قابلیت کا کرشمہ تھا کہ تمام مسلمان اخباروں نے اس کا ذکر کیا اور اسے ضروری اقدام قرار دیا۔ چند ماہ بعد جولائی ۱۹۰۹ء خواجہ صاحب نے تجویز رکھی کہ حلقے کا اپنا اخبار ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۷۵ روپے خواجہ صاحب نے دیے اور ۷۵ روپے ملّا واحدی نے، اور ڈیڑھ سو روپے کے خطیر سرمایے سے ماہنامہ "نظام المشائخ" جاری ہوا۔ خوش قسمتی کہ پہلے پرچے ہی سے یہ خود کفیل ہو گیا۔ ایک شمارے سے دوسرے کی طباعت کا انتظام ہونے لگا۔

"نظام المشائخ" پر خواجہ صاحب کا نام ایڈیٹر کی اور ملا واحدی کا نام اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے چھپتا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب ممالکِ اسلامیہ مصر، شام اور حجاز کی سیاحت کے لیے گئے۔ وہ تین مہینے غیر حاضر رہے اور اس دوران میں ملّا واحدی نے تنِ تنہا پرچہ مرتب کر کے شائع کیا۔ خواجہ صاحب واپس آئے تو فرمایا کہ جس سلیقے اور اہتمام سے تم نے رسالے کو میری عدم موجودگی میں

چلایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اب تمھیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ آج سے میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ اب تم ہی اس کے ایڈیٹر، اور تم ہی اس کے مالک۔

یہ پرچہ تقریباً نصف صدی چلا، اور ۱۹۶۰ء میں بند ہوا۔ اپنے زمانے کے ممتاز ادیب اور شاعر نظام المشائخ میں اپنی نگارشات بھیجتے رہے۔ خواجہ حسن نظامی، شبلی نعمانی، راشد الخیری، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا ابو الکلام آزاد، نیاز فتحپوری، عارف ہسوی سب اس کے صفحات پر موجود ہیں۔

مُلّا واحدی، رسالے، اخبار نکالنے اور مرتّب کرنے کا سلیقہ جانتے تھے۔ انھوں نے اردو صحافت میں بیشمار تجربے کیے۔ یہ معمولی بات نہیں کہ ۱۹۱۹ء میں ان کے ہاں سے چار ماہنامے (نظام المشائخ، استانی، گلچیں، بیداری) ، چار ہفت روزہ (طبیب، خطیب، انقلاب، درویش) ؛ اور ایک روزنامہ (رعیّت) شائع ہوتے تھے۔

صحافت کے علاوہ مُلّا صاحب کا دوسرا کارنامہ دلّی میونسپل کمیٹی کی رکنیت ہے۔ وہ ۱۹۳۴ء سے تقسیم ملک (۱۹۴۶ء) تک کمیٹی کے رکن رہے۔ کبھی ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، انتخاب کے لیے کسی دوسرے سے ووٹ نہیں مانگا، کسی افسر کی آستان بوسی نہیں کی۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ ہمیشہ منتخب ہوئے۔ وہ ہندو مسلمان سب میں ہر دلعزیز رہے۔ یہ سب کچھ بے لوث خدمتِ خلق اور اصول پرستی کا نتیجہ تھا۔

تقسیم ملک (۱۹۴۷ء) کے موقع پر دلّی میں جو افسوسناک حالات ہوئے، ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ انھیں سے دل برداشتہ ہو کر وہ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں بس گئے۔ وہاں بھی تصنیف و تالیف کا شغلہ جاری رکھا۔ ان کی دس بارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے بیشتر دینیات، اخلاقیات، قرآن و حدیث کے موضوعات سے متعلق ہیں۔ اپنے زمانے کے اکابر کے حالات اور یادداشتیں بھی قلمبند کی تھیں۔

اپنی سوانحمری "میرا افسانہ" کے عنوان سے لکھی تھی۔ یہ الگ سے کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے رسالے "سہ ماہی تحریر" کی ایک اشاعت (نمبر ۴۔ جولائی/ستمبر ۱۹۷۸ء۔ جلد ۱۲: شمارہ ۳) اس کے لیے وقف کر دی تھی۔

ان کا اسلوب شگفتہ، سادہ و سلیس اور پُرخلوص ہے۔ زبان سے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے کہ دلّی کی صاف ستھری زبان ان کا طرّۂ امتیاز ہے۔

۲۱ فروری ۱۹۶۶ء کو اُن پر فالج کا حملہ ہوا۔ اس کے بعد معذور ہو گئے۔ اسی میں بدھ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

(میرا افسانہ مشمولہ سہ ماہی تحریر (نئی دلّی) ۱۲: ۳)

تذکرہ معاصرین، ۴: ۱۰۳-۱۱۲)

نوٹ: مُلّا واحدی کے نام کا یہ خط بھی "اتالیق خطوط نویسی" (دہلی۔ نومبر ۱۹۲۹ء) ص ۵۱-۵۲ سے ماخوذ ہے۔

سرمد والے مضمون کا ذکر خواجہ حسن نظامی کے خطوط میں آچکا ہے۔ یہ خط بھی اسی زمانے کا ہے۔

جن ایّام میں سرمد والا مضمون لکھا گیا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے، خواجہ صاحب کلکتہ میں مقیم تھے۔ مولانا آزاد نے مضمون کا پہلا حصّہ لکھ کر ان کے پاس انہیں بھیج دیا۔ پھر چند دن بعد اس کا دوسرا حصّہ لکھا اور وہ بھی بھیج دیا۔ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے پہلا حصّہ نظام المشائخ میں اشاعت کے لیے مُلّا واحدی کو بھیج دیا تھا۔ مُلّا واحدی نے بقیہ مضمون کے لیے مولانا آزاد کو لکھا۔ اس پر مولانا نے مُلّا واحدی کو جواباً یہ خط لکھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد مُلّا واحدی کو مضمون کی دوسری قسط بھی موصول ہو گئی ہو گی۔ یہ مضمون پہلی بار "نظام المشائخ" ہی میں شائع ہوا تھا۔ (جلد ۸ شمارہ ۵ محرم الحرام ۱۳۳۱ھ)

عبدالماجد دریا بادی

۱۔ عبدالماجد دریا بادی:

دریاباد (یو پی) کے خاندانِ مخدوم زادگان میں ۱۶ شعبان ۱۳۰۹ھ (۱۶ مارچ ۱۸۹۲ء) کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈپٹی عبدالقادر (ف ۱۲ نومبر ۱۹۱۲ء) کا حج کے دوران میں منیٰ میں انتقال ہوا۔ حسبِ رواج ان کی ابتدائی تعلیم نجی انتظام سے گھر پر ہوئی، اور اس دوران میں انھوں نے فارسی اور عربی میں معقول استعداد پیدا کرلی۔ اس کے بعد ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کے پانچویں درجے میں داخلہ لے لیا۔ درجہ بدرجہ سب امتحانوں میں کامیابی کے بعد ۱۹۱۱ء میں کیننگ کالج، لکھنؤ سے بی اے کی سند حاصل کی۔ ایم اے (فلسفہ) کے لیے سان سٹیفنس، کالج، دلّی میں داخلہ لیا تھا کہ انھیں ایّام میں والد کا انتقال ہوگیا اور مجبوراً انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔

اب روزگار کا مسئلہ درپیش تھا۔ پہلے انجمن ترقی اردو میں مولوی عبدالحق نے کچھ کام ان کے سپرد کیا۔ تاریخ اخلاق یورپ (ترجمہ لیکی)، فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ مولانا شبلی نے جب سیرۃ النّبی کی بِنا ڈالی، تو انھوں نے انگریزی ذخیرے سے التقاط و ترجمہ کا کام ان کے سپرد کردیا، اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرّر کردی۔ اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے اپنے ادبی معاون کے طور پر علی گڑھ بلا لیا۔ اب مشاہرہ بڑھ کر ۱۷۵ ہوگیا۔ لیکن یہاں کی فضا انھیں راس نہ آئی اور یہ مستعفی ہوگئے۔

یہی زمانہ ہے، جب عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ اس کے لیے

ضروری تھا کہ تعلیمی نصاب تیّار کیا جائے۔ چنانچہ دارالترجمہ کی بنیاد پڑی اور انگریزی اور دوسری زبانوں سے کتابیں ترجمہ ہونے لگیں۔ مولوی عبدالحق اس شعبے کے ناظم تھے۔ وہ انھیں جانتے تھے۔ انھوں نے تین سو روپیہ مشاہرہ پر انھیں مترجم فلسفہ مقرر کردیا اور یہ حیدرآباد چلے گئے۔

انھوں نے کالج کی طالب علمی کے زمانے میں فلسفہ، نفسیات، اور منطق کا بہت وسیع مطالعہ کیا تھا۔ اس مطالعے کے دوران میں، جولامحالہ بیشتر انگریزی کتابوں پر مشتمل تھا، رفتہ رفتہ وہ آزاد خیال اور مذہب سے دُور ہوتے گئے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ مذہب سے بالکل برگشتہ ہوکر لاادریت اور عقلیت پسندی پر فخر کرنے لگے۔ اب ان کی روزمرّہ کی گفتگو بھی بیباک بلکہ غیر محتاط ہو گئی۔ حیدرآباد میں "غیر ملکیوں" کے خلاف جذبہ موجود ہی تھا۔ اس پر ان کے خلافِ مذہب رویّے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ رہی سہی کسر ان کی کتاب 'فلسفۂ اجتماع' کے اقتباسات سے پوری ہو گئی۔ غرض مخالفوں نے باقاعدہ محاذ بنا لیا اور ان پر کفر کا فتویٰ صادر ہوگیا۔ جب حیدرآباد کا قیام محال ہوگیا، تو یہ چھٹی لے کر وطن آ گئے اور یہاں سے استعفیٰ بھیج دیا۔

لیکن پیٹ کے لیے روٹی اور تن کے لیے کپڑا درکار ہے۔ تا یکے حیدرآباد میں ان کے ایک مخلص دوست سر امین جنگ تھے۔ وہ حضرت نظام سابع دکن کے چیف سکتر تھے۔ آخر تنگ آکر مولانا عبدالماجد نے انھیں توجّہ دلائی کہ بیکاری میں آمدنی کے بغیر زندگی تو بسر نہیں ہوسکتی؛ کوئی سبیل نکالیے۔ سر امین جنگ نے سفارش کی اور نظام میر عثمان علی خان مرحوم نے انھیں حیدرآباد طلب کیا۔ یہ حاضر ہوئے، تو فرمان جاری ہوا کہ ۱۲۵ روپے ماہانہ کی حینِ حیات پنشن منظور کی جاتی ہے؛ حیدرآباد کے قیام کی شرط نہیں، جہاں چاہیں، رہیں۔ البتہ آیندہ اپنی تمام تصنیفات کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کریں۔ اس کے بعد ایک موقع پر یہ پنشن بڑھا کر دوسو ماہانہ کر دی گئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۸ء

میں ریاست کے انضمام کے بعد پھر ۱۲۵ ہو گئی۔ اور یہ انھیں اپنی وفات تک لکھنؤ سے ادا ہوتی رہی۔

۱۹۱۹ء میں ان کے خیالات میں انقلاب آیا، اور وہ پھر مذہب کی طرف لوٹ آئے۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کا ترجمہ اور تفسیر (اردو اور انگریزی) مکمل کی اور متعدد کتابیں اسلامی علوم سے متعلق شائع کیں۔

صحافت میں بھی ان کی خدمات بہت قابلِ قدر ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں ظفر الملک علوی کی معیت میں ہفتہ وار "سچ" جاری کیا۔ ۱۹۳۳ء میں یہ بند ہو گیا۔ دو سال بعد انھوں نے بلا شرکتِ غیرے "صدق" نکالا۔ چندے یہ ہفتے میں دو بار چھپتا رہا، لیکن بعد کو اسے ہفتہ وار کر دیا۔ یہ ۱۹۵۰ء تک نکلا، اور پھر بوجوہ اسے بھی بند کرنا پڑا۔ چند مہینوں کے وقفے کے بعد یہ "صدق جدید" کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ زیادہ سخت جان نکلا، اور باقاعدگی سے ان کی زندگی بھر شائع ہوتا رہا۔

وہ شاعر بھی تھے، ناظر تخلص تھا۔ چندے اکبر الٰہ آبادی سے کلام پر اصلاح لی۔ لیکن شاعری دراصل شباب کا جوش تھا۔ بعد کو اسے ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں ایک ڈرامہ بھی "زود پشیماں" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ نثر میں ہے۔ وہ صاحبِ طرز نثر نگار ہیں۔ ان کی سی شگفتہ، برجستہ اور ٹھیٹ نثر بہت کم کسی نے لکھی ہے۔ طنز اور پھبتی اس پر مستزاد۔ اس میدان میں کم ہی ان کے حریف ہیں۔ کم و بیش ۴۰ کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ حکومت نے ان کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۵ء میں حسنِ حیات عربی کا صدارتی انعام دیا۔ یو پی حکومت نے الگ یکمشت پانچ ہزار کا انعام دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی سند عطا کی۔ غرض ان کی علمی حیثیت سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں مسلّمہ تھی۔

ستقل قیام لکھنؤ میں رہتا تھا۔ جمعہ ۱۴ مارچ ۱۹۷۴ء کو جسم کے سیدھے حصّے پر فالج
ملہ ہوا۔ دو ڈھائی سال علاج معالجے میں گزرے۔ نقل و حرکت بہت کم ہو گئی تھی۔
ئی سے اکتوبر ۱۹۷۶ء میں پھسلے اور گر گئے، جس سے کولھے کی ہڈّی ٹوٹ گئی۔ اسی
ت میں وسط دسمبر ۱۹۷۶ء میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ اس کے بعد وہ بستر سے
ں اُٹھے، بیشتر وقت غشی طاری رہتی۔ اسی میں جمعہ ۷ جنوری ۱۹۷۷ء علی الصّبح
ریباً چار بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ
۔ قرآن سے وفات کی ہجری تاریخ نکلی تھی وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ

(۱۳۹۷ھ)

اسی دن ان کے وطن دریاباد گئی اور وہاں اپنے جدّاعلیٰ حضرت مخدوم
ابکش کے پہلو میں سپردِ خاک ہوئے۔

۔ بیتی (عبدالماجد دریابادی)؛ تذکرۂ معاصرین، ۴: ۱۸۱ ـــ ۱۹۴)

۔: مولانا آزاد کے یہ خطوط انھوں نے خود مولانا کی وفات کے بعد پہلے ماہنامہ
ر، لکھنؤ اگست ۱۹۵۹ء میں شائع کیے تھے۔ پھر وہاں سے نقل ہو کر یہ کئی جگہ شائع
ئے۔

ولانا شبلی:

دت: بندول (ضلع اعظم گڑھ)، ۱۸۵۷ء۔ وفات: اعظم گڑھ، ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء۔
ن احاطۂ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ (تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے، حواشی خطوط
کلام آزاد (حصّہ دوم)

ل کا پہلا شمارہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا تھا۔

صائر"، کبھی شائع نہیں ہوا۔ خدا معلوم، اسے کیسے شائع کرنے کا ارادہ تھا:

ہفتہ وار یا ماہانہ۔

۵۔ ظفر حسن خاں صاحب سے متعلق تفصیلات مولانا دریابادی نے اپنے حاشیے میں دے دی ہیں۔

انھیں ۱۹۵۵ء میں کتاب "مآل ومتیذئرت" پر ساہتیہ اکادمی کا سالانہ پانچ ہزار روپے کا انعام بھی ملا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔

۶۔ سید وحید الدّین سلیم:

غالباً ۱۸۵۹ء میں ہریانہ کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حاجی فرید الدّین وہیں حضرت شاہ بوعلی قلندر کی درگاہ کے متولّی تھے۔ وہ زمانہ لاکھ زیادہ خوش اعتقادی کا تھا، اور لوگ درگاہوں، خانقاہوں کے زیادہ ماننے والے اور وہاں منّتیں مانتے اور چڑھاوے چڑھاتے تھے، اس کے باوجود تصوّر کیا جاسکتا ہے کہ کتنی آمدنی ہوتی ہوگی۔ غرض کہ خاندان کی تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی۔ اس پر بھی وحید الدّین نے لشتم پشتم مقامی اسکول سے آٹھویں کی سند لینے کے بعد لاہور پہنچ کر اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا۔ اور یہاں مختلف مشاہیرِ عہد سے عربی اور دینیات کی مختلف شاخوں کی تحصیل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد اوّل ایجرٹن کالج، بہاولپور میں عربی اور فارسی پڑھانے کی جگہ مل گئی۔ یہاں رہتے تین چار سال ہوئے ہونگے کہ رامپور کے وزیر جرنیل عظیم الدّین خاں سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ان سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھیں اپنے ساتھ رامپور لوا لے گئے اور وہاں کے ہائی اسکول میں صدر مدرّس مقرّر کر دیا۔ بدقسمتی سے کوئی سال بھر بعد عظیم الدّین خاں ایک مقامی سازش کے نتیجے میں قتل کر دیے گئے۔ اس پر وحید الدّین اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ نوکری چھوڑ کر واپس پانی پت چلے آئے۔

ن پر سخت گزرے ۔ جب حالی کو معلوم ہوا، جو ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے،
ں نے سر سیّد سے سفارش کی اور یہ ان کے لٹریری اسسٹنٹ مقرّر
ے

یّد کے تصنیف و تالیف کے کام میں ان کے معاون تھے۔ ان کے کام کے حوالے
ا، کسی زیر بحث مسئلے سے متعلّق دوسرے مصنّفوں کی آرا مہیا کرنا، خود سر سیّد
ث و تمحیص کرنا تاکہ وہ اپنے دلائل کی قوت اور کمزوری کا فیصلہ کرسکیں۔
ان کے ذمّے تھا۔ اس سے سر سیّد کو جو فایدہ پہنچا، وہ اپنی جگہ۔ لیکن سیّد
دّین کے کردار کی تشکیل میں سر سیّد کی صحبت کے رول کا اندازہ لگانا
ہے۔ اسی زمانے میں ان کے ان تمام لوگوں سے بھی روابط پیدا ہوئے،
دن سر سیّد کے پاس آتے رہتے تھے۔ وہ زندگی بھر سر سیّد کے احسانات
رف اور ممنون رہے۔
کا ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وحیدالدّین نے یکم نومبر
ء کو اپنا ماہنامہ "معارف" جاری کیا۔ علی گڑھ اسکول کے تمام اکابر سے ان
ن تعلقات تھے ہی، وہ سب "معارف" کے قلمی معاون بن گئے۔ اس میں
ل نہیں ہے کہ "معارف" اپنے زمانے کا بہترین رسالہ تھا۔
کچھ ہی دن بعد وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر مقرّر ہوگئے۔ وہ
تھے کہ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ میں ایک صاحب سیّد میر جان نے "مسلم گزٹ"
یا۔ مولانا شبلی کے سیّد میر جان سے بہت گہرے تعلّقات تھے۔ شبلی کی
پر سیّد وحیدالدّین اخبار کے ایڈیٹر مقرّر ہوگئے۔ اس زمانے میں یہ
ت مشہور اور بارسوخ ثابت ہوا۔ لیکن اپنے تند و تیز مضامین کے باعث
یہ حکومتِ وقت کے عتاب کا شکار ہوگیا اور سیّد وحیدالدّین کو ادارت

سے مستعفی ہونا پڑا۔

اسی زمانے میں حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی داغ بیل پڑی اور مولوی عبدالحق کی زیرِ نگرانی نصاب کی کتابوں کی تیاری کے لیے دارالترجمہ قائم کیا گیا۔ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں سیّد وحید الدّین کو حیدرآباد بلا لیا۔ اسی دوران میں انھوں نے "اصول وضعِ اصطلاحات"، تصنیف کی، جو آج تک اس موضوع پر اردو میں واحد کتاب ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد یہ اس کے شعبۂ اردو میں مدرّس بنا دیے گئے، اور چار سال بعد صدرِ شعبہ ہو گئے۔ یہ ان کا تخلیقی دور تھا۔ انھوں نے نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا، جس میں سے بیشتر شائع ہو چکا ہے۔

موت بڑے دبے پاؤں آئی۔ ان کے دانتوں میں کیڑا لگ گیا۔ معالجوں کے مشورے سے دانت نکلوا دیے، لیکن اس سے منھ میں کوئی ایسا زخم پیدا ہو گیا جو لاکھ کوششوں کے باوجود ٹھیک نہ ہوا۔ اس کے علاج کے لیے وہ اپنے ایک دوست ڈاکٹر عبدالکریم کے پاس ملیح آباد پہنچے۔ وہیں ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو رحلت کی۔ ۶۹ برس کی عمر پائی۔ ملیح آباد میں دفن ہوئے۔

(چند ہمعصر؛ مضامینِ فرحت (۲)؛
سہ ماہی اردو، جنوری ۱۹۲۹ء؛ سہ ماہی نوائے ادب
اپریل ۱۹۶۱ء)

۷۔ اس میں مولانا دریابادی کے اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جو بعنوان "مفردات جذبات۔ حظ و کرب"، الہلال کے ۱۸ جون ۱۹۱۳ء اور ۲۵ جون ۱۹۱۳ء کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا۔ دوسری قسط کے آخر میں مولانا آزاد نے ایک مختصر نوٹ لکھا جس میں کہا:

مضمون میں جابجا حسِ لذّت والم "کو" حظ وکرب" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اسی کو بصورتِ اصطلاح عنوان میں بھی جگہ دی ہے۔ لیکن اس کے لیے "لذّت والم" ہی کے الفاظ زیادہ موزوں اور صحیح تھے۔ اوّل تو "حظ" کے معنی لذّت کے نہیں، بلکہ حصّے کے ہیں (الحظ: النصیب، جمع: حظوظ) البتہ اردو اور شاید فارسی میں بھی لذّت کے لیے بولتے ہیں، لیکن باعتبارِ لغت غلط ہے، اور عربی میں تو اس معنی کا کہیں پتہ نہیں۔

مولانا دریا بادی کو یہ منظور نہیں تھا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ان کے پیش کردہ اصطلاحی الفاظ "حظ وکرب" ہی صحیح ہیں۔ اس پر ایک طویل بحث کا آغاز ہوگیا (پوری روداد اور متعلقہ مضامین کے لیے دیکھیے: ابوالکلام وعبدالماجد ادبی معرکہ) از ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)

۸۔ خط نمبر ۶ اور خط نمبر ۵ کے درمیان ساڑھے پانچ سال کا فاصلہ ہے۔ پچھلا خط 'حظ وکرب' والی بحث کے زمانے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد خط وکتابت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ پھر الہلال بھی بند ہوگیا، اور خود مولانا آزاد کو بنگال سے نکل کر رانچی (بہار) میں پناہ لینا پڑی۔ اب مولانا دریا بادی نے تجدیدِ تعلّقات کے لیے خط لکھا، جس کا یہ (خط نمبر ۶) جواب ہے۔
اس جگہ اسی قلمی مناقشے کی طرف اشارہ ہے جس کا پچھلے خط کے حواشی میں ذکر ہو چکا ہے۔

۹۔ یہ اپنی جلاوطنی اور رانچی میں نظر بندی کی طرف اشارہ ہے۔

۱۰۔ مولانا حمیدالدّین فراہی:

مولانا شبلی کے ممیرے بھائی تھے، ان کے والد مولوی عبدالکریم، مولانا شبلی کے

ماموں تھے۔ ضلع اعظم گڑھ میں ایک مختصر گانو" پھریہا" ہے، یہیں ۱۲۸۰ھ د
میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ان کا نام حمیدالدین تھا، لیکن عربی کے شغف میں ا
عبدالحمید کرلیا تھا۔ اور گانو "پھریہا" کو معرّب کرکے "فریہا"، بنا دیا۔ اور تخ
فراہی (حمیدالدین فراہی) کے نام سے معروف ہوگئے۔
فارسی اور عربی میں منتہی تھے۔ اس دور میں جب مسلمانوں میں انگریزی
کی حیثیت رکھتی تھی اور انگریزی پڑھنا پڑھانا کفر کے مرادف خیال کیا ج
انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی سند بھی حاصل کی۔
تعلیم کے بعد ملازمت کا دور آیا۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۶ء تک مدرستہ الاسلام
میں مدرّس رہے۔ اس کے بعد دو برس علی گڑھ کالج میں گزرے (۰۷
اور پھر الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرّر ہوگئے۔ یہاں ۱۹۱۳ء تک
حیدرآباد میں عربی کا قدیم تعلیمی ادارہ ، دارالعلوم، مدراس یونیورسٹی سے
تھا۔ ۱۹۰۸ء میں یونیورسٹی نے اس کا الحاق منسوخ کردیا۔ اس کے بعد ریا
اصحاب حل وعقد نے اسے ایک مشرقی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کرنے
رکھی۔ مولانا شبلی بھی اس مجلس کے رکن تھے۔ وہ تجویز تو طویل بحث و تمحیص
بعد بھی منڈھے نہ چڑھی، لیکن مولانا شبلی کی سفارش پر دارالعلوم کو جاری
کے لیے مولانا حمیدالدین فراہی اس کے پرنسپل مقرّر ہوگئے۔ اور اسی سلسلے
وہ الٰہ آباد سے حیدرآباد پہنچ گئے۔
جب مولانا شبلی کا ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال ہوا ہے، تو مولانا فراہی حیدرآ
میں تھے۔ اس زمانے میں وہاں جامعہ عثمانیہ کے قیام کی تیاریاں شروع
تھیں۔ یہ بھی ان میں شامل ہوگئے۔ لیکن جلد ہی یہ مستعفی ہوکر وطن چلے آ
یہاں مدرستہ الاصلاح، سرائے میر کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔

عربی اور فارسی میں اہلِ زبان کی سی قابلیت اور صلاحیت تھی۔ قرآن فہمی میں ان کا لوہا سب نے مانا ہے۔ متعدد کتابیں شائع کیں، ان کی تفسیر قرآن کے جو اجزا شائع ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر ان کی نظر کتنی عمیق اور نکتہ سنج تھی۔

۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء (۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ) کو انتقال ہوا۔

۱۱۔ حکیم عباری۔ اس سے حکیم عبدالباری ندوی مراد ہیں۔ انگریزی طریقے پر پہلے حصّے (عبد) کا سرحرف (ع) دوسرے پر اضافہ کر دیا گیا ہے آبائی وطن امیٹھی (ضلع لکھنؤ) تھا، جہاں سے کسی زمانے میں وطن کے کچھ لوگ نقلِ مکان کر کے سترکھ میں بس گئے تھے۔ ان کے والد حکیم عبدالخالق اپنے بڑے بھائی حکیم امجد علی کے اثر و رسوخ کی بدولت ریاست گدیہ میں طبیب مقرر ہو گئے عبدالباری ۱۸۸۹ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی نجی تعلیم کے بعد ۱۹۰۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔ یہاں علّامہ شبلی کی جوہر شناس نظر نے ان کے امکانات بھانپ لیے اور ان پر خاص توجہ صرف کی۔ ندوہ کے بعد انھوں نے انگریزی اور فلسفۂ جدید کی تحصیل کی اور فلسفے میں خاص مہارت پیدا کر لی۔ فراغت کے بعد اولاً چند دن دارالمصنّفین میں بطورِ رفیق کام کیا۔ پھر کچھ مدّت دکن کالج پونا میں مدرّس رہنے کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ فلسفہ میں مقرّر ہو گئے۔ فلسفہ اور علمِ کلام میں ان کی مہارت مسلّمہ تھی۔ انھوں نے اپنی قابلیت اور علم اسلام کے دفاع اور اثبات میں صرف کیا۔ اس لیے نواب صدر یار جنگ کہا کرتے تھے کہ "فلسفہ مولانا عبدالباری کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر ایمان لے آیا ہے"۔ مدّتوں "معارف" (اعظم گڑھ) میں "عباری" کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔ سیّد سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں مضمون "معجزات اور فلسفۂ جدیدہ" انھیں کے قلم سے ہے۔

ان کی کوئی بیس بلند پایہ کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئیں۔ کچھ غیر مطبوعہ بھی رہ

گئیں۔ آخری زمانے میں بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ فروری ۱۹۷۶ء میں لکھنؤ
رحلت کی۔

۱۲۔ غالب کا مصرع۔ (کلیات غالب (فارسی): ۵۱۸) پورا شعر ہے۔

دولت بہ غلط نبود، از سعی پشیماں شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

۱۳۔ مولانا آزاد کی مشہور تصنیف۔ یہ انھوں نے رانچی کی نظر بندی کے زمانے میں الہ
منیجر (ا) اور اپنے دوست فضل الدین احمد کی فرمایش پر قلمبند کی تھی۔ یہ پہلی بار البلاغ
کلکتہ میں ٹائپ کے حروف میں چھپ کر ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی۔

۱۴۔ ویکلی Weekly ہفتہ وار۔

۱۵۔ ہندولا Hindu Law وہ قانون جو ہندو سمرتیوں کی بنا پر مرتّب کیا گیا تھا
ملک میں نافذ تھا۔

۱۶۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی مراد ہیں۔ ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ (مطابق ۱۳ ستمبر ۱۸۸۴ء) جمعہ
دلیسنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ اور پیر، ۲۳ نومبر ۱۹۵۳ء (۱۶ ربیع الاوّل ۱۳۷۳ھ
سات ۹ بجے شب کراچی میں انتقال ہوا۔ (مفصّل حالات کے لیے دیکھیے، ان کے نام کے
کے حواشی۔ خطوط ابوالکلام آزاد حصّہ دوم)

۱۷۔ 'ہمدرد' مولانا محمد علی جوہر کا مشہور روزنامہ تھا۔

۱۸۔ سیّد طفیل احمد منگلوری:

۴ دسمبر ۱۸۶۸ء کو منگلور (ضلع سہارنپور) کے ایک معزز خاندانِ سادات میں پیدا ہوئے
گھر پر اور علی گڑھ میں پائی۔ بی اے کی سند لے کر سب رجسٹرار مقرّر ہو گئے۔ ۳۰
تک یو پی کے مختلف اضلاع میں نیکنامی اور دیانتداری سے ملازمت کے بعد ریٹائر

سب طرف سے فارغ ہوکر علی گڑھ میں ڈیرے ڈال دیے۔ وہ تعلیم میں ترقی کے بہت بڑے مؤیّد تھے زندگی بھر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے رکن اور خادم رہے۔ معلوم نہیں، کتنے مدرسے اور اسکول ان کی بدولت قائم ہوئے اور زندہ رہے۔ کچھ مدّت یوپی مجلسِ واضع قوانین کے منتخب رکن بھی رہے، اور اس زمانے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ سیاست میں وہ کانگریسی خیال اور مخلوط انتخاب، کے حامی تھے۔ اسی لیے ہندو اور مسلمان، سب حلقوں میں یکساں مقبول تھے۔

وہ قابلِ لحاظ ادیب اور انشا پرداز بھی تھے۔ مدّتوں اُن کا رسالہ "سُودمند" جاری رہا۔ جس میں قوم کی تعلیم اور رہنمائی کے لیے مفید اور علمی مضامین شائع ہوا کیے۔ ان کی تصانیف میں "مسلمانوں کا روشن مستقبل" نے بہت شہرت حاصل کی۔ عمر کے آخری ایّام میں اس کا خلاصہ "روحِ روشن مستقبل" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔

ہفتہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو رڑکی ملٹری اسپتال میں جان بحق ہوئے۔ میّت وطن منگلور لائی گئی اور آبائی قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

(یادگارِ طفیل۔ خصوصی اشاعتِ ذوالقرنین، بدایوں)

۱۹۔ القرآن، سورۃ البقرہ، ۲: ۲۷۹ (تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے اعلان کی خبر سن لو)

۲۰۔ مفتی عبداللہ ٹونکی:

اپنے زمانے میں ان کا صفِ اوّل کے علما میں شمار تھا۔ غالباً ۱۸۵۰ء میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اس عہد کے چوٹی کے اساتذہ سے حاصل کی۔ ادب میں مولانا فیض الحسن کے اور دینیات میں مولانا احمد علی محدّث کے شاگردِ رشید تھے۔ مولانا فیض الحسن اورنٹیل کالج، لاہور میں ادبِ عربی کے مدرّسِ اعلیٰ تھے۔ ان کی رحلت کے بعد مفتی عبداللہ ٹونکی

ان کے جانشین ہوئے۔ یہاں ان کا بہت طویل قیام رہا۔ اس کے بعد دارالعلوم ندو
لکھنؤ میں مدرّسِ اعلیٰ ہو کر چلے گئے۔ اور پھر مدرسۂ عالیہ، کلکتہ میں اسی عہدے
ہو گئے۔ غرض ساری عمر بڑی عزّت و وقار سے علم و ادب کی خدمت اور درس و تد
بسر ہوئی۔ متعدّد بلند پایہ کتابیں ان سے یادگار ہیں۔
کلکتہ ہی میں تھے کہ بہت بیمار ہو گئے۔ ان کے صاحبزادے مفتی محمد انوار الحق بھ
میں ناظم و مشیرِ تعلیمات کے عہدے پر فائز تھے۔ یہ انھیں کے پاس چلے گئے۔
محمد انوار الحق کا نام تاریخِ ادبِ اردو میں اس لحاظ سے شہرتِ دوام کا حامل
دیوانِ غالب کا نسخۂ حمیدیہ (مطبوعہ ۱۹۲۱ء) انھیں کا مرتّب کردہ ہے۔
مفتی عبداللہ ٹونکی نے ۷ نومبر ۱۹۲۰ء کو بعارضۂ فالج بھوپال ہی میں انتقال کیا۔
(یادِ رفتگاں: ۴۰)

۲۱۔ دنیائے اسلام کی بھاری اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے، حال آں کہ یہ حقیقت ہے کہ اما
(۸۰ھ ــ رجب ۱۵۰ھ) نے اپنی فقہ کی کوئی کتاب خود مرتّب نہیں کی تھی۔ بیشک، یہ ا
ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں چند منتخب اصحاب اور تلامذہ کے ساتھ بحث و تمحیص
کے بعد اسلامی فقہی مسائل مدوّن کیے تھے اور انھیں قلمبند بھی کرا دیا تھا۔ بدقسمتی
ناپید ہو گیا اور نایاب ہے۔
آج فقۂ حنفی کا مدار ان کے دو ارشد تلامذہ قاضی ابو یوسف (۱۱۳/۱۱۷ھ ــ ر
۱۸۲ھ) اور امام محمد بن حسن شیبانی (۱۳۵ھ ــ ۱۸۹ھ) کے مرتبہ مسائل پر ہے
نے امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد پوری تفصیل و توضیح سے مدوّن کیے اور جنھیں بر
استدلال سے مزید مضبوط کیا۔ اہلِ فقہ ان دونوں کی ذاتی عظمت اور قربتِ امام
کے باعث انھیں "صاحبین" کے لقب سے موسوم کرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی یہ
کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مولانا آزاد نے اوپر اہلِ فقہ کے مسئلے "لا ربا بین الحربی والمسلم" کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی غالباً امام محمد بن حسن کا قول ہے۔

(سیرۃ النعمان از شبلی)

۲۲۔ شوکت صاحب سے مولانا شوکت علی مراد ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے بڑے بھائی (دیکھیے از علی برادران) ۱۸۷۳ء میں رامپور میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں بی اے کی سند حاصل کی اور اس کے بعد حکومتِ ہند کے محکمۂ افیون میں ملازم ہو گئے۔ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں سرگرم حصّہ لیا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو فوت ہوئے۔ جامع مسجد دلّی کے مشرقی دروازے کے سامنے مدفن ہے۔

(تذکرہ (آزاد) حواشی ص ۳۴۴)

۲۳۔ نواب علی حسن خان، بڑے باپ کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کے والد نواب والا جاہ صدیق حسن خان والیۂ بھوپال شاہجہان بیگم کے شوہر تھے۔ نواب علی حسن خان ان کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ عربی کے عالم، فارسی کے ماہر، اردو کے ممتاز مصنّف۔ شاعر بھی تھے، سلیم تخلّص تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ان کی متعدّد تصانیف میں سے صبحِ گلشن (تذکرہ شعرائے فارسی)، تذکرہ شعرائے اردو بزمِ سخن، ماثر صدّیقی وغیرہ مشہور ہیں۔ چہار شنبہ ۴ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ (۱۵ اگست ۱۸۶۶ء) بھوپال میں پیدا ہوئے۔ مختلف باکمال اساتذہ سے تعلیم پائی اور خود ہر فن میں استادی کا درجہ حاصل کیا۔ اپنے والد کی وفات (۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء) کے بعد لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا مسکن بھوپال ہاؤس (لال باغ) علمی اور ادبی (اور کسی حد تک سیاسی بھی) سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ۱۹ نومبر ۱۹۳۶ء (۲ رمضان ۱۳۵۵ھ) کو لکھنؤ میں رحلت کی۔

(یادِ رفتگاں: ۲۰۴؛ صبحِ گلشن: ۲۰۸ - ۲۰۹)

۲۴۔ مولوی عبدالرزّاق سے، عبدالرزّاق ملیح آبادی مراد ہیں۔ ان کے حالات کے لیے خطوط

ابوالکلام آزاد کا حصّہ دوم دیکھیے۔

۲۵۔ یہ کتاب دراصل جرمن مصنّف جوزف ہائیل کی تصنیف ہے۔ صلاح الدّین خدابخش نے جرمن زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ سیّد نذیر نیازی نے کیا جو "عربوں کا تمدّن" کے عنوان سے مطبع جامعۂ ملّیہ اسلامیہ دلّی سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ جیسا کہ مولانا آزاد نے لکھا، اس کتاب کا جامعۂ ملّیہ اسلامیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا، کتاب سیّد نذیر نیازی نے خود شائع کی تھی۔

۲۶۔ فٹ نوٹس Foot Notes حواشی۔

۲۷۔ لنچ (Lunch) دوپہر کا کھانا۔

خواجہ الطاف حسین حالی

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی

مشہور صحابیِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اور بعدِ ہجرتِ مدینہ منورہ میں ان کے پہلے میزبان حضرت ایوّب انصاری کی نسل میں تھے۔ مادری سلسلہ ۳۴ واسطوں سے حضرت رسولِ کریم صلعم سے جا ملتا ہے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ خواجہ ملک ہروی خاندانِ بلبن کے عہدِ حکومت میں ہندستان آئے اور پانی پت کے قاضی مقرّر ہوئے۔ لیکن یہ شان و شوکت حالی تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکی تھی۔ ان کے والد خواجہ ایزد بخش کی ساری عمر تنگی ترشی میں بسر ہوئی۔

حالی ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پیدا ہوئے۔ نو برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی امداد حسین اور بڑی بہن نے کی تعلیم حاصل کرنے کا شوق بچپن سے تھا۔ اگرچہ گھر والوں نے بہت کم عمری میں شادی کردی تھی۔ لیکن یہ پابندی بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ بمشکل سترّہ برس کے تھے کہ ۱۸۵۴ء میں چپکے سے نکل کھڑے ہوئے اور دلّی پہنچ گئے کہ علم و فضل کا مرکز تھی۔ یہاں مختلف اساتذہ کی خدمت میں رہ کر عربی اور دینیات میں معقول استعداد پیدا کی۔ لیکن اس دوران میں گھر والوں نے ان کا کھوج نکال لیا اور اگلے ہی برس دلّی پہنچ گئے۔ ان کے اصرار پر پانی پت واپس جانا پڑا۔ اور کسبِ معاش کے لیے کلکٹر حصار کے دفتر میں کلرکی قبول کر لی۔

سال بھر بعد، ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ بپا ہو گیا اور نوکری کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اگلے

پانچ چھ برس بیکاری میں مکان پر گزرے۔

۱۸۶۳ء میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے انھیں اپنے منجھلے بیٹے نقشبند خاں بہادر کا اتالیق مقرر کردیا اور یہ جہانگیرآباد (ضلع بلند شہر) منتقل ہو گئے۔ یہاں ان کا تقریباً سات برس قیام رہا۔ انھیں ایام میں انھوں نے شعر گوئی پر زیادہ توجہ کی۔ شیفتہ کی صحبت کے خوشگوار اثرات تو تھے ہی! اب انھوں نے میرزا غالب سے باقاعدہ تلمذ کا سلسلہ بھی قائم کرلیا۔

۱۸۷۰ء میں وہ لاہور میں سرکاری بک ڈپو سے چھپنے والی کتابوں کی زبان کی اصلاح کرنے پر مقرر ہوئے۔ چار سال بعد دلّی چلے آئے اور اب کے اینگلو عربک اسکول میں بمشاہرہ ۶۰ روپے عربی اور فارسی کے مدرّس بن گئے۔ گویا معاش کی طرف سے بیفکر ہو گئے۔ سرسید احمد خاں سے اسی زمانے میں ملاقات ہوئی۔ اس تعلّق نے ان کی شاعری پر بہت تعمیری اور معنی خیز اثر کیا۔ ان کی مشہور نظم مدّوجزرِ اسلام یعنی مسدّس حالی اس کا ثمرہ ہے۔ ۱۸۸۷ء میں ریاست حیدرآباد کی طرف سے ان کا بصیغۂ مصنّفین ۷۵ روپے (حالی) ماہانہ وظیفہ مقرّر ہو گیا۔ چار برس بعد ریاست نے اسے بڑھا کر سو روپیہ ماہانہ کردیا۔ اس پر انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا کہ ان کے بقول یہ آمدنی ان کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ اب انھوں نے پانی پت میں مستقل رہائش اختیار کرلی اور یکسوئی سے علم و ادب کی خدمت کے لیے وقف ہو گئے۔ جون ۱۹۰۴ء میں انھیں حکومت کی طرف سے علمی اور ادبی خدمات کے لیے خطاب شمس العلماء عطا ہوا۔

۷۷ برس کی عمر میں یکم جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ) کے اوّلین وقت (یعنی ڈھائی بجے شب) پانی پت میں رحلت کی اور وہیں حضرت شاہ شرف الدّینؒ بوعلی قلندر کی درگاہ کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئے۔

مولانا آزاد سے ان کی پہلی ملاقات انجمن حمایت اسلام، لاہور کے سالانہ جلسے کے موقع پر اپریل ۱۹۰۴ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد یہ تعلقات مرورِ زمانہ سے ترقی کرتے گئے۔ جب مولانا آزاد نے ۱۹۱۲ء میں 'الہلال' جاری کیا، تو اسے اعزازاً مولانا حالی کی خدمت میں بھیجنا شروع کیا، جسے انھوں نے واپس کر دیا۔ اس پر مولانا آزاد نے ان کی خدمت میں یہ خط لکھا۔

ہم نے یہ خط "تبرکاتِ آزاد" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر (ص ۱۷۵) سے نقل کیا ہے۔

دیوانِ نظیری نیشاپوری : ۱۸۸

غلام رسول مہر

۱۔ غلام رسول مہر

ان کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ۱۳ اپریل ۱۸۹۵ء کو پھول پور (ضلع جالندھر) میں پیدا ہوئے۔ ضلع جالندھر (پنجاب ہندستان) کے ایک اعوان زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

ان کے والد چودھری محمد علی خان اعوان ان کی کم عمری میں فوت ہو گئے تھے۔

ابتدائی تعلیم نجی طور پر پائی۔ پھر دسویں درجے تک مشن ہائی اسکول، جالندھر سے اور اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں اسلامیہ کالج، لاہور سے بی اے کی سند لی۔

طالبعلمی کے زمانے ہی سے علم و ادب کا شغف پیدا ہو گیا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ الہلال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر تھا کہ میں نے صحافت کا پیشہ اپنے لیے منتخب کیا۔

مولانا آزاد نے ۱۹۱۳ء میں حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کی تھی جس کا مقصد مسلمانوں کو اسلام کی خدمت کے لیے تیار کرنا تھا۔ مہر صاحب بھی اس کے رکن بن گئے، مولانا آزاد نے بعد کو حزب اللہ کے اراکین کی تعلیم و تربیت کے لیے "دارالارشاد" قائم کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن مارچ ۱۹۱۶ء میں انھیں بنگال بدر کر دیا گیا اور وہ رانچی چلے گئے۔ اس سے وہ منصوبہ بر روئے کار نہ آ سکا۔

مہر بی اے کی سند حاصل کرنے کے بعد پائیگاہ وقار الامرا، حیدرآباد (دکن) میں انسپکٹر مدارس مقرر ہو گئے۔ وہاں سے ۱۹۲۰ء میں وطن واپس آئے۔

زمیندار (لاہور) اس عہد کا مشہور روزنامہ تھا۔ مہر وطن آئے، تو زمیندار کے منیجر (شفاعت اللہ خان صاحب) جن سے دوستانہ تعلقات تھے، انھیں

ملا کر لاہور ے گئے۔ زمیندار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان اور عبدالمجید سالک
رہو چکے تھے۔ اب مہر ایڈیٹر مقرر ہوئے (نومبر ۱۹۲۱ء) مہر خود لکھتے ہیں کہ
ے پہلے میں نے کبھی کسی اخبار یا رسالے کے لیے مضمون تک نہیں لکھا تھا لیکن
ان کے خاندان کے لوگ لاہور پہنچے اور اُن کے اصرار پر انھیں یہ ملازمت
ترک کے وطن واپس جانا پڑا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ضمانت ضبط ہو جانے
نت زمیندار بھی (عارضی طور پر) بند ہو گیا۔ تین چار مہینے بعد اخبار دوبارہ
ہوا تو مہر کو پھر دعوت دی گئی اور اب کے وہ اپنے خاندان کی رضامندی
ہور پہنچے اور زمیندار کے مدیر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ چند
سالک بھی رہا ہو کر آ گئے۔ اور دونوں کی ادارت میں زمیندار ترقی کی منازل طے
نے لگا۔

رفتہ مہر اور سالک کے تعلقات ظفر علی خان اور ان کے صاحبزادے اختر علی
سے بگڑ گئے۔ نوبت بایں جا رسید کہ مارچ ۱۹۲۷ء میں دونوں نے زمیندار کی
ت سے استعفٰی دے دیا۔ ان کے ساتھ ہی پورے عملے اور کاتبوں تک نے
مال کر دی۔ مہر اور سالک نے مجبوراً دوستوں سے مالی امداد لے کر اپنا اخبار
نقلاب" جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا تھا۔ اردو
قت میں "انقلاب" کی خدمات بہت نمایاں رہیں۔ لیکن پاکستان بن جانے کے
اس کے وہاں کی حکومت سے اختلاف پیدا ہو گئے، تو انھوں نے اخبار بند کر
۔ آخری پرچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا تھا۔

کے بعد مہر نے اپنا پورا وقت علم و ادب اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف کر دیا۔
ں نے کم و بیش ڈیڑھ سو کتابیں لکھی ہوں گی۔ ان میں تاریخ، مذہب، ادب
مہ، بچوں کا ادب سب کچھ شامل ہے

منگل، ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء (۲۶ رمضان ۱۳۹۱ھ) علی الصباح حرکتِ قلب بند ہوجانے سے رحلت کی۔ اپنے مسکن مسلم ٹاؤن (لاہور) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ عیسوی تاریخ ہوئی: نثرادِ قدس و وقارِ وطن غلام رسول (راغب مراد آبادی)
(تذکرہ معاصرین، ۱: ۳۹۸ - ۴۰۶؛ صحافت پاکستان وہند میں، ۲۲۰ - ۲۲۲؛ وہ صورتیں الٰہی: ۲۳۶-۲۶۵؛ مولانا غلام رسول مہر، حیات اور کارنامے)

۲۔ قرآن میں دو گروہوں کا ذکر ہے: حزب الشیطان اور حزب اللہ۔ حزب الشیطان سے متعلق فیصلہ ہے، کہ وہ ناکام اور نقصان اٹھانے والے ہوں گے (المجادلہ ۵۸: ۱۹) اور حزب اللہ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا کی عنایات سے خوش ہوئے؛ یہی لوگ حزب اللہ ہیں اور یاد رکھو کہ وہی مفلح اور کامیاب ہیں (۵۸: ۲۲)۔ دوسری جگہ فرمایا کہ یقیناً حزب اللہ ہی غالب رہیں گے (المائدہ، ۵: ۵۶)

اسی سے مولانا آزاد کو خیال آیا کہ مسلمانوں میں سے "ارباب درد" کی ایک جماعت تیار کی جائے، جو "آج کام کے لیے اپنے اندر کوئی سچی مستعدی اور اس کا اضطراب رکھتے ہیں" انھوں نے اس جماعت کا نام "حزب اللہ" تجویز کیا اور الہلال کے قارئین کو دعوت دی کہ وہ اس میں شامل ہونے کے لیے اپنے نام پیش کریں (الہلال: ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء: ۲۵۷) اس پر ایک ہفتے کے اندر آٹھ سو اصحاب نے لبیک کہی (الہلال، ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء: ۲۷۶) اب ضرورت تھی، کہ تحریک کو باقاعدہ شکل دی جائے۔ چنانچہ ممبری کے فارم چھپوائے گئے اور قواعد و ضوابط کی تشریح کے لیے رسالہ "دعوت و تبلیغ" چھپنے کی اطلاع دی گئی۔ ممبری کے فارم پر غالباً "نحن انصار اللہ" کے

عنوان کے تحت قرآن کی صرف دو آیتیں درج تھیں۔ (ترجمہ) "میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے، اور میں (اللہ کے فرماںبرداروں میں) پہلا فرماںبردار ہوں (الانعام، ۶: ۱۶۲ - ۱۶۳) اس کے نیچے ممبر کو اپنے دستخط، پیشہ، عمر اور پتا لکھنا تھا۔ (ایوان اُردو، دسمبر ۸۸ء: ۹۶ - ۹۷)

بہت دن کے بعد انھوں نے "حزب اللہ" سے متعلق دو قسطوں میں ایک بسیط مضمون لکھا، جس میں اس کے اغراض و مقاصد اور طریق کار ذرا تفصیل سے بیان کیے۔ اس کی پہلی قسط (مطبوعہ الہلال ۱۲ - ۱۹ نومبر ۱۹۱۳ء: ۵ - ۱۱) سراسر تمہید پر مشتمل ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی فرد یا پوری امت میں تبدیلی یا اصلاح ہمارے مدِنظر ہو، تو اس کا مقصد، وحید اور طریقہ کار "اتباعِ اسوۂ حسنۂ ابراہیمی و محمدی علیہما الصلوٰۃ والسلام" ہونا چاہیے۔ اس کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اس کا بانی اور داعی (مصلح) مخلص اور سراسر نمونۂ خیر ہو، بلکہ اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے، جو اس داعی کی دعوت کو اپنی ذات اور اعمال میں منتقل کرے؛ اور اسے نقطۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی تمام مساعی صرف کر دے۔

دوسری قسط (الہلال، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء: ۵ - ۸) کے آخر میں انھوں نے "حزب اللہ" کے دستور العمل کا کسی قدر صراحت سے ذکر کیا ہے۔ اس کی بنیاد انھوں نے سورۂ توبہ (۹) کی آیت (۱۱۲) پر رکھی ہے، جس میں مومنوں کی آٹھ صفات بیان کی گئی ہیں:

(۱) التائبون: اعتقاد و اعمال کی تمام گمراہیوں اور غفلتوں سے کنارہ کشی کر کے

درگاہِ الٰہی میں جھک جانے والے؛

(۲) العابدون: توبہ کے بعد عبادت کے درجۂ عالیہ تک پہنچنے والے؛

(۳) الحامِدون: انسانی اعمال کی مدح وثنا اور اغراض و مقاصد کے غلغلے کی جگہ خدائے قدوس کی حمد وثنا کرنے والے۔

(۴) السائحون: حق وصداقت کی راہ میں اپنے گھر بار اور وطن کا قیام ترک کرنے والے؛

(۵) الراکعون: روح و دل اور تمام قوتوں اور جذبات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے والے؛

(۶) الساجدون: انکسارِ عبودیت کی انتہا کے طور پر سر کو دائماً اللہ تعالیٰ کے قدموں میں ڈال دینے والے؛

(۷) الآمرون بالمعروف والناہون عن المنکر: نیکی کی طرف بلانے والے اور بدی سے منع کرنے والے؛

(۸) الحافظون لحدود اللہ: دنیا میں شریعتِ حقۂ الٰہیہ کے قیام اور عدل و امنیت کے نظام کے ذمہ دار اور محافظ۔

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ دراصل یہ 'حزب اللہ' کے اراکین کے ارتقائی سفر کی آٹھ منازل ہیں۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کے نفاذ کا ذمہ دار سمجھے اور اس راہ میں اپنے آپ کو کھپا دے۔ یہی وہ حدود ہیں جن کو قرآن اور رسولؐ نے "کہیں دینِ حنیف، کہیں صراطِ مستقیم، کہیں فطرت اللہ، کہیں سنت اللہ، اور پھر کہیں الاسلام کے نام سے تعبیر کیا ہے"۔ وہ لکھتے ہیں: "یہی قرآن حکیم کے مقرر کردہ مراتبِ عمل ہیں، جن کو حلقۂ حزب اللہ، اختیار کریگا۔" (ایضاً: ج ۸)

اس کے بعد انھوں نے "حزب اللہ" کے اراکین کے تین طبقوں کی نشاندہی کی: (۱) جو ترکِ اعمال اور ارتکابِ معاصی سے اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں (۲) جنھوں نے معاصی کو ترک کیا، اور اعمال کو اختیار کیا ہے؛ اور (۳) وہ جو اذنِ الٰہی سے تمام اعمالِ حسنہ و صالحہ میں، اوروں سے آگے بڑھے ہوئے ہیں"۔ (سورۂ فاطر، ۳۵ : ۳۲)

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اتنا مفصّل اور بسیط مضمون لکھنے کے بعد بھی انھوں نے "حزب اللہ" کے مقاصد پر صراحت سے کوئی روشنی نہیں ڈالی بلکہ مبہم اشاروں پر اکتفا کی۔ اس مضمون کا آخری پیرا ملاحظہ ہو:

> اس دوسری جماعت میں سے جو فرزندانِ حق اپنے اعمال و افعال سے درجۂ سابقت و مرتبۂ علو و رفعت حاصل کریں گے، ان ہی سے یہ آخری جماعت منتخب ہوگی، اور یہی جماعت "حزب اللہ" کا خلاصۂ مساعی و جہاد اور اس کی اصلی حکمران جماعت ہوگی۔ یہ لوگ "سابق بالخیرات" اور "حافظین لحدود اللہ" ہوں گے۔ خدا تعالیٰ جو کام ان سے لینا چاہیگا، خود دے گا؛ اور جس مقصد کی طرف انھیں کھینچے گا وہ اس طرف کھنچ جائیں گے۔ ان کے مقصدِ آخری کو نہ اس وقت بتلایا جا سکتا ہے، اور نہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ جو سالک کہ ابتدائی دو جماعتوں سے ترقی کر کے اس درجے تک پہنچیگا، وہ خود وہاں کے اسرار و رموز سے آشنا ہو جائیگا۔ اس سے پہلے وہاں کے حالات کسی پر منکشف نہ ہو سکیں گے۔ کسی عضوِ جماعت کے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کے انکشاف کے درپے ہو۔ اور وقت سے پہلے انھیں معلوم کرنا چاہے۔

لیکن مارچ ۱۹۱۶ء میں انھیں بنگال سے نکال دیا گیا، اور وہ رانچی (بہار) میں مقیم ہو گئے۔ اس سے یہ اسکیم بھی ترقی نہ کر سکی۔

۳۔ کلیاتِ عرفی: ۳۱۷۔ مطبوعہ دیوان میں مصرعِ ثانی میں عاطفہ موجود نہیں ہے۔

۴۔ ایک صاحب تھے، مولوی سراج الدین احمد، کرم آباد (ضلع گوجرانوالہ۔ پنجاب، پاکستان) کے رہنے والے۔ ان کی ساری عمر ڈاک کے محکمے کی ملازمت میں گذری۔ ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو انھوں نے جون ۱۹۰۳ء میں لاہور سے زمیندار کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا یہ پرچہ اسم بامسمیٰ تھا، سراسر زمینداروں کے کام کا۔ اس میں کھیتی باڑی سے متعلق مضامین چھپتے تھے اور یہ سب مولوی سراج الدین احمد خود ہی لکھتے۔ بھلا کسانوں اور کاشتکاروں کے طبقے میں، جن کے لیے انھوں نے یہ جنجال سہیڑا تھا، اس زمانے میں پڑھنے والے اور ان مضامین سے استفادہ کرنے والے ہی کتنے لوگ تھے! ظاہر ہے کہ جلد یا بدیر زمیندار کو مالی مشکلات پیش آنا ہی تھیں۔ اس پر وہ اسے لاہور سے اپنے گاؤں کرم آباد لے گئے، جہاں انھوں نے اسے نشتم پشتم جاری رکھا۔

۶ دسمبر ۱۹۰۹ء کو مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہو گیا۔ بسترِ مرگ پر انھوں نے اپنے بیٹے ظفر علی خاں کو وصیت کی کہ زمیندار جاری رکھا جائے۔ ظفر علی خاں نے نہ صرف والد کی وصیت پر عمل کیا، بلکہ اسے اپنے دور کا ممتاز ترین روزنامہ بنا دیا۔ وہ اس کا دفتر کرم آباد سے واپس لاہور لے آئے، اور اکتوبر ۱۹۱۱ء میں اسے ہفتہ وار سے روزنامہ کر دیا۔

زمیندار اپنے زمانے کا نہایت کامیاب اخبار تھا۔ مختلف اوقات میں اس کے

ادارۂ تحریر میں عبداللہ العمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، نیاز فتحپوری، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، مرتضیٰ احمد خان میکش، نصراللہ خان عزیز وغیرہ نے کام کیا۔ اسی سے زمیندار کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بعد کو اپنے پرچے اور اخبار نکالے اور کامیاب صحافی ثابت ہوئے۔

اردو کے کسی روزنامے کو زمیندار کے برابر حکومتِ انگریزی کا معتوب نہیں ہونا پڑا۔ بار بار اس کی ضمانت ضبط ہوئی، چھاپے خانے پر حکومت نے قبضہ کر لیا، لیکن قوم نے روپیہ جمع کر کے زمیندار کی جھولی میں ڈال دیا اور اخبار پھر سے جاری ہو گیا۔

یہ یاد رہے کہ زمیندار نے کئی بھیس بدلے۔ شروع میں دوسرے اخباروں کی طرح یہ بھی انگریزی حکومت کا مدّاح اور نیاز مند تھا۔ صفحۂ اوّل کی پیشانی پر جلی حروف میں یہ شعر چھپتا تھا:

تم خیر خواہِ دولتِ برطانیہ رہو
سمجھیں جنابِ قیصرِ ہند اپنا جاں نثار

جب سیاسی تحریک کی گرما گرمی شروع ہوئی اور زمیندار بھی اس میں سرگرم حصّہ لینے لگا تو اس کی جگہ مندرجۂ ذیل شعر نے لے لی:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا [1]

۱۔ یہ دراصل آیتِ قرآنی (اِنَّ اللہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ) (الرعد، ۱۳: ۱۱) (اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی گروہ کو حاصل ہوتی ہے۔ جب تک کہ وہ خود اپنی صلاحیت نہ بدل ڈالے)

رفتہ رفتہ حکومت کی طرف سے سختی میں اضافہ ہوا اور دار و گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا، تو اب یہ شعر بھی ترک ہو گیا اور اس کی جگہ یہ شعر چھپنے لگا:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا [۲]

۵۔ عبدالمجید سالک:

۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ (ضلع گورداسپور۔ پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲ برس کی عمر تھی جب شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے حالی سے اصلاحِ کلام کی درخواست کی۔ انھوں نے پیرانہ سالی کا عذر کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ اقبال سے رجوع کریں۔ اقبال سے متعلق معلوم ہے کہ وہ اصلاح کے چکّروں میں نہیں پڑتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے معذرت کی اور انھیں حیات بخش رسا رامپوری یا احسن مارہروی سے خط و کتابت کرنے کے لیے لکھا کہ دونوں حضرات صاحب علم و فن تھے۔ اس پر انھوں نے رسا رامپوری کا تلمذ اختیار کر لیا۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ دو برس تک چلا۔
بی، اے میں کامیابی کے بعد پہلے ریلوے اکاؤنٹس کے دفتر میں کلرک اور پھر ایک اسکول میں مدرّس رہے۔ لیکن جلد ہی وہاں سے مستعفی ہو کر پٹھانکوٹ سے ایک "ماہنامہ" "فانوسِ خیال" کے نام سے جاری کر دیا۔ اس میں اُنھی زمانے

۲۔ یہ بھی قرآن سے ماخوذ ہے (التوبہ، ۹ : ۳۱)

يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ

(یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی اپنی پھونکوں سے بجھا دیں حالانکہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر نہیں رہنے والا، اگر چہ یہ کافروں کو پسند نہ آئے)

کے متعدد مشاہیر کا کلام نظم و نثر چھپنے لگا تھا۔ لیکن مالی دشواریوں کے باعث دس مہینے بعد پرچے نے دم توڑ دیا۔ اس کے بعد یہ لاہور چلے آئے۔ (۱۹۱۹ء) یہاں دارالاشاعت کے مالک سید ممتاز علی نے انھیں اپنے دونوں پرچوں۔ تہذیبِ نسواں اور پھول — کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اسی زمانے میں سید ممتاز علی کے چھوٹے صاحبزادے سید امتیاز علی تاج نے ماہنامہ "کہکشاں" جاری کیا۔ سالک اس کے ادارۂ تحریر میں بھی شامل ہو گئے۔ یہیں دارالاشاعت میں ایک دن ان کی مولانا ظفر علی خان سے ملاقات ہوئی۔ جو یہ کہہ کر کہ "بچوں کے رسائل کی ادارت آپ کے شایانِ شان نہیں" انھیں اٹھا کے اپنے دفتر لے گئے (۱ اپریل ۱۹۲۰ء)۔ یہ انگریزی اقتدار کے خلاف کانگریس تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اخباروں کی ضمانت ضبط ہوتی۔ اور ان کے ایڈیٹر قید و بند کے مستحق گردانے جاتے تھے۔ سالک زمیندار میں اداریہ لکھتے تھے۔ ۴ نومبر ۱۹۲۱ء کے اداریے پر یہ گرفتار کر لیے گئے اور ایک سال کی قید کے سزاوار قرار پائے۔ رہائی کے بعد دفتر پہنچے تو غلام رسول مہر سے ملاقات ہوئی، جو ان کی غیر حاضری میں زمیندار میں آ گئے تھے۔ یہ قران السعدین اردو صحافت اور علم و ادب کے لیے بہت مبارک اور سود مند ثابت ہوا۔

انتظام یہ ہوا کہ روزانہ اداریہ مہر لکھتے تھے اور سالک مزاحیہ کالم۔ "افکار و حوادث" یہ عنوان تو ان کی اختراع نہیں تھی کیونکہ اس سے پہلے الہلال میں بھی اسی عنوان سے مطائبات و شذرات وغیرہ شائع ہوتے رہتے تھے۔ لیکن سالک کا یہ مزاحیہ کالم ایسا مقبول ہوا کہ اس کے بعد تقریباً ہر ایک اخبار کے لیے یہ ناگزیر سا ہو گیا۔

مارچ ۱۹۲۷ء میں مولانا ظفر علی خان سے اور خاص کر ان کے صاحبزادے اختر علی خان سے اختلافات ہو جانے پر مہر اور سالک زمیندار سے الگ ہو گئے اور انھوں نے اپنا ذاتی روزنامہ "انقلاب" جاری کر دیا۔ یہ اخبار پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے بعد تک نہایت کامیابی سے جاری رہا۔ لیکن اب ان دونوں نے دیکھا کہ حکومت وقت کی خوشنودی (اور تائید) حاصل کرنے کے لیے جب تک اپنے صحافتی اصولوں کی قربانی نہ دی جائے، ہم یہ پرچہ جاری نہیں رکھ سکتے، تو انھوں نے انقلاب بند کر دیا۔
سالک کا کلام "راہ و رسم منزل ہا" کے عنوان سے بعض دوستوں نے ان کی قید کے زمانے میں شائع کر دیا تھا۔ بعد کا کلام غیر مطبوعہ رہ گیا! انھوں نے اس کی اشاعت پر توجہ بھی نہیں کی۔ انھوں نے "سرگزشت" کے عنوان سے اپنی سوانح عمری لکھی۔ 'ذکر اقبال'، 'یاران کہن'، ہندستان میں اسلامی تمدن، ان کی دوسری مشہور اور کامیاب تصانیف ہیں۔ لیکن ان کا اصلی کارنامہ "افکار و حوادث" اردو کے مزاحیہ ادب کا درخشاں باب ہے۔ وہ ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار دل و دماغ پر مسرت اور انبساط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ کاش کے دو تین جلدوں میں ان کے اس کالم کے انتخاب شائع ہو جاتے!
یکشنبہ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء چار بجے سہ پہر یکایک حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ حفیظ جالندھری نے ہجری تاریخ کہی:

بملک بقا رفت عبد المجید — ز دار فنا کرد عزم بہشت
ہمیں است تاریخ مرگش، حفیظ! — "بشد سالک راہ بزم بہشت"
(۱۳۷۹ھ)

(سرگزشت، صحافت پاکستان و ہند میں)

۶۔ ظفر علی خان:

۱۸۷۰ء میں کرم آباد ضلع گوجرانوالہ پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ وزیر آباد سے آٹھویں کی سند لے کر وہ پٹیالہ گئے، جہاں ان کے پھوپھا مولوی عبداللہ خان مقامی مہندر کالج میں عربی کے مدرس تھے۔ یہاں سے دسویں کی سند لی اور پھر علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے بی اے درجۂ اول میں پاس کیا؛ اور اس کے بعد نواب مہدی حسن محسن الملک کے پرائیوٹ سکرٹری مقرر ہو گئے۔ پھر انھیں کی سفارش پر حیدر آباد ریاست میں ملازمت مل گئی۔ بتدریج ترقی کر کے وہاں ہوم سکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ اس کے بعد چند سے ایک دوست کی شراکت میں تجارت کا ناکام تجربہ بھی کیا۔ جب اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تو دوبارہ حیدر آباد کا رخ کیا اور وہاں محکمۂ قانون کی رجسٹراری قبول کر لی۔ ظفر علی خان کو متعدد زبانوں (مثلاً اردو، انگریزی، ہندی، فارسی عربی) پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور ترجمہ کرنے میں بےمثال مہارت تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے لارڈ کرزن کی انگریزی کتاب Garden of Persia کا ترجمہ "خیابانِ فارس" کے عنوان سے کیا۔ اس پر حضور نظام نے تین ہزار روپے کا اور پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے پانچسو روپے کا انعام دیا۔ خود لارڈ کرزن نے بھی طلائی دستے کی چھڑی تحفے میں دی۔ اس کے بعد انھوں نے متعدد اور کتابوں کے ترجمے کیے ایک سے ایک بڑھ کر؛ اور اس حیثیت سے ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

لیکن حیدر آباد کی فضا سازگار ثابت نہ ہوئی اور انگریز ریذیڈنٹ (سر مائیکل اوڈوائر) کے ایما پر انھیں ریاست بدر کر دیا گیا۔ وہ اپنے

گانو کرم آباد پہنچے ۔ یہاں ان کے والد مولوی سراج الدین احمد ان دا
بہت سخت بیمار تھے ۔ اسی مرض میں دو مہینے بعد ان کا انتقال ہو گیا ، اور ا
ہفتہ وار اخبار زمیندار ظفر علی خان کو ورثے میں ملا ۔ انھوں نے اس کا د
لاہور منتقل کر دیا اور تھوڑی مدت بعد یہ ہفتے وار کی جگہ روز نامہ بن
روز نامے کی حیثیت سے زمیندار نے علم و ادب ، صحافت و سیاست کی
شاندار خدمات سرانجام دیں ، وہ کسی سے مخفی نہیں ۔ یہ حقیقتاً اردو صحافت
درسگاہ ثابت ہوا ۔

مولانا ظفر علی خان کو بار بار قید و بند کی مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا ،
ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی ۔

آخری زمانہ بہت عسرت اور بیکسی میں گزرا ۔ ۲۷ ۔ نومبر ۱۹۵۶ء کو
فالج اپنے وطن کرم آباد ہی میں رحلت کی ۔ وفات کے وقت عمر ۸۶ بر
کی تھی ۔

۷ ۔ اختر علی خان :

مولانا ظفر علی خان کے اکلوتے بیٹے تھے ۔ یہی وقتاً فوقتاً زمیندار کے
لیکن ان میں نہ والد کی لیاقت تھی ، نہ سلیقہ ۔ ان کی شہرت بس مولانا ظف
کے فرزند کی سی ہے ۔ بہت دن اختلاج اور خون کے دباؤ سے بیمار رہے ۔
کی تکلیف اس پر مستزاد ۔ زمیندار ، سے دستبردار ہو کر وطن کرم آباد چلے ۔
وہاں طبیعت زیادہ خراب ہوئی ، تو واپس لاہور آئے ۔ یہیں ۱۶
اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب میں گیارہ بجے انتقال ہوا ۔ ۶۷ بر
کی عمر پائی ۔

۸۔ سی۔ آر۔ داس (چت رنجن داس) قومی تحریک کے صفِ اوّل کے رہنما ۵ نومبر ۱۸۷۰ء کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بھوبھن موہن داس کلکتہ ہائی کورٹ کے مشہور وکیل تھے۔ وہ دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے۔ لیکن غیر معمولی فراخدستی اور غیر معتدل عادات و اطوار کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر انھیں دیوالیہ بننا پڑا۔

ان کا ۱۹۱۴ء میں انتقال ہوا۔

چت رنجن داس نے ۱۸۹۰ء میں پریذیڈنسی کالج، کلکتہ سے بی، اے کی سند لی۔ اس کے بعد وہ ولایت گئے۔ ان کا ارادہ وہاں آئی، سی، ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنے کا تھا، لیکن وہ اس میں ناکام رہے اور مجبوراً انھیں بیرسٹری پر قناعت کرنی پڑی۔ وہ ۱۸۹۴ء میں انرٹمپل سے بیرسٹر ہوئے۔

کالج کی تعلیم کے زمانے میں بھی وہ طلبہ کی سرگرمیوں میں سرگرم حصّہ لیتے رہے تھے۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں (۱۸۹۰ء۔ ۱۸۹۴ء) انھیں دادابھائی نارو جی کی انتخابی مہم میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یوں ان کی سیاسی زندگی کی بنیاد مضبوط ہوگئی۔ ۱۸۹۴ء میں واپس وطن آئے تو کلکتہ میں وکالت شروع کی لیکن یہ وہ زمانہ ہے جب کلکتہ میں بعض بڑے بڑے پرانے تجربہ کار وکلاء جمع تھے۔ یہ نئے تے اور مقابلہ سخت۔ اس لیے یہاں وہ پیشے کے لحاظ سے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ اس پر انھوں نے مفصّلات کی عدالتوں میں کام شروع کر دیا۔ اور اب خوب شہرت حاصل کی۔ ان کی پیشہ ورانہ کامیابی میں موڑ ۱۹۰۸ء میں آیا جب انھوں نے شری آربندو گھوش کے خلاف بغاوت کے مقدّمے میں ان کا دفاع کیا۔ وہ انھیں بری کرانے میں کامیاب ہو گئے اور

بطور ماہر قانوندان اور طلیق اللسان مقرر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ آپ دیوانی اور فوجداری — دونوں عدالتوں میں ان کی یکساں مانگ تھی۔ کامیابی ان کے پاؤں چومنے لگی۔ عام خیال تھا کہ اس زمانے میں (۱۹۱۳ء) ان کی ماہانہ آمدنی پچاس ہزار روپے سے کم نہیں تھی۔

وہ شروع سے ملکی کاموں میں دلچسپی لیتے رہے تھے لیکن اس کی شکل یا اخلاقی ہمدردی یا مالی امداد تک محدود رہی؛ وہ کبھی کھل کر عملی سیاست میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں وہ پہلی مرتبہ سیاسی میدان میں نمودار ہوئے جب انھیں بنگال پراونشل کانفرنس (بھوانی پور) کی صدارت کی دعوت دی گئی۔ اگلے آٹھ برس میں، ۱۹۲۵ء میں اپنی وفات تک انھوں نے اپنی حُبّ الوطنی، معاملہ فہمی، خطابت، خلوص نیت کا جو مظاہرہ کیا، اس سے وہ ملک کے صفِ اوّل کے ممتاز ترین لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ لوگوں نے اپنی محبّت اور ارادت کا اظہار انھیں دیش بندھو (محبِّ وطن) کا خطاب دے کر کیا۔

جب ۱۹۲۰ء میں کانگریس نے اپنے ناگپور اجلاس میں حکومت سے عدم تعاون کی قرارداد منظور کی اور ملک کے مختلف طبقوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ان تمام اداروں سے الگ ہو جائیں، جن میں حکومت کا ہاتھ ہے، تو چیت رنجن داس نے بھی وکالت ترک کر دی۔

وہ ۱۹۲۱ء کے احمد آباد کانگریس اجلاس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن اسی سال پرنس آف ویلز ہندستان آئے اور اس کے بائیکاٹ میں سرگرم حصّہ لینے پر انھیں بنگال کے بعض دوسرے لیڈروں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ مقدّمہ چلا اور چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ چنانچہ وہ اس سال (۱۹۲۱ء)

کے سالانہ اجلاس کی صدارت نہ کر سکے۔ اگلے سال رہا ہوئے تو انھیں گیا کانگرس کا صدر بنایا گیا (۱۹۲۲ء) یہی وہ زمانہ ہے، جب "چوری چورا" کے حادثے کے بعد گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک واپس لے لی تھی۔ سی۔ آر۔ داس نے گیا اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کو انتخابات میں حصّہ لے کر کونسلوں پر قبضہ کر لینا اور وہاں اندر سے حکومت کی مخالفت کر کے اسے مفلوج کرنا چاہیے۔ گاندھی جی اور ان کے ہمنواؤں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز منظور نہ ہو سکی لیکن داس ہمّت نہیں ہارے۔ انھوں نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور کانگریس کے اندر اپنے ہمخیالوں کے تعاون سے "سوراج پارٹی" کی تشکیل کی۔ اس میں بعض اہم لیڈر اُن کے ساتھ ہو گئے۔ موتی لال نہرو، علی برادران، حکیم اجمل خان، وٹھل بھائی پٹیل وغیرہ نے نئی پارٹی بنا لی۔ چندے اس کا نام (مختلف الخیال ممبروں کے باعث) کانگریس سوراج خلافت پارٹی رہا۔ لیکن بعد کو صرف سوراج پارٹی رہ گیا۔ لیکن کانگریس کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں اختلاف کسی طرح بھی مناسب نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا خصوصی اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیرِ صدارت دلّی میں ہوا۔ جس میں مولانا آزاد کی مساعی سے فریقین میں صلح ہو گئی اور کونسلوں میں داخلہ منظور کر لیا گیا۔ اس فیصلے کی تصدیق کوکناڈا کے اجلاس نے کی تھی۔ ان کا یہ پروگرام کس حد تک کامیاب رہا، اس کا بیان یہاں بمحل ہوگا۔ یہ کانگرس یا ملک کی سیاسی تاریخ کا درخشندہ باب ہے۔

۱۹۲۴ء میں کانگریس نے کلکتہ کارپوریشن پر قبضہ کر لیا، تو دیش بندھو داس

اس کے پہلے میئر منتخب ہوئے۔ اگلے سال دوبارہ میئر بنے۔
داس کو ادب سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "مالانچا" ۱۸۹۵ء میں چھپا۔ اس کے بعد چار اور مجموعے (مالا، انتریامی، کشور کشوری، ساگر سنگیت) مختلف اوقات میں شائع ہوئے۔ افسانے ان کے علاوہ ہیں۔ کچھ مدت وہ ایک بنگالی ادبی ماہی پرچہ (نارائن) بھی نکالتے رہے ۱۴ء۱۹ (۱۹۲۲ء میں انھوں نے بنگالی میں "بنگلار کتھا" کے نام سے ایک روزنامہ بھی جاری کیا تھا۔
۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو دارجلنگ میں انتقال کیا۔ ان کی لاش کلکتہ آئی، جہاں دو میل لمبے سوگواروں کے جلوس نے گاندھی جی کی سرکردگی میں اسے نذرِ آتش کیا۔ خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود۔ سیاسی زندگی لے دے کے یہی پانچ چھ برس کی رہی۔
مولانا آزاد اور دیش بندھو داس کے تعلقات بہت یگانگت اور بے تکلفی کے تھے۔ داس کی وفات پر انھوں نے ایک تعزیتی مضمون لکھا جو بہت غیر معمولی بات تھی کیونکہ اپنے معاصرین کی وفات پر انھوں نے شاذونادر ہی کوئی مضمون لکھا ہے۔ یہ مضمون اسی زمانے میں زمیندار (لاہور) کی اگست ۱۹۲۵ء کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ مہر نے اسے وہیں سے لے کر اپنی کتاب "تبرکاتِ آزاد" میں شائع کیا ہے۔ جب ۱۹۲۷ء میں الہلال کا دوسرا یا تیسرا دور شروع ہوا، تو انھوں نے داس کی دوسری برسی کے موقعے پر اسے پھر الہلال میں شائع کیا تھا (نمبر ۳-۴) (مورخہ یکم و ہشتم جولائی ۱۹۲۷ء)

۹۔ مولانا محمد علی:

۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء (۱۵ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ) کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالعلی خان صاحب ریاست رامپور کے عمائدین میں سے تھے۔ والد کا انتقال ان کی کمسنی میں ہوگیا جب یہ تقریباً دو برس کے تھے لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔ نجی تعلیم کے بعد بریلی ہائی اسکول سے دسویں کی سند لی۔ پھر علی گڑھ سے بی اے پاس کیا۔ اب آکسفرڈ چلے گئے۔ خیال تھا کہ آئی سی ایس کے مقابلے کے امتحان میں بیٹھینگے۔ لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لہذا وہاں سے بی اے کی سند لی اور واپس آگئے۔

ولایت سے واپسی کے بعد چندے اپنے وطن رامپور ریاست میں ڈائرکٹر تعلیم کے عہدے پر فائز رہے۔ لیکن ان کی جولانیٔ طبع بھلا رامپور کی محدود فضا میں کب مطمئن ہونے والی تھی۔ ڈیڑھ ایک سال کے بعد یہاں سے بھی نکل بھاگے اور بڑودہ پہنچے۔ وہاں محکمۂ افیون میں معقول مشاہرے پر ملازمت مل گئی۔ لیکن پانچ برس بعد ریاست کے چیف منسٹر سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا، تو انھوں نے ۱۹۱۰ء میں استعفیٰ دے دیا۔

محمد علی کی اُردو اور انگریزی کی لیاقت غیر معمولی تھی۔ اب انھوں نے طے کر لیا کہ انگریزی میں پرچہ نکالینگے۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں کلکتہ پہنچے اور اگلے برس (۱۹۱۱ء) میں مشہور ہفتہ وار "کامریڈ" جاری کر دیا۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ شہادت دینگے اور اعتراف کرینگے کہ اس شان اور معیار کے بہت کم انگریزی اخبار ہندوستان میں شائع ہوئے ہیں۔

۱۹۱۱ء کے اواخر میں شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا جشن دلّی میں ہوا اور اسی کے ساتھ ملک کا دارالخلافہ بھی کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا۔ محمد علی بھی "کامریڈ" کا دفتر کلکتہ سے دہلی لے آئے اور اسی کے ساتھ روزنامہ "ہمدرد" جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ خیال تھا کہ اسے ٹائپ میں شائع کریں گے۔ لیکن بیروت (لبنان) سے ٹائپ پہنچنے میں بہت تاخیر ہو گئی، تو انھوں نے شائقین کو خاموش کرنے کو ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے "نقیبِ ہمدرد" نام سے دو صفحے کا پرچہ جاری کر دیا بعد کو جب ٹائپ آ گیا تو باقاعدہ روزنامہ "ہمدرد" شائع ہونے لگا۔ یہ بہت کامیاب روزنامہ تھا لیکن افسوس کہ اس کی عمر بھی زیادہ نہ ہوئی۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اپنے زمانے کی تمام تحریکوں کے ممتاز ترین لیڈروں میں شمار تھا۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے؛ وہیں لندن میں ۴ جنوری ۱۹۳۰ء کو رحلت کی۔ لاش بیت المقدس گئی، اور مسجدِ عمر کی غربی دیوار کے سایے میں دفن کی گئی (محمد علی جوہر، محمد علی: ذاتی ڈائری)

۱۔ عبدالرّزاق ملیح آبادی:

اگرچہ ان کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے کیونکہ وہ دریافت کرنے پر ہمیشہ ہنسی میں ٹال جاتے تھے، لیکن قیاساً ۱۸۸۹ء - ۱۸۹۰ء میں ملیح آباد (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے۔ کچھ دن دارالعلوم ندوۃ العلما (لکھنؤ) میں تعلیم پائی۔ پھر ۱۹۱۴ء میں قاہرہ (مصر) چلے گئے اور وہاں مفتی محمد عبدہ کے شاگرد رشید رضا (مدیر المنار) کے مدرسۂ "دعوت وارشاد" میں ادبِ عربی اور تفسیرِ قرآن

کی تکمیل کی ۔ ۱۹۱۸ء میں واپس آئے، تو دوبارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر حدیث مکمل کی ۔

جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے، مولانا آزاد سے ان کا تعلق ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوا، اور یہ بلا انقطاع مولانا کی وفات (۱۹۵۸ء) تک قائم رہا۔ مولانا آزاد نے ۱۹۲۰ء میں اپنے قائم کردہ مدرسۂ اسلامیہ، کلکتہ کا مہتمم انھیں کو بنایا تھا۔ ہفتہ وار "پیغام" جاری کیا، تو اگرچہ وہ خود اس کے نگران تھے، لیکن ایڈیٹر ملیح آبادی ہی کو مقرر کیا۔ اسی ادارت کے زمانے میں ملیح آبادی گرفتار ہوئے اور ایک سال جیلخانے میں رہے۔ عربی رسالہ "الجامعہ" بھی انھیں کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۲۷ء میں الہلال کا دوبارہ اجرا ہوا، تو اگرچہ اس پر مولانا آزاد کا نام بطور نگران چھپتا رہا، لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اس کا نظم و نسق ملیح آبادی کے ہاتھ میں تھا۔ غرض مولانا آزاد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں ملیح آبادی مرحوم ان کے دست راست ثابت ہوئے ۔

آزادیٔ ملک کے بعد مولانا آزاد نے حکومت ہند کی طرف سے ایک تماہی عربی رسالہ "الثقافۃ الہند" جاری کیا۔ اس کے مدیر اعلیٰ بھی مولانا ملیح آبادی تھے۔ انھوں نے "آزاد ہند" کے نام سے ایک روزنامہ بھی کلکتہ سے جاری کیا تھا، جو آج تک ان کے فرزند اکبر احمد سعید ملیح آبادی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے ۔

۱۹۵۴ء میں گلے کے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ علاج سے وقتی افاقہ ہو جاتا، لیکن یہ مرض منوز لاعلاج اور جان لیوا ہے، مستقل صحت کبھی نہ ہوئی ۔ اس پر فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد اللہ کو پیارے ہو گئے، جس سے وہ اور بھی مضمحل ہو گئے ۔

۲۴ جون ۱۹۵۹ء کو ٹاٹا میموریل کینسر اسپتال بمبئی میں انتقال ہوا، جہاں وہ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ لاش ان کے وطن ملیح آباد گئی، اور ۲۶ جون ۱۹۵۹ء کو انھیں ان کے دادا نواب فقیر محمد خان گویا کے پہلو میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ تقریباً ستر برس کی عمر پائی۔
(کشکول قلمی)، ۱: ۳۵؛
مکاتیبِ ابوالکلام آزاد، ۳۴۹)

۱۱۔ الحجرات، ۴۹: ۱۲ (بہت سے شکوک سے اجتناب کرو کیونکہ بعض شک گناہ (کے برابر) ہیں۔

۱۲۔ "پیغام" ہفتہ وار پرچہ تھا، جو مولانا آزاد کی نگرانی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں کلکتہ سے نکلا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو شائع ہوا۔ یہ زیادہ دن تک زندہ نہیں رہ سکا۔ یہ خلافت تحریک کے شباب کا زمانہ تھا؛ اور مولانا اس سلسلے میں بیشتر ملک کے طول و عرض میں سفر میں رہے اور اس کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ چنانچہ دو تین مہینے میں اخبار بند ہو گیا۔ آخری شمارے پر تاریخ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء ہے۔
(دیکھیے ابوالکلام آزاد کے بارے میں: ۶۲-۶۳)

۱۳۔ یہاں غالباً مولانا ظفر علی خان کی طرف اشارہ ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے نام حذف کر دیا۔

۱۴۔ یہاں "زمیندار" ہوگا۔

۱۵۔ سیٹھ چھوٹانی:
ان کا پورا نام تھا: میاں محمد حاجی جان محمد۔ ایک میمن خاندان کے فرد تھے۔ بمبئی

میں ۱۰ نومبر ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے۔ مذہبی ماحول میں تعلیم پائی۔ پیشے کے لحاظ سے لکڑی کی وسیع پیمانے پر تجارت تھی۔ حکومتِ وقت کی طرف سے بھی ٹھیکے ملتے رہتے تھے اور بمبئی کے عمائد میں ان کا شمار تھا۔
پہلی جنگ عظیم کے دوران میں بمبئی کے بعض لوگوں کو خلافتِ عثمانیہ کی فکر ہوئی اور انھوں نے ان مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے خلافت کمیٹی قائم کی، سیٹھ چھوٹانی اس کے صدر تھے۔ بعد کو یہی کمیٹی ترقی کر کے کل ہند سنٹرل کمیٹی کی شکل اختیار کر گئی، اور سیٹھ چھوٹانی اس کے خازن مقرر ہوئے۔ یہ اس وفد میں بھی شامل تھے جو خلافت کے سلسلے میں جنوری ۱۹۲۰ء میں وائسرائے سے ملا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ اس تحریک کی مختلف ذیلی کمیٹیوں کے رکن رہے۔
مرکزی خلافت کمیٹی نے "انگورہ فنڈ" کے نام سے بہت بڑی رقم جمع کی تھی۔ سیٹھ چھوٹانی نے اس میں سے سترہ لاکھ اپنے لکڑی کے کاروبار میں استعمال کر لیا۔ کاروبار میں نقصان ہوا۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث حکومت نے ٹھیکے دینا بند کر دیے۔ بالآخر انھوں نے قرض کے عوض میں اپنی دو آرا کی مشینیں خلافت کمیٹی کے حوالے کر دیں۔ مولانا آزاد کے خط میں اسی کا ذکر ہے۔
حج کے لیے گئے ہوئے تھے کہ جون ۱۹۳۲ء میں مدینۂ منورہ میں انتقال ہوا۔

۱۶۔ See #11 اس کا ذکر مہر کے حاشیے (ص ۶ م ۱ء) میں آچکا ہے۔

۱۷۔ حافظ کا شعر ہے (دیوان حافظ شیرازی، ۱۰۶) البتہ مطبوعہ نسخے میں مصرع ثانی ہے: بوسہ چند برآمیز بدشنامے چند

۱۸۔ معلوم نہیں، کس کا شعر ہے۔

۱۹۔ اس مصرع سے متعلق بھی معلوم نہ ہو سکا۔

۲۰۔ دیوان نظیری: ۳۰۷۔ مطبوعہ نسخے میں ردیف نوشتہ ایم اور مصرع ثانی میں "بیاض" کی جگہ "علاج" ہے۔ پورا شعر یہ ہے:

رونے نکو معالجۂ عمرِ کوتہ ہست
ایں نسخہ از علاجِ مسیحا نوشتہ ایم

۲۱۔ یہ اشارہ ہے، غالب کے قصیدے یا اس قطعے کی طرف جس کا پہلا شعر ہے:

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

یہ انھوں نے الہلال (۱۷ جون ۱۹۱۴ء) میں شائع کیا تو اس کے ساتھ جو نوٹ شائع کیا، اس میں رائے ظاہر کی کہ آگرے میں دربار ہوا تھا، جس میں میرزا غالب کو مناسب جگہ نہیں ملی تھی۔ اس پر انھوں نے احتجاجاً یہ قطعہ لکھا۔ مہر نے حاشیے میں پوری کیفیت لکھ دی ہے، لہذا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

۲۲۔ مرزا محمد عسکری:

یہ ایک ترکمان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سعادت خان نواب برہان الملک کے عہد میں ان کے جدِ اعلیٰ حاجی مرزا مغل بیگ خان مغان (افغانستان) سے ہجرت کر کے ہندستان آئے۔ نواب برہان الملک ہی کی ملازمت میں کسی لڑائی میں ان کا انتقال ہوا۔

محمد مرزا خان عرف بہ مرزا خانی جن کا نام غالب کے سلسلے میں آتا ہے، ان کے

دادا تھے۔ مرزا خانی فارسی میں مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے۔ وہ دلّی میں کوتوال تھے۔ شاہ نصیر سے ایک مرتبہ بعض غیر مقلّد علما کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انھیں پکڑ لے گئے۔ مرزا خانی کو خبر ملی، تو وہ اُن کی مدد کو پہنچے اور مولویوں کے چنگل سے انھیں رہائی دلائی۔ اس پر شاہ نصیر نے لکھا:

ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے
نہ یاد آئی حدیث اُن کو، نہ کوئی نصِ قرآنی
نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا
نہ ہوتے شحنۂ دلّی، اگر یاں میرزا خانی

میرزا محمد عسکری کے والد مرزا محمد تقی مدتوں انگریزی حکومت میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز رہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں، وہاں سے مستعفی ہو کر مہاراجا مان سنگھ والیِ اودھیا کی ملازمت کر لی۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے، عرشی تخلص تھا۔ کلام پر قاضی محمد صادق خان اختر (مصنّف تذکرہ آفتابِ عالمتاب) سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا بعمر ۸۰ سال ۱۸۹۵ء بعارضۂ فالج انتقال ہوا۔

مرزا محمد عسکری ۱۸۶۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کی بہت منّتوں کے بعد والد کی کبرسنی میں ولادت ہوئی تھی، اس لیے اللہ آمین کرتے بڑے لاڈ چاؤ سے پرورش ہوئی۔ اور اسی باعث تعلیم بھی دیر سے شروع ہوئی۔ پہلے نج کا انتظام کیا گیا۔ ۱۸۸۱ء میں پہلی مرتبہ کیننگ اسکول (لکھنؤ) کے چھٹے درجے میں داخل ہوئے۔ تعلیم کا زمانہ بہت کامیاب رہا۔ اچھے نتائج کے سبب وظائف کے حقدار ٹھہرے۔ بالآخر ۱۸۹۱ء میں بی، اے کی سند حاصل کی اور اسی سال رفاہِ عام اسکول میں سیکنڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔ یہ اسکول راجا سر محمد امیر حسن خان بہادر والیِ محمود آباد نے اپنے ذاتی خرچ

سے قائم کیا تھا۔ میرزا محمد عسکری اس اسکول میں ڈیڑھ سال تک ملازم رہے اور پھر کاکوری تعلقدار اسکول میں سیکنڈ ماسٹر ہوکر چلے گئے۔ تنخواہ میں ترقی ہوئی، سو روپے ماہانہ پانے لگے۔ اور ماحول بھی پہلے سے بہتر ہوگیا۔ یہ زمانہ بہت اطمینان اور عافیت سے بسر ہوا۔ یہاں کے دس سالہ قیام (۱۸۹۲ - ۱۹۰۲ء) میں مالی فراغت نصیب ہوئی۔ اسکول کے پرنسپل سنڈرسن نہ صرف ان کے کام سے خوش تھے، بلکہ ان کے مداح اور ان کی ترقی و بہبود کے خواہاں بن گئے۔

۱۹۰۲ء کے اواخر میں حکومتِ ہند کے محکمۂ وضع قوانین (لیجیسلیٹو ڈپارٹمنٹ) میں مترجم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس میں پرنسپل سنڈرسن کی سفارش کو دخل تھا۔ اس سلسلے میں وہ بیس برس تک وہاں کلکتہ میں مقیم رہے۔ ۱۹۱۹ء میں مہاراجا محمود آباد نے حکومتِ ہند سے تین برس کے لیے ان کی خدمات مستعار لیں اور وہ پانسو مشاہرہ پر ان کے پرائیوٹ سکرٹری مقرر ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ ملازمت صرف حاضر باشی تھی، کام دام یا ذمہ داری کچھ نہ تھی۔ اسی سے ان کا دل نہیں لگا، اور وہ میعاد ختم ہونے پر مہاراجا کے اصرار کے باوجود کلکتہ واپس چلے گئے۔ تین برس بعد (۵۵ برس کی عمر میں) ۱۹۲۵ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اب انھوں نے لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

۱۹۲۶ء میں بعض دوستوں کی فرمایش پر انھوں نے رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب (ہسٹری آف اردو لٹریچر) کا اردو ترجمہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں نولکشور پریس لکھنؤ میں سپرنٹنڈنٹ بھی مقرر ہو گئے۔ ان کا یہ ترجمہ "تاریخ ادب اردو" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ترجمے کا اصلی انگریزی کتاب سے بہت کم تعلق ہے، یہ بالکل نئی کتاب ہے۔ اس میں انھوں نے اتنے

اضافے کیے ہیں کہ یہ ان کی اپنی تالیف بن گئی ہے۔

ان کی دوسری مشہور کتاب "ادبی خطوطِ غالب" ہے جو مختلف امتحانوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ ان کی بیشتر کتابیں غیر مطبوعہ رہ گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے مدت العمر کے مخلصانہ تعلقات تھے ان کی پہلی ملاقات ان کے قیامِ کلکتہ کے دوران میں ہوئی، جب وہ ۱۹۰۲ء میں کلکتہ گئے ہیں۔ بمرورِ زمانہ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کے قدرشناس اور قدرداں ہو گئے۔

۱۵ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

(مِن کیتیم، آبِ حیات: دیباچۂ کلیاتِ انشا)

۲۲۔ (الف) محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ:

اپنے زمانے کے مشہور اور ممتاز اہلِ حدیث عالم اور مناظر تھے۔ انھوں نے اپنی تفسیر "واضح البیان" میں ترجمان القرآن (جلد اول: تفسیر سورۂ فاتحہ) پر اعتراض کیا تھا کہ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے نزدیک ایمان بالرسولؐ ضروری نہیں، ایمان باللہ اور عملِ صالح کفایت کرتا ہے۔ جب یہ اعتراض مولانا غلام رسول مہر نے مولانا آزاد کو لکھ بھیجا، تو مولانا موصوف نے یہ مفصّل جواب لکھا۔

مولانا محمد ابراہیم میر کا ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو سیالکوٹ میں انتقال ہوا۔ وہیں دفن ہوئے۔

۲۳۔ النحل، ۱۶: ۳۶ اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ہر امّت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا، (تاکہ وہ اعلان کرے کہ) اللہ کی بندگی کرو۔

۲۴۔ یہاں کاتب سے سہو ہوا ہے۔ فاعبدونِ کی جگہ فاعبدوہ لکھ گیا (الانبیا، ۲۱ : ۲۵) اسی لیے متن درست کر دیا گیا ہے (اور اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا، جس پر اس بات کی وحی ہم نے نہ بھیجی ہو کہ "کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف میری ذات۔ پس چاہیے کہ میری ہی بندگی کرو)

۲۵۔ البقرہ، ۲: ۱۱۱۔ ۱۱۲ اور یہودی کہتے ہیں: جنت میں کوئی آدمی داخل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں۔(اے پیغمبر!) یہ ان لوگوں کی جاہلانہ امنگیں اور آرزوئیں ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر تم اپنے زعم میں سچے ہو، تو ثابت کرو۔ ہاں! وہ کسی گروہ بندی کی راہ نہیں ہو سکتی، وہ ایمان و عمل کی راہ ہے۔ جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا، تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائیگا۔ نہ تو اس کے لیے کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غمگینی۔)

۲۶۔ المومنون، ۲۳ : ۲۳ (اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف (ہدایت کے لیے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا تھا: بھائیو! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں)

۲۷۔ اشارہ ہے آیتِ قرآنی کی طرف:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (المائدہ، ۵ : ۳) (آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی، اور تمھارے لیے دین "الاسلام" پسند کیا)

۲۸۔ اشارہ ہے نظامی بدایونی (صاحب ذوالقرنین) کی طرف جنھوں نے دیوانِ غالب، بہت عمدہ کتابت و طباعت سے پہلی بار شائع کیا تھا۔

۲۹۔ یہاں مولانا آزاد نہیں، بلکہ خود غلام رسول مہر کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

بیشک ان کا پورا نام سعید الدین احمد خان ہی تھا۔ لیکن اس خاندان کے متعدد حضرات کے ناموں میں لفظ "احمد" کا اضافہ دراصل نواب احمد بخش خان بانیٔ ریاست سے نسبت کے اظہار کے لیے تھا، ورنہ نام صرف امین الدین خان، ضیاء الدین خان، علاء الدین خان وغیرہ ہی تھے۔ غالب نے بھی اپنے خطوں میں بیشتر یہی نام لکھے ہیں۔

نواب سعید الدین احمد خان کو ان کے خاندان کے لوگ اور احباب بھی احمد سعید خان کے نام ہی سے خطاب کرتے تھے۔ مثلاً لالہ سری رام (مؤلف خمخانۂ جاوید) کے ان سے خاندانی تعلقات تھے۔ وہ اپنے تذکرے میں ان کے حالات یوں شروع کرتے ہیں: نواب میرزا سعید الدین احمد خان معروف بہ نواب احمد سعید خان دہلوی (۵: ۲۱۲)

پس، مولانا ابو الکلام آزاد نے ٹھیک ہی لکھا تھا؛ ان سے سہو نہیں ہوا۔

مختار نامہ POWER OF ATTORNEY

ملک نصر اللہ خان عزیز:

۱۸ فروری ۱۸۹۷ء کو گوجرانوالہ (پنجاب پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ بی اے کی سند پانے کے بعد چندے ایک اسکول میں مدرس رہے۔ لیکن ان کا رجحان صحافت کی طرف تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں اپنے زمانے کے مشہور ہفتہ وار مدینہ (بجنور) کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے نمک سازی کی تحریک شروع کر دی اور ڈانڈی کوچ کر دیا۔ مدینہ میں آپ تحریک کی تائید میں مضامین شائع ہوئے، جو حکومت کی نظر میں قابلِ اعتراض ٹھہرے۔ مقدمہ چلا اور عزیز صاحب کو سال بھر کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں وہ "مدینہ" چھوڑ کر پھر لاہور پہنچے، تو مولانا ظفر علی خان نے

انھیں زمیندار کے ادارۂ تحریر میں شامل کر لیا۔ سال بھر بعد انھوں نے زمیندار کی ملازمت ترک کر دی اور اپنا ذاتی ہفتہ وار "پاسبان" جاری کیا۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث یہ تجربہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے بعد وہ کوئی دو برس تک ہفت روزہ "زمزم" کے مدیر رہے۔ اسے چھوڑ کر انھوں نے پھر ذاتی ہفت روزہ 'مسلمان' اور 'کوثر'، جاری کیے، لیکن کوئی پرچہ بھی زیادہ دن نہ چل سکا۔

تقسیم ملک کے بعد انھوں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور جماعت اسلامی کے روزنامہ 'تسنیم' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۵۵ء تک برقرار رہے۔ اس دوران میں ایک بار ۱۹۵۳ء میں سال بھر کے لیے جیل میں بھی رہے۔

شعر بھی کہتے تھے۔ دو مجموعے "تیر و نشتر" اور "کاروانِ شوق" ان کی زندگی میں شائع ہوئے تھے۔ جمعہ، ۲ جولائی ۱۹۷۶ء کو جاں بحق ہوئے اور لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک ہوئے

(تذکرۂ معاصرین، ۴: ۸۰ - ۸۴)

۳۲۔ مولانا مظہر الدین شیر کوٹی:

مشہور عالمِ دین اور صحافی۔ مدتوں 'وحدت' اور روزنامہ 'الامان' کے مدیر رہے۔ ۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو دلی میں قتل ہوئے۔

۳۳۔ میرزا شجاع الدین احمد خان تاباں:

نواب ضیاء الدین احمد خان نیّرِ رخشاں کے پوتے اور میرزا شہاب الدین احمد خان

ثاقب کے بڑے بیٹے ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں خاصی دستگاہ تھی۔ کلام پر پہلے حسین علی خان شاداں سے، پھر داغ سے اصلاح لی۔ شطرنج کا بھی چسکا تھا۔ ان کا نکاح باقر علی خان کامل کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم (عرف چندو بیگم و میرزا جیون بیگ (وفات: ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء بعمر ۸۹ برس) سے ہوا تھا۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ بڑے قادر الکلام اور زود گو تھے۔ افسوس، دیوان نہیں چھپا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۲۸ء کو انتقال ہوا۔ مہرولی (دلّی) میں صندل خانہ میرزا بابر میں مدفون ہیں (خمخانۂ جاوید ۲: ۱۹-۲۰) - تذکرۂ ماہ و سال (قلمی)؛ کشکول: ۳۳)

۔ غالب کا مصرع ہے (کلیاتِ غالب (فارسی): ۲۶۳) پورا شعر ہے:

وداع و وصل جدا گانہ لذّتے دارد

ہزار بار برو، صد ہزار بار بیا

مولوی محمد علی:

جماعت احمدیہ کی لاہوری شاخ کے امیر۔ متعدد دینی کتابوں کے مصنف۔ ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن مستند اور مشہور ہے۔ چار جلدوں میں "بیان القرآن" کے عنوان سے اردو میں تفسیر بھی لکھی تھی، چھپ چکی ہے۔ بروز ہفتہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء بعمر ۷۶ سال کراچی میں انتقال کیا۔ لاش لاہور آئی اور یہیں دفن ہوئے۔ (کشکول (قلمی) ۱: ۳۴)

القرآن، البقرہ ۲: ۲۶۰ (یقین کیوں نہ ہو، لیکن یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میرے قلب کو اطمینان ہو جائے) یہ وہ مقام ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے یہ کہنے پر کہ "میرے رب، دکھا مجھے کہ تو مُردوں کو کیونکر

جلاتا ہے، ان سے پوچھا کہ کیا تمھیں اس بات پر یقین نہیں ہے، تو حضرت ابراہیم نے جواب میں کہا: "کیوں نہیں، میں محض اطمینانِ قلب کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔"

۳۷۔ مثلاً آل عمران، ۳: ۱۵۴؛ المائدہ، ۵: ۵۰؛ الاحزاب ۳۳: ۳۳؛ الفتح ۴۸: ۲۶۔

۳۸۔ سورۃ الجمعہ، ۶۲: ۲ (جس نے ناخواندہ لوگوں میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا)۔

۳۹۔ بخاری (کتاب الاجارہ) (تمھاری اور دونوں اہل کتاب گروہوں کی مثال وہی ہے کہ کسی نے (مزدوروں کو) اجرت پر مقرر کیا؛ اور کہا کہ جو (شخص) صبح سے دوپہر تک کام کریگا، اسے ایک قیراط مزدوری ملیگی

۴۰۔ بخاری (کتاب الجمعہ۔ باب الجمعہ) ہم بعد میں آنے کے باوجود پہلے آنے والوں کے برابر ہیں، حالانکہ کتاب انھیں پہلے دی گئی اور ہمیں بعد کو دی گئی۔)

۴۱۔ کلیات غالب (فارسی): ۵۲۲

۴۲۔ مرزا حیرت

امراؤ مرزا حیرت دہلوی بیسویں صدی کے رُبع اوّل کی ایک ہنگامہ خیز شخصیت تھے۔ عالمِ دین، مصنّف، صحافی، سیرت نگار، مورّخ اور کیا کیا! افسوس کہ طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا، ورنہ بڑی صلاحیتوں کے آدمی تھے۔ ساری عمر چومکھی لڑتے رہے۔ ہفتہ وار "کرزن گزٹ" جاری کیا۔ قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔ تاریخ میں ان کی کتاب "چراغِ دہلی" ابھی پچھلے دنوں دوبارہ دلّی اردو اکاڈیمی نے شائع کی ہے۔ مولانا آزاد کا اشارہ اسی کتاب کی طرف ہے۔ ان کی کتابیں اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔

۴۳۔ معلوم نہیں، کس کا مصرع ہے۔

۴۴۔ دیوانِ حافظ شیرازی: ۵۴۔ پورا شعر ہے:

حاصلِ کارگہِ کون و مکاں این ہمہ نیست   بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں این ہمہ نیست

۴۵ دیکھیے، سورۂ مریم، ۱۹: ۲۴

۴۶ دیکھیے، سورۂ مریم، ۱۹: ۲۹

۴۷ ننھّے نواب:

غالب والے معتمد الدّولہ آغا میر (سیّد محمد خان بہادر) کے سب سے چھوٹے صاحبزادے محمد علی خاں نام رجب ۱۲۴۷ھ (دسمبر ۱۸۳۱ء) میں کانپور میں پیدا ہوئے، جہاں معتمد الدّولہ لکھنؤ سے جلاوطنی کے بعد بس گئے تھے۔ یہ بمشکل پانچ مہینے کے ہونگے کہ معتمد الدولہ کا انتقال ہو گیا (۷ مئی ۱۸۳۲ء) اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی نواب امین الدّولہ سیّد آغا علی خاں کی سرپرستی میں ہوئی۔ چونکہ سب سے چھوٹے تھے، اس لیے لاڈ چاؤ میں گھر میں سب لوگ انھیں ننھّے نواب کے نام سے پکارتے تھے۔ اور یہی ان کا مستقل لقب بن گیا۔

انھوں نے غدر (۱۸۵۷ء) میں انگریزوں کی مدد کی، اور بعض انگریزوں کو پناہ دی تھی۔ اس سے دیسی فوج نے انھیں بہت پریشان کیا۔ بارے، جان بچ گئی۔ آخری عمر میں عتباتِ عالیہ کی زیارت کے لیے عراق چلے گئے، اور پھر کربلا میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ وہیں کربلا میں ۱۳ رجون ۱۸۷۰ء (۱۳ ربیع الاول ۱۲۸۷ھ) کو انتقال کیا۔

شعر بھی کہتے تھے؛ شمسؔ تخلص تھا۔ مشورۂ سخن آتشؔ کے مشہور شاگرد میر دوست علی خلیلؔ سے کرتے تھے۔ مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ مختلف تذکروں میں چند غزلیں ملتی ہیں (معتمد الدولہ آغا میر (ڈاکٹر انصار اللہ): ۲۲۷۔۲۳۳)

۴۸ دیکھیے سورۂ مریم، ۱۹: ۱۶

۴۹ دیکھیے سورۂ مریم، ۱۹: ۲۲

۵۰۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی:

مولانا عبدالرحیم العمری کے صاحبزادے، آخری دور کے مشہور فاضل یکشنبہ ۱۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۲۱ فروری ۱۷۰۳ء) دلّی میں پیدا ہوئے (عظیم الدین تاریخ نام)۔ انھوں نے پہلی مرتبہ قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ ہندستان میں علم حدیث کی ترویج کا سہرہ ان کے سر ہے، متعدد بلند پایہ فارسی و عربی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے بعض کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے۔ ہفتہ کے دن ۳۰ محرم ۱۱۷۶ھ (۲۱ اگست ۱۷۶۲ء) کو دلّی میں انتقال کیا۔ دلّی دروازہ کے باہر قبرستان مہندیان میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ (نزھتہ الخواطر، ۶: ۴۰۶)۔

۵۱۔ مولانا روم کی رباعی کا دوسرا شعر ہے۔ اصل میں مصرع اولیٰ میں 'فرخندہ' کی جگہ 'جاوید'، اور 'حکایت کنم' کی جگہ 'غمے بگویم' ہے۔ پوری رباعی ہے:

اے در دلِ ہر کسے ز مہرت تابے   وے از تو تضرّعے بہر محرابے
جاوید شبے باید و خوش مہتابے   تا با تو غمے بگویم از ہر بابے

(غزلیاتِ شمس تبریز، ۱۴۴۷)

۵۲۔ القرآن، الاعراف ۷: ۷۱۔ اَتُجَادِلُوْنَنِیْ فِیْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ (کیا تم مجھ سے جھگڑتے ہو ایسے ناموں کے بارے میں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔)

۵۳۔ مولانا عبداللہ گاندھی:

مہاتما گاندھی کے چار بیٹوں (ہری لال، منی لال، رام داس، دیوداس) میں سب سے بڑے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے قریب انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا نام عبداللہ رکھا گیا تھا۔ اس پر بہت خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے ہوئے، جلوس نکالے گئے۔ مولانا آزاد کا اسی طرف اشارہ ہے۔ دو تین برس بعد وہ پھر ہندو ہو گئے۔ وسطِ ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کے قتل کے پانچ ماہ بعد بعارضۂ تپ دق بڑی عسرت میں انتقال ہوا۔

۵۴۔ (صاحبزادہ) سر عبدالقیوم (خان بہادر، نواب (۱۹۱۵ء) کے سی آئی ای (۱۹۱۷ء) ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ ساری عمر حکومتِ ہند کی ملازمت میں گزاری اور بہت اہم اور اعلیٰ عہدوں پر تعینات رہے۔ ۱۹۱۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوتے پر انگریزوں نے انھیں استعمال کرنا شروع کیا۔ مرکزی مجلسِ واضع قوانین کے رُکن نامزد ہوئے۔ گول میز کانفرنس، لندن میں مسلمانوں کی نمایندگی کی۔ پھر فرنیٹر حکومت میں وزیر بنا دیے گئے اور بالآخر وہیں وزیرِ اعلیٰ مقرر ہوئے۔

سیاست میں مسلم لیگ کے حامی تھے اور فرنیٹر میں اس کے نظریے کے نمایندہ۔ متن میں مولانا آزاد نے جس حکم کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ انھیں کی وزارت کے زمانے میں جاری ہوا تھا۔

۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو پشاور میں انتقال ہوا۔

۵۵۔ ڈاکٹر خان صاحب:

بہت کم لوگ ان کے اصلی نام سے واقف ہیں؛ یہ عبدالجبار خان تھا۔ وہ فرنیٹر گاندھی خان عبدالغفار خان سے تقریباً سات برس بڑے بھائی تھے۔ ان کے والد خان بہرام خان محمدزئی قبیلے کے بہت بڑے زمیندار اور اپنے گانوء عثمان زئی کے رئیس تھے۔ ان کا ۹۵ برس کی عمر میں ۱۹۲۵ء میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر خان صاحب ۱۸۸۳ء میں عثمان زئی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد میڈیکل کالج بمبئی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں تعلیم جاری تھی کہ اسے ترک کرکے ۱۹۰۹ء میں ولایت چلے گئے۔ ان کے قیام انگلستان کے دوران ہی میں پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) شروع ہوگئی۔ ڈاکٹر خان صاحب بھی بطور ڈاکٹر اس میں شامل ہو گئے اور کافی دن تک فرانس میں کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۰ء میں ہندستان واپس آئے، اور حکومت نے آئی۔ ایم۔ ایس (انڈین میڈیکل سروس) میں بھرتی کر لیا۔

انھیں ایام میں انگریزی حکومت نے ۱۹۲۱ء میں فرنیٹر کے وزیری قبیلے کے خلاف مہم

بھیجنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹر خان صاحب کو اس مہم کے ساتھ وزیرستان جانے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنے لوگوں کے خلاف کارروائی میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور ملازمت سے مستعفیٰ ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ملک کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ کانگریس کے تمام صفِ اوّل کے لیڈروں سے ان کے بے تکلفانہ اور دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ ملک کی کامل آزادی کے مؤید اور اپنے بھائی بادشاہ خان کی طرح سے اس کی تقسیم کے سخت مخالف تھے۔ لیکن ان کی ایک نہ چلی اور ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ آزادی کے وقت (۱۹۴۷ء میں) وہ فرنٹیر حکومت میں وزیر اعلیٰ تھے۔ پاکستان کی تشکیل کے بعد ہفتے بھر کے اندر مسٹر جناح نے ان کی وزارت منسوخ کر دی اور دونوں خان بھائی جیل بھیج دیے گئے، جہاں وہ چھ برس رہے۔

اب حالات سے آنکھیں بند کر لینے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر خان صاحب نے اصحابِ مجاز سے سمجھوتا کر لیا۔ ۱۹۵۴ء میں وہ پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیرِ مواصلات مقرر ہوئے اور سال بھر بعد وزیرِ اعظم بنا دیے گئے۔ ۹ مئی ۱۹۵۸ء کو انھیں ایک شخص عطا محمد نامی نے لاہور میں قتل کر دیا (فرنٹیر سپیکس (انگریزی) مصنفہ محمد یونس)؛ دو خدائی خدمت گار (انگریزی) از ڈیوڈ ڈیسائی)؛ بادشاہ (باچا) خان از فارغ بخاری)

۵۵ (ل) علی حزیں کا مصرع ہے (کلیات : ۴۵۴) پورا شعر ہے :

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی

گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد

۵۶۔ گوپی چند بھارگو :

۱۸۸۹ء میں سرسہ (ضلع حصار۔ ہریانہ) کے ایک متوسط برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج، لاہور سے ایم۔ بی۔ بی ایس کی سند لے کر ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کیا۔ ان دنوں لاہور میں ڈاکٹر نہال چند سیکری کانگریس کے بہت بڑے

مدّاح اور کارکن تھے۔ ان کے زیرِ اثر گوپی چند بھارگو بھی سیاست میں داخل ہو گئے۔ اپریل ۱۹۱۹ء کے جلیاں والا باغ کے سانحے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور وہ عملی سیاست میں سرگرم حصّہ لینے لگے۔ اس کے بعد کئی مرتبہ قید و بند کا تجربہ بھی ہوا۔

انھوں نے کانگریس کے تعمیری کاموں میں بہت نمایاں حصّہ لیا، خاص کر کھادی اور تعلیم اور اچھوت ادھار کے شعبوں میں۔ ملک کی آزادی کے بعد کچھ دن پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بھی رہے۔

۲۶ دسمبر ۱۹۶۶ء کو انتقال ہوا۔

DNB ۶ کشکول (۱): ۹۹)

۵۷۔ ڈاکٹر شیخ محمد عالم:

۱۸۸۷ء میں سرگودھا (پاکستان) کے ایک متموّل گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد وہاں کے مشہور اور کامیاب وکیل تھے۔ شیخ محمد عالم کی تعلیم زیادہ تر ولایت میں ہوئی۔ آکسفرڈ سے بی اے اور ڈبلن سے ایل ایل ڈی کی اسناد حاصل کیں اور بیرسٹر بن کر وطن واپس آئے اور یہاں لاہور میں وکالت کرنے لگے۔ لیکن جب انڈین نیشنل کانگریس نے ترکِ موالات کی تحریک شروع کی، تو ۱۹۲۱ء میں اسے ترک کر دیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے روزنامہ تریاق جاری کیا جس کے ذریعے سے اپنے خیالات کا پرچار کرنا مقصود تھا۔ مولانا آزاد کا غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد ساری عمر ملکی سیاست میں گزری۔ آدمی قابل تھے، لیکن زندگی اور خیالات میں توازن اور استقلال کے فقدان کے باعث کسی میدان میں بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

۵۸۔ موتی لال نہرو:

۶ مئی ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں کشمیر سے ہجرت کر کے دلّی آ گئے

تھے۔ اس زمانے میں یہاں چاندنی چوک میں نہر بہتی تھی۔ چونکہ اس خاندان کے سکونتی مکانات نہر کے کنارے کنارے تھے، اس لیے لوگ انھیں نہرو کہنے لگے۔

موتی لال نہرو کے دادا لکشمن نرائن انگریزوں کی طرف سے مغل دربار میں وکیل تھے۔ اور والد گنگا دھر، ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانے میں دلّی میں پولیس اہلکار تھے۔ جب انگریزوں نے شہر فتح کرلیا اور یہاں لوٹ مار شروع کی، تو وہ بیوی بچّوں کو لے کر آگرے چلے گئے۔ چار سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ موتی لال نہرو والد کی وفات کے تین مہینے بعد پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن اپنے بڑے بھائی نند لال کے پاس کھیتڑی ریاست میں گزرا، جہاں وہ دیوان کے عہدے پر فائز تھے۔ نند لال کچھ مدّت بعد الٰہ آباد منتقل ہوگئے اور یوں سارا خاندان جا کے وہاں بس گیا۔

موتی لال نہرو کا تعلیمی زمانہ قابلِ لحاظ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بی اے پاس نہیں کرسکے تھے، اس لیے انھوں نے وکالت کا امتحان دے کر کانپور میں کام شروع کردیا۔ لیکن جلد ہی وہاں سے بڑے بھائی نند لال کے پاس الٰہ آباد چلے گئے۔ بدقسمتی سے اچانک اپریل ۱۸۸۷ء میں نند لال کا انتقال ہوگیا۔ ان کا کنبہ بڑا تھا؛ اب اس کی ذمّہ داری موتی لال کے سر پر آپڑی، جو انھوں نے مردانہ وار نبھائی۔ اس تمام دوران میں موتی لال نہرو کا ملکی سیاست کی طرف رویہ بہت حد تک بے نیازانہ غیر دلچسپی اور ایک تماشائی کا سا رہا۔ ان کی تمام تر توجّہ اپنے خاندان اور پیشے پر مرکوز تھی۔ لیکن تا بکے۔ جب ۱۹۱۲ء میں ان کے بیٹے پنڈت جواہر لال نہرو بیرسٹر بن کر ولایت سے واپس آئے اور ملکی سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگے، تو اب موتی لال نہرو بھی بےتعلّق نہ رہ سکے اور بالآخر کھنچے کھنچے منجدھار میں پہنچ گئے۔

اس کے بعد پنڈت موتی لال نہرو زینہ بزینہ سیاست میں چوٹی تک پہنچے یہاں تک کہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں وہ کانگریس کے امرتسر اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ملک

کے لیے ان کی خدمات ہماری تاریخ کا درخشاں باب ہے۔

ان کا ۶ فروری ۱۹۳۱ء کو انتقال ہوا۔

THE NEHRUS: B.R. NANDA

۵۹ پنڈت مدن موہن مالویہ:

۲۵ دسمبر ۱۸۶۱ء کو الہ آباد میں سری گوڑ برہمنوں کی چتر ویدی شاخ کے ایک عالم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں میں سے کوئی پندرھویں صدی کے وسط میں مالوہ سے نقل مکان کرکے الہ آباد آگیا تھا، جس سے خاندان کا عرف مالویہ ہوگیا۔ ان کے والد پنڈت برج ناتھ سنسکرت کے فاضل اور رامائن اور بھاگوت کے عالم تھے۔ مختلف ریاستوں (ریوا، دربھنگا، بنارس وغیرہ) کے حکمران انھیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے اور مدتوں ان کی ہر طرح کی خدمت کرتے رہے۔ یہی گھر کی بسر اوقات کا واحد ذریعہ تھا۔

گھر کی مالی حالت تسلی بخش نہیں تھی اور کنبہ بڑا تھا (دو بیٹیاں اور چھ بیٹے)۔ اس لیے ان کی تعلیم کا مناسب انتظام نہ ہوسکا۔ اس کے باوجود مدن موہن مالویہ نے اپنی والدہ کی دور اندیشی اور قربانی کے صدقے ۱۸۸۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی کا بی اے پاس کرلیا۔ اگرچہ ان کی دلی خواہش تھی کہ ایم اے کی سند حاصل کرلیں، لیکن حالات موافق نہیں تھے، لہٰذا انھیں مدرسی پر قناعت کرنا پڑی۔

۱۸۸۶ء میں کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں شریک ہوئے اور یہاں انھوں نے ایسی زوردار تقریر کی کہ سب ان کا لوہا مان گئے۔ کلکتہ سے واپس آئے تو دو سو کے مشاہرے پر ہفتہ وار ہندی "ہندستان" کی ایڈیٹری کی پیشکش ہوئی، جو انھوں نے قبول کرلی۔ اس کے بعد مدتوں مختلف انگریزی اور ہندی پرچوں سے وابستہ رہے۔

انھوں نے ۱۸۹۱ء میں وکالت کی سند حاصل کرلی۔ اس کے بعد وہ ملک کی سیاسی تحریک میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ ان کی اصلی دلچسپی ملک کی خدمت اور خاص کر اس کی تعلیمی اور

صنعتی ترقی میں تھی۔ الٰہ آباد میونسپلی کمیٹی کی نائب صدارت کے زمانے میں ان کی خدمات اتنی قابلِ قدر تھیں کہ ۱۹۰۲ء میں انھیں صوبائی مجلسِ واضعِ قوانین کا رکن منتخب کر لیا گیا اور ۱۹۰۹ء میں مرکزی مجلس کا۔ ہر جگہ ان کی رائے اور خیالات کو احترام اور غور سے سنا گیا۔

تعلیم کے میدان میں بنارس ہندو یونیورسٹی ان کا ملک کو بے بہا اور عظیم الشان تحفہ ہے، جس کا سنگِ بنیاد وایسرائے لارڈ ہارڈنگ نے ۴ فروری ۱۹۱۶ء کو رکھا اور افتتاح ۱۳ دسمبر ۱۹۲۱ء کو شہزادہ ویلز (ڈیوک آف ونڈسر) نے کیا۔

وہ دو مرتبہ کانگریس کے صدر چنے گئے: ۱۹۰۹ء (لاہور) اور ۱۹۱۸ء (دلّی) میں۔

۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔

۶۰۔ حافظ شیرازی کا مصرع ہے (دیوان حافظ شیرازی: ۸) پورا شعر ہے

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بیخبر ز لذّتِ شُربِ مدامِ ما

۶۱۔ ڈاکٹر ستیہ پال:

۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء میں وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ، پاکستان) کے ایک متوسط کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ڈاکٹری کی سند لے کر (۱۹۰۸ء) امرتسر میں پریکٹس شروع کی۔ اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں پنجاب ہماری قومی سیاسی زندگی میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور امرتسر اور لاہور اس کے مرکز تھے۔ رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مارشل لا وغیرہ نے ہر طرف ایک آگ سی لگا رکھی تھی۔ ڈاکٹر ستیہ پال نے ان سب تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور قید و بند کی سختیوں کا جرأت سے مقابلہ کیا۔ وہ اپنے زمانے کے مقبول اور ہردلعزیز عوامی لیڈر تھے۔

۱۸ اپریل ۱۹۵۴ء کو چنڈی گڑھ میں انتقال ہوا ۔

(کشکول (۱) : ۳۳) DNB

۶۲ - میاں عبدالعزیز :

یہ مجلسِ واضعِ قوانین کے انتخاب کا قصّہ ہے ۔

خالد لطیف گابا (کنھیا لال گابا) مرکزی اسمبلی کے رُکن تھے ۔ آدمی تھے ہوشیار اور جاہ پسند لیکن دِلّی مجلس میں ان سے ایک سے ایک بڑھ کر تھا، اور پھر بعض ذاتی "خوبیوں" کے باعث وہاں ان کی دال گلنے والی نہیں تھی ۔ لہٰذا انھوں نے وہاں سے استعفیٰ دے دیا، اور پنجاب کی سیاسیات میں حصّہ لینے لگے ۔

دِلّی میں جو جگہ خالی ہوئی تھی، اس کے لیے مولانا ظفر علی خان بطور امیدوار کھڑے ہو گئے ۔ ان کے مقابلے میں ایک صاحب میاں عبدالعزیز میدان میں آئے (مولانا آزاد کے خط میں انھیں کی طرف اشارہ ہے)۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ در پردہ انھیں کانگریس کی حمایت حاصل تھی۔ فحوائے کلام سے قیاس ہوتا ہے کہ مہر نے مولانا کو لکھا تھا کہ کانگریس میاں عبدالعزیز کی حمایت نہ کرے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ انتخاب میں کوئی کامیاب ہو جائے ظفر علی خان یا عبدالعزیز ـــــ اس سے انگریزوں کی پالیسی پر کوئی اثر نہیں پڑنے والا۔ لہٰذا ان باتوں کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہیے ۔

یہ میاں عبدالعزیز خاصے متموّل آدمی تھے ۔ ان کے والد خان بہادر چراغ دین عمر بھر ریلوے میں ملازم رہے ۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ٹھیکیداری کرنے لگے ۔ میاں عبدالعزیز کی پشت پر غالباً یونینسٹ (یا احرار) پارٹی تھی، جو ظفر علی خان کے اثر و رسوخ سے جلتی تھی ۔ عبدالعزیز بعد کو بعض اکابر کے کہنے سننے سے انتخاب سے دستبردار ہو گئے اور ظفر علی خان بلا مقابلہ اسمبلی کے رکن بن گئے ۔

(دیکھیے، اقبال کے آخری دو سال : ۴۲۳ - ۴۲۵)

۶۳۔ گابا، کے، ایل:

۱۹۳۳ء میں اسلام قبول کرنے سے پہلے نام کنھیالال گابا تھا۔ اس کے بعد اسلامی نام انھیں پہلے حرفوں کی مناسبت سے خالد لطیف گابا رکھ لیا۔
شاہدرہ (لاہور) میں ۲۵ اگست ۱۸۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ہندستان اور ولایت میں ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں بیرسٹری کی سند لے کر واپس آئے، اور لاہور میں وکالت شروع کر دی۔
ساری عمر متنازعہ فیہ مسائل میں گزری۔ انگریزی کے اچھے لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔
تقریباً ایک درجن کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے کام کرتے رہے۔
۲۸ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دلّی میں انتقال ہوا۔ (خود نوشت (انگریزی) سوانحعمری)

۶۴۔ جانے، یہ ضرب المثل مصرع کس کا ہے!

۶۵۔ MEMOIRS OF HYDER ALI AND HIS SON: CHARLES STEWART

A REVIEW OF THE ORIGIN AND CONDUCT OF THE WAR WITH TIPU: COL BATESON

AUTHENTIC MEMOIRS OF TIPU: AN OFFICER IN THE EAST INDIA COMPANY'S SERVICE

۶۶۔ ملکۂ فرانس، لوئی شانزدہم شاہِ فرانس کی ملکہ MARIE ANTOINETTE

۶۷۔ ضمیری اصفہانی کا مصرع ہے (بہترین اشعار: ۳۱۲) پورا شعر ہے

علاجِ درد ضمیری نشد، نمی دانم
کہ گفتہ است کہ دردش دوا پذیر مباد

۶۸۔ غالب کا شعر ہے (کلیات غالب (فارسی): ۳۰۸)

۶۹۔ غالب کا مصرع ہے (کلیات: ۲۳۴) مصرع اولیٰ ہے: امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نباشی

۷۰۔ نور محمد انور لاہوری کا مصرع ہے (میخانہ: ۵۶۳؛ روز روشن: ۸۰)
پورا شعر ہے: دریں حدیقہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است

۷۱۔ کلیاتِ غالب (فارسی): ۴۹۴

۷۲۔ سعدی کا مصرع ہے (کلیاتِ سعدی: ۳۷۳) پورا شعر ہے:
بخشم رفتہ؛ زمارا کہ می بَرَد پیغام
بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

۷۳۔ دیوان نظیری نیشا پوری: ۳۰۸

۷۴۔ (ترجمہ) جو میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ہاتھ بھر بڑھتا ہوں (متفق علیہ) یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے۔ بخاری اور مسلم کے علاوہ سننِ ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی موجود ہے۔

۷۵۔ غالب کا مصرع ہے (کلیات غالب (فارسی): ۳۶۳) پورا شعر ہے:
وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد
ہزار بار بِرَو، صد ہزار بار بیا

۷۶۔ یہ بھی غالب کا مصرع ہے (کلیات: ۴۹۴) اس فرق کے ساتھ کہ اصل میں 'بُود' کی جگہ 'است' ہے اور مصرع ثانی میں عاطفہ بھی ہے۔ پورا شعر ہے:
پشت بر کوہست تکیہ گاہ بر رحمت
مشکل است وما بر خویش آساں کردہ ایم

۷۷۔ القرآن، سورۂ ص، ۳۸: ۸۸ (اور تھوڑے دن بعد تمہیں اس کا حال معلوم ہوجائیگا)

۷۸۔ کلیاتِ غالب (فارسی): ۴۹۴

۷۹ ۔ میر تقی میر کا مصرع ہے (کلیات (دیوان اول): ۹۴) پورا شعر ہے،

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یہاں پہلے درد تھا

۸۰ ۔ القرآن، النور ۲۴: ۱۶ (تو پاک ہے، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے)

۸۱ ۔ PUNCTUATION (یعنی رموزِ اوقاف)

۸۲ ۔ کلیات بیدل، ۴ (عنصر دوم): ۱۳۲

۸۳۔ منشی عبدالقیوم خان :

ضلع مراد آباد (یوپی) کے ایک دیہات سرکڑہ نامی میں ۲۸ نومبر ۱۸۸۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالحمید خان بلحاظ پیشہ معمولی مدرس تھے۔ گھر کی مالی حالت بھی کمزور تھی، اس لیے عبدالقیوم خان کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام نہ ہوسکا۔ گھر پر والدہ سے قرآن ناظرہ اور گلستانِ سعدی پڑھی۔ کچھ فارسی اور قدرے انگریزی میں اور رشتے داروں سے شُدبُد حاصل کی اور بالآخر مدرسے میں داخلہ لیا اور رفتہ رفتہ ۱۹۰۵ء میں آٹھویں کی سند حاصل کر لی۔ اور اسی سال ایک مدرسے میں پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ لیکن یہ تعلق عارضی ثابت ہوا۔ اس کے بعد انھیں اور دو تین جگہ بھی نوکری کرنا پڑی۔

انھوں نے کتابت کا فن باقاعدہ طور پر کسی استاد سے نہیں حاصل کیا تھا۔ ایک اخبار کے دفتر میں کلرک تھے۔ ایک دن اتفاق سے اخبار کا کاتب دفتر نہیں آیا۔ مالک نے ان سے کہا کہ آج پرچہ آپ لکھ دیں، تاکہ حرج نہ ہو۔ انھوں نے لکھ دیا۔ اور اس دن سے گویا کتابت ان کا پیشہ بن گیا۔ گاتے گاتے آدمی کلاونت ہوجاتا ہے۔ مشق اور شوق سے بتدریج ترقی کی اور رفتہ رفتہ اچھے کاتبوں میں شمار ہونے لگے۔

جب مولوی مجید حسن بجنوری نے اپنا ہفتہ وار "مدینہ" جاری کیا، تو وہ انھیں اپنے ساتھ

بجنور لِوالے گئے اور مدینہ کی کتابت ان کے سپرد کر دی۔ بجنور ہی میں تھے کہ قاضی عبد الغفار (مراد آبادی) نے ۱۹۱۸ء میں کلکتہ سے "جمہور" نکالا۔ دونوں ایک دوسرے کو ہم وطنی کے باعث پہلے سے جانتے تھے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر یہ کلکتہ چلے گئے۔ یہی زمانہ ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد رانچی میں نظر بند تھے اور فضل الدین احمد مرزا کلکتہ سے ان کی کتاب "تذکرہ" شائع کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ روایت ہے کہ "تذکرہ" کے اس پہلے ایڈیشن (۱۹۱۹ء) میں بعض ابواب اور فصول کے عنوان میں جو اشعار نستعلیق میں لکھے ملتے ہیں، ان کی کتابت منشی عبد القیوم ہی نے کی تھی۔

ترجمان القرآن (جلد اوّل) ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کی کتابت میں بہت عدم توازن تھا۔ عربی آیت کہیں ہے اور اس کا اردو ترجمہ کہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عربی متن کا کاتب اور تھا، اور اردو ترجمہ کا اور۔ نسخ کے کاتب نے عربی آیات لکھ کر اردو کاتب کے حوالے کر دیا۔ اور اس نے نیچے خالی جگہ میں اردو ترجمہ مسلسل لکھ دیا، یہ خیال کیے بغیر کہ اردو عبارت کس آیت سے متعلق ہے اور وہ کہاں ہے۔ جب کتاب چھپ کر بازار میں آئی اور منشی عبد القیوم خان کی نظر سے بھی گزری، تو انھوں نے یہ نقص محسوس کیا۔ اس پر انھوں نے مولانا آزاد کو لکھا کہ اگر دوسری جلد کی کتابت مجھے دی جائے تو انشاءاللہ یہ نقص نہیں پیدا ہوگا۔ مولانا آزاد نے یہ پیشکش قبول کر لی۔ چنانچہ ترجمان القرآن (۲) اور پھر جلد اول کا دوسرا ایڈیشن عبد القیوم خان صاحب نے لکھا۔ وہ اس سلسلے میں ڈیڑھ برس کے قریب مولانا آزاد مرحوم کے مکان ہی پر رہے۔ مولانا مرحوم انھیں خان صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ بعد کو جب ۱۹۴۵ء میں مولانا آزاد قلعہ احمد نگر کی قید سے رہا ہو کر آئے، تو غبارِ خاطر" کے پہلے ایڈیشن کی کتابت بھی منشی عبد القیوم خان ہی نے کی تھی۔ اسی کتابت کے سلسلے میں ان کی متعدد مشاہیر سے ملاقات ہوئی۔ اور ان میں سے بعض کے خطوط ان کے خاندان میں محفوظ ہیں۔ مولانا آزاد کے بھی چند خط ان کے نام ملے ہیں۔

ان کے چھ اولادیں ہوئیں: چار بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ان کے ایک بیٹے عبد الملک (جامعی)

ہجرت کر کے مستقلاً مدینہ میں جا بسے ہیں۔
دوشنبہ ۱۸ نومبر ۱۹۷۴ء (۲ ذی قعدہ ۱۳۹۴ھ) علی الصبح تہجد کے وقت مرادآباد میں رحلت
کی اور وہیں دفن ہوئے۔ (روزانہ الجمعیۃ، دلی: آزاد نمبر ۱۹۵۸ء: قومی آواز، دلی؛
۸ دسمبر ۱۹۸۲ء، مکتوب اصغر کمال (مرحوم کے پوتے)؛ مکاتیب ابوالکلام آزاد:
۳۶۱ــ۳۶۲)

۸۴ کلیم کاشانی کا شعر ہے (دیوان: ۲۲۶) مطبوعہ نسخے میں 'ازانیم' کی جگہ 'بہ آنیم' ہے۔

۸۵ عرفت ربی بفسخ العزائم (مجھے اپنے پختہ ارادوں کی ناکامی سے اپنے رب کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین ہوا) حضرت علی سے منسوب ہے۔

۸۶ موڑ اردو میں بلا اختلاف مذکر ہی مستعمل ہے۔ یہاں اشارہ غبارِ خاطر (ص ۲۷) کے اس فقرے کی طرف ہے: راہ میں کوئی 'موڑ' نہیں ملی۔

۸۷ آصف علی۔ دلی کے مشہور وکیل۔ ولادت دلی میں ہوئی اور وفات بعمر ۶۴ سال ۲ اپریل ۱۹۵۳ء کو بعارضۂ قلب برن (سوئزرلینڈ) میں، جہاں وہ ہندوستان کے سفیر تھے۔ لاش دلی گئی اور بستی حضرت نظام الدین میں، خواجہ حسن نظامی مرحوم کی خاندانی ہڑواڑ میں دفن ہوئے۔ نظم و نثر دونوں لکھتے تھے۔

۸۸ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کس کا شعر ہے۔

۸۹ دیوان نظیری نیشاپوری (ص ۱۴۵) اس کی دوسری روایت میں 'شہاں' کی جگہ 'جہاں' ہے۔

۹۰ تفصیل کے لیے دیکھیے: غبارِ خاطر (متن: ص ۵۵) اور (حواشی: ح (۴)، ص ۳۱۰)

کتابیات

ابوالکلام آزاد: ایک ہمہ گیر شخصیت، مرتبہ رشید الدین خان، دلی ۱۹۸۹ء

ابوالکلام و عبدالماجد: مرتبہ ابوسلمان شاہجہانپوری کراچی ۱۹۸۷ء

اتالیق خطوط نویسی: خواجہ حسن نظامی دہلوی دہلی ۱۹۲۹ء

اقبال کے آخری دو سال: عاشق حسین بٹالوی کراچی ۱۹۶۹ء

آپ بیتی: خواجہ حسن نظامی دہلی، ۱۹۱۹ء

آپ بیتی: عبدالماجد دریابادی لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی: مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی، دلی ۱۹۵۸ء

تاریخ صحافتِ پاکستان و ہند: عبدالسلام خورشید کاروان پریس، لاہور

تاریخ ندوۃ العلما: مولوی محمد اسحاق جلیس، دارالعلوم ندوۃ العلما، لکھنؤ ۱۹۸۳ء

تبرکاتِ آزاد: مرتبہ غلام رسول مہر کتاب منزل، لاہور

تذکرہ: مولانا ابوالکلام آزاد (مرتبہ مالک رام) دلی ۱۹۹۰ء

تذکرۂ صادقہ: مولانا عبدالرحیم ۱۳۲۰ھ

تذکرۂ معاصرین (۱): مالک رام دلی ۱۹۷۲ء

تذکرۂ معاصرین (۲): مالک رام دلی ۱۹۷۶ء

تذکرۂ معاصرین (۳): مالک رام دلی ۱۹۸۲ء

تلامذۂ غالب: مالک رام دلی ۱۹۸۴ء

چند ہمعصر: مولوی عبدالحق کراچی ۱۹۵۰ء

خریطۂ جواہر: مرتبہ مظہر جانجاناں مطبع مصطفائی، کانپور ۱۲۷۱ھ

خطباتِ عالیہ (۱): انوار احمد زبیری علی گڑھ ۱۹۲۸ء

خطوطِ اقبال : مرتبہ رفیع الدین ہاشمی — لاہور، ۱۹۷۶ء
خمخانۂ جاوید (۲) : سری رام — دلی، ۱۹۱۱ء
خمخانۂ جاوید (۵) : مرتبہ برجموہن دتاتریہ کیفی — دلی، ۱۹۴۰ء
خواجہ حسن نظامی، حیات اور ادبی خدمات : ڈاکٹر امام مرتضیٰ — لکھنؤ، ۱۹۷۸ء
خواجہ حسن نظامی، حیات اور کارنامے : حسن ثانی نظامی — دلی، ۱۹۸۷ء
دیوانِ کامل حافظ شیرازی — تہران، ۱۳۳۹ شمسی
دیوانِ کلیم کاشانی : مرتبہ پرتو ضیائی — تہران، ۱۳۳۶ شمسی
دیوانِ نظیری نیشاپوری مرتبہ مظاہر مصفا — تہران، ۱۳۴۰ شمسی
ذکرِ غالب : مالک رام — دلی، ۱۹۷۶ء
روزِ روشن : محمد مظفر حسین صبا — بھوپال، ۱۲۹۷ھ
سرگزشت : عبد المجید سالک — لاہور، ۱۹۶۶ء
سفینۂ حزیں : محمد علی حزیں
سوانحِ عمریِ خواجہ حسن نظامی : ملا واحدی — کراچی، ۱۹۵۷ء
سیرۃ النعمان : شبلی نعمانی کتبخانۂ اعزازیہ، دیوبند، ۱۸۶۳ء
صبح گلشن : سید محمد علی حسن خان — بھوپال، ۱۲۹۵ھ
صحیح بخاری
غزلیاتِ شمس تبریز : مولانا محمد جلال الدین رومی
قاموس المشاہیر : نظامی بدایونی — بدایوں، ۱۹۲۶ء
قرآنِ کریم
کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں : مالک رام — دلی، ۱۹۸۹ء
کشکول (۱) : مالک رام — (قلمی)

کلیاتِ انشا : مرتبہ مرزا محمد عسکری، الٰہ آباد، ۱۹۵۲ء
کلیات بیدل : عبدالقادر بیدل کابل، ۱۳۴۱-۱۳۴۴ شمسی
کلیات حزیں : محمد علی حزیں نولکشور، لکھنؤ ۱۹۷۶ء
کلیاتِ عرفی : مرتبہ غلام حسین جواہری ایران
کلیاتِ غالب (فارسی) : اسداللہ خاں غالب نولکشور، لکھنؤ ۱۹۶۳ء
کلیاتِ میر : مرتبہ آسی الدنی نولکشور، لکھنؤ ۱۹۴۰ء
محمد علی، ذاتی ڈائری : عبدالماجد دریابادی اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء
معتمدالدولہ آغا میر : ڈاکٹر انصاراللہ دلی، ۱۹۸۸ء
مکاتیب ابوالکلام آزاد : ابوسلمان شاہجہاں پوری کراچی، ۱۹۶۸ء
من کیستم : مرزا احمد عسکری لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
مولانا غلام رسول مہر، حیات اور کارنامے : ڈاکٹر شفیق احمد لاہور، ۱۹۸۸ء
میخانہ رعبدالغنی
میرا افسانہ (مشمولہ تحریر (۴۵) : ملا واحدی مرتبہ مالک رام جولائی ستمبر ۱۹۷۸ء
نزہتہ الخواطر (۶) : سید عبدالحی حسنی حیدرآباد، ۱۹۵۶ء
نقش آزاد : غلام رسول مہر لاہور، ۱۹۵۸ء
نہرو ز (انگریزی) : بی، این، نندا
نوادرِ ابوالکلام : مرتبہ عبدالغفار شکیل دلی، ۱۹۶۲ء
وہ صورتیں الٰہی : مالک رام دلی، ۱۹۷۴ء
یادِ رفتگاں : سید سلیمان ندوی کراچی، ۱۹۵۵ء

رسائل و جرائد

اردو (سہ ماہی) اورنگ آباد، مرتبہ عبدالحق	جنوری ۱۹۲۹ء
الجمعیۃ (روزنامہ) دلّی (آزاد نمبر)	
ایوانِ اُردو (ماہنامہ)، دلّی	دسمبر ۱۹۸۸ء
ذوالقرنین، بدایوں (یادگارِ طفیل)	
قومی آواز (روزنامہ)، دلّی	
مرقّع عالم (ماہنامہ)، ہردوئی مرتّبہ حکیم محمد علی	مئی ۱۹۰۲ء
نقوش (ماہنامہ)، (شخصیات نمبر) لاہور۔ مرتبہ محمد طفیل	۱۹۵۵/۱۹۵۶ء
نوائے ادب (سہ ماہی)، بمبئی	اپریل ۱۹۶۱ء
نیا دور (ماہنامہ)، لکھنؤ	